اردو کا کلاسیکی ادب

مقالات سرسید

قرآنی قصص

جلد چہاردھم حصہ اول

مرتبہ

مولانا محمد اسماعیل، پانی پتی

مقالات سرسید

سرسید کے ادبی کارناموں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ان کی مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کو حاصل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے اور سب سے اعلیٰ مضمون نگار تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مضامین اور طویل مقالے بڑی تحقیق و تدقیق، محنت و کاوش اور لیاقت و قابلیت سے لکھے اور اپنے پیچھے نادر مضامین اور بلند پایہ مقالات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ چھوڑ گئے۔

ان کے بیش بہا مضامین جہاں ادبی لحاظ سے وقیع ہیں، وہاں وہ پر از معلومات بھی ہیں۔ ان کے مطالعے سے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور مذہبی مسائل اور تاریخ عقدے حل ہوتے ہیں اخلاق و عادات کی اصلاح کے لیے بھی وہ بے نظیر ہیں اور سیاسی و معاشرتی لحاظ سے بھی نہایت فائدہ مند ہیں۔ نیز بہت سے مشکل سوالوں کے تسلی بخش جوابات بھی ان میں موجود ہیں سرسید کے ان ذاتی عقائد اور مذہبی خیالات کے متعلق بھی ان سے کافی روشنی ملتی ہے جو اپنے زمانے میں زبردست اعتراضات کا ہدف رہے ہیں ان مضامین میں علمی حقائق بھی ہیں اور ادبی لطائف بھی، سیاست بھی ہے اور معاشرت بھی، اخلاق بھی ہے اور موعظت بھی، مزاح بھی

ہے اور طنز بھی، درد بھی ہے اور سوز بھی، دلچسپی بھی ہے اور دلکشی بھی، نصیحت بھی ہے اور سرزنش بھی غرض سرسید کے یہ مضامین و مقالات ایک سدابہار گلدستہ ہیں جن میں ہر رنگ اور ہر قسم کے خوشبودار پھول موجود ہیں۔

یہ مضامین سرسید نے جن اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً لکھے، وہ مدت ہوئی عام نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور کہیں ان کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ پرانے اخبارات ورسائل کے فائل کون سنبھال کر رکھتا ہے۔ سرسید کی زندگی میں کسی کو اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ان تمام بیش قیمت جواہرات کو جمع کر کے فائدہ عام کے لیے شائع کر دے۔ صرف دو ایک نہایت ہی مختصر مجموعے شائع ہوئے مگر وہ بھی بے حد تشنہ اور نامکمل، جو نہ ہونے کے برابر تھے۔

سرسید کے انتقال کے بعد نصف صدی کا طویل زمانہ گزر گیا مگر کسی کے دل میں ان مضامین کے جمع کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا اور کوئی اس طرف متوجہ نہ ہوا آخر کار مجلس ترقی ادب لاہور کو ان بکھرے ہوئے بیش بہا جواہرات کو جمع کرنے کا خیال آیا مجلس نے ان جواہرات کو ڈھونڈنے اور ان کو ایک سلک میں پرونے کے لیے مولانا محمد اسماعیل پانی پتی کا انتخاب کیا جنھوں نے پرانے اخبارات اور قدیم رسالوں کے فائلوں کی تلاش میں دور و نزدیک کے سفر کیے فراہمی مواد کے لیے ان کے بوسیدہ اور دریدہ اوراق کو غور و احتیاط سے پڑھنے کے بعد ان میں سے مطلوبہ مواد فراہم کرنا بڑے

بکھیڑے کا کام تھا، مگر چونکہ ان کی طبیعت شروع ہی سے دقت طلب
اور مشکل پسند واقع ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے یہ ذمہ داری باحسن
طریق پوری کی چنانچہ عرصہ دراز کی اس محنت و کاوش کے ثمرات
ناظرین کرام کی خدمت میں ''مقالات سرسید'' کی مختلف جلدوں کی
شکل میں فخر واطمینان کے جذبات کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

قصہ آدم علیہ السلام

قرآن مجید میں آدم کا قصہ آٹھ جگہ آیا ہے سورۂ بقر، سورۂ آل عمران، سورۂ اعراف، سورۂ حجر، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، سورۂ طٰہٰ، سورۂ ص میں کسی جگہ کوئی مضمون بیان ہوا ہے، کسی جگہ کوئی کسی جگہ اجمال ہے کسی جگہ تفصیل کسی جگہ ایک مضمون کو کسی لفظ سے ظاہر کیا ہے، دوسری جگہ کسی فلظ سے مگر سب کا نتیجہ یا مقصد متحد ہے ہم حاشیہ پر ان آٹھوں جگہ کی آیتوں کو اس طرح جمع کرتے ہیں جس میں تمام مضمون اور الفاظ ایک جگہ سلسلہ وار جمع ہو جاویں اور اس کے مقابل میں ان کا ترجمہ بھی اسی سلسلے میں لکھتے ہیں تا کہ کل قصہ انہی الفاظ میں جو قرآن میں آتے ہیں، ایک جگہ ہو جاوے اور پھر اپنی سمجھ کے موافق جو ہم نے قرآن کا مطلب سمجھا ہے، اسی قصہ کو بیان کرتے ہیں تا کہ پڑھنے والے بخوبی دونوں بیانوں کا مقابلہ کر سکیں

واذ قال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفہ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونجن نسیح بحمدک و نقدس لک قال انی اعلم مالا تعلمون (سورۂ بقر) انی خال بشرا من طین (ص) من تراب (آل عمران) صلصال من حما مسنون (الحجر) وعلم آدم الاسماء ثم عرضھم علی الملئکۃ فقال انبئونی با سماء ھولاء ان کنتم صدقین قالو سبحنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک العلیم الحکم قال یادم انبئھم باسمائھم فلما انباھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموات

والارض واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون (بقر) ولقد خلقنا كم ثم
صورنا كم ثم قلنا للملئكة اسجدوا لادم (سوره اعراف) فاذا سويته
وانفخت فيه من روحی فقعواله سجدين (الحجر) فسجد الملئكة كلهم
اجمعون (الحجر) لا ابليس لم يكن من السجدين (الاعراف) كان من
الجن ففسق عن امر ربه (الكهف) ابی ان يكون من السجدين (الحجر)
واستكبرو كن من الكافرين (بقر)قال يا ابليس مالک الا تكون مع
السجدين (الحجر) ما منعک ان تسجد لما خلقت بيدی استكبرت ام
كنت من العالين (ص) ما منعک الا تسجد اذا امر تک(اعراف) قال
اسجد لمن خلقت طينا (بنی اسرائيل) لم اكن لا سجد لبشر خلقته من
صلصال من حما مسنون (الحجر) انا خير مئه حلقنی من نار و خلقته من
طين (اعراف) قال فاهبط منها فما يكون لک ان تتكر فيها فاخرج منها
مذوما مدحورا (اعراف) فالک رجيم وان عليک اللعنة الی يوم الدين
(آلحجر) انک من النغرين قال انظرنی الی يوم يبعثون قال انک من
المنظرين (اعراف) الی يوم الوقت المعلوم قال رب بما اغويتنی لا زينن
لهم فی الارض (الحجر) فبعزتک لا غوينهم اجمعين (ص) لا قعدن لهم
صراطک المستقيم ثم لا تينهم من بين ايديهم و من خلفهم و عن ايمانهم
وعدن شمائلهم ولا تجد اكثرهم شاكرين (اعراف) قال اريتک هذا
الذی كرمت علی لئن اكرتن الی يوم القيامة لا حتكن ذرية الا قليلا(بنی
اسرائيل) الا عبادک منهم المخلصين قال هذا صراط علی مستقيم
(الحجر) قال فالحق والحق اقول (ص) لمن تبعک منهم لاملئن جهنم

(اعـراف) مـنک و مـمـن تبـعک منهم اجمعین (ص) اذهب فمن تبعک
مـنهـم فـان جهـنـم جـزاؤکـم جـزاء مـوفـورا واسـتـفزز من استطعت منهم
بـصـوتک واجـلب علیهم بخیلک ورجلک وشارکهم فی الاموال والا
ولاد وعدهم وما یعدهم الشیطان الا غرورا (بنی اسرائیل) ان عبادی لیس
لک عـلیهـم سـلـطان الا من اتبعک من الغاوین (الحجر) وکفیٰ بربک
وکیـلا (بنی اسرائیل) و قلنا (بقر) یآدم اسکن انت و زوجک الجنة فکلا
(اعـراف) منها رغداً (بقر) حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکونا من
الظالمین (اعراف) فقلنا یآدم ان هذه عدولک ولزوجک فلا یخرجنکما
من الجنة فتشقیٰ ان لک لا تجوع فیها ولا تعری وانک لا تظلماء فیها لا
تـضـحـی (طٰه) فـوسـوس لهـمـا الشیـطن لیبدی لهما ماووری عنهما من
سـواتهـمـا (اعـراف) قـال یا آدم هل ادلک علی شجرة الخلد وملک لا
یبـلـی (طٰه) وقال مانها کما ربکما عن هذه الشجرة الا ان تکون ملکین او
تکونا من الخلدین و قاسمهما انی لکهما لن الناصحین فدلهما بغرور فلما
ذاقـا الشـجـرة بدت لهما سوانهما وطفقا یخصفان علیهما من ورق الجنة
(اعـراف) و نـاداهـما ربهما الم انهکما عن تلکما الشجرة واقل لکهما ان
الشیـطـن لـکهما عدومبین (اعراف) فازلهما الشیطن عنها فاخرجهما مما
کـانـا فیه و قلنا اهبطوا بعضکم لبعض عدوولکم فی الارض مستقرو متا ع
الی حین (بقر) قال فیها تحیون و فتها تموتون و منها تخرجون (اعراف) و
عـصـی ادم ربـه، فـغوی (طه) فقلنی آدم من ربه بکلمات فتاب علیه انه هو
التـواب الـرحیـم (بـقـر) قـال ربـنـا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا

لنکونن من الخسرین (اعراف) ثم اجتباء ربه فتاب علمه و هدی (طهٰ) قلنا اھبطوا منھا جمیعاً فاما یا تینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (بقر) فلا یضل ولا یشقی (طه)

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ان میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں بولے کیا تو اس میں ایسے کو خلیفہ کرے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہاوے اور ہم تو تیری تعریف جپتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں کہا میں جانتا ہوں وہ جو کچھ تم نہیں جانتے میں پیدا کرنے والا ہوں ایک آدمی گارے، مٹی، ریتلے گارے بدبودار کیچڑ سے، اللہ نے آدم کو سب نام سکھا دیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھ کو ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ بولے تو ہی برگزیدہ ہے تو نے جو کچھ ہم کو سکھایا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بے شک تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے کہا اے آدم ان کے نام ان کو بتا دے پھر جب آدم نے ان کے نام ان کو بتا دیے، خدا نے کہا کہ میں تم کو نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں کی اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اس کو بھی جانتا ہوں بے شک ہم نے تم کو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو جب میں اس کو ٹھیک کر چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کو سجدہ کرتے ہوئے جھک پڑو پھر سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر شیطان نے کیدوہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا وہ جنوں میں سے تھا

پس نافرمانی کی اس نے اپنے پروردگار کی، سجدہ کرنے والوں کے
ساتھ ہونے سے انکار کاے اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا خدا
نے کہا اے ابلیس کیوں تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا۔ کس
چیز نے تجھ کو منع کیا کہ نہ سجدہ کرے اس کو جسے میں نے اپنے ہاتھ
سے بنایا، تکبر کیا تو نے یا تو بروں میں ہے، کس بات نے تجھ کو روکا کہ
میرے حکم کرنے پر بھی تو سجدہ نہ کرے۔ ابلیس نے کہا کہ کیا میں
ایسے کو سجدہ کروں جسے تو نے گارے سے پیدا کیا ہے میں ایسا نہیں
ہوں کہ اس آدمی کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی مٹی سے بنایا ہے میں
اس سے بہتر ہوں، مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے
ریتلے گارے اور بدبودار کیچڑ سے پیدا کیا ہے خدا نے کہا دور ہو یہاں
سے تجھ کو نہیں چاہیے تھا کہ یہاں تکبر کرتا۔ یہاں سے ذلیل وخوار ہو
کر نکل بیشک تو مردود ہے اور بے شک تو مردود ہے اور بے شک تجھ
پر قیامت تک لعنت رہے گی بے شک تو ذلیلوں میں ہے ابلیس نے
کہا کہ قیامت تک مواخذ نہ ہونے کی مجھے مہلت دے خدا نے کہا
تجھ کو مہلت دی گئی وقت معین تک ابلیس نے کہا کہ اے پروردگار مجھ
کو تیرے بہکانے ہی کی قسم کہ میں دنیا میں بری باتوں کو انہیں اچھی کر
دکھاؤں گا اور قسم ہے تیری عزت کی ان سب کو بہکاؤں گا اور ان کے
لیے تیرے سیدھے رستہ کی راہ ماری کرنے کو گھات میں بیٹھوں گا پھر
ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان
کے بائیں سے ان پر آن پڑوں گا اور تو ان میں سے بہتوں کو شکر

کرنے والا نہ پاوے گا۔ ابلیس نے کہا کہ مجھ کو بتا کہ کیوں اس شخص کو مجھ پر بزرگی دی ہے اگر تو نے مجھے قیامت تک کی مہلت دی تو اس شخص کی اولاد کو بجز چند کے جڑ پیڑ سے اکھاڑ دوں گا بجز تیرے خاص بندوں کے جوان میں ہوں خدا نے کہا کہ خالص بندہ ہونا ہی میرے تک پہنچنے کا سیدھا رستہ ہے خدا نے کہا کہ سچ بات یہ ہے اور سچ کہتا ہوں جو لوگ ان میں سے تیری پیروی کریں گے بے شک بھر دوں گا جہنم کو تجھ سے اور ان سب سے جنہوں نے ان میں سے تیری پیروی کی جا پھر جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو بے شک جہنم تمہاری سزا ہوگی، پوری سزا۔ بہکا ان میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے اور چڑھ جا ان پر اپنے سوار و پیدل لے کر اور حصہ بانٹ لے ان کے مال میں اور اولاد میں اور ان سے وعدہ کرلے اور کوئی وعدہ ان سے شیطان نہیں کرنے کا بجز دھوکے کے بے شک میرے بندوں پر تجھ کو غلبہ نہیں ہے بجز ان گمراہوں کے جنہوں نے تیری پیروی کی اے پیغمبر تیرا خدا ان کی کارسازی کے لئے کافی ہے۔ خدا نے کہا اے آدم تو اور تیرا جوڑا جنت میں رہ اور کھاؤ اس میں سے پیٹ بھر کر جہاں سے تم چاہو اور اس درخت کے پاس مت جاؤ اگر جاؤ گے تو ظالموں میں سے ہو گے۔ خدا نے کہا اے آدم یہ ابلیس یہ شک تیرا اور تیرے جوڑے کا دشمن ہے یہ تم کو جنت سے نہ نکال دے کہ تم بد بخت ہو جاؤ۔ یہاں تو تم نہ بھوکے ہو گے نہ ننگے نہ یہاں پیاسے ہو گے اور نہ دھوپ میں جلو گے۔ پھر وسوسے میں ڈال دیا ان

کو شیطان نے تا کہ جو پوشیدہ برائیاں ان میں تھیں ان کو ظاہر کر دے

شیطان نے کہا اے آدم! کیا بتلاؤں میں تجھ کو‘‘

ہمیشہ رہنے اک درخت اور پرانی نہ ہونے والی سلطنت؟ اور کہا کہ خدا نے تم کو بجز اس کے اور کس لیے اس درخت سے منع نہیں کیا کہ تم فرشتے ہو جاؤ گے یا ہمیشہ رہو گے۔ اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ بے شک تمہارا میں خیر خواہ ہوں پھر ان کو دھوکے میں ڈال دیا پھر جب انہوں نے اس درخت کو چکھا تو ان دونوں کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور انہوں نے بہشت کے درخت کے پتوں سے ان کو چھپانا شروع کیا خدا نے ان دونوں کو للکارا کہ میں نے تم کو اس درخت کے کھانے سے منع نہیں کیا تھا اور تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا علانیہ دشمن ہے پس ان کو شیطان نے اس سے ڈگمگایا اور جس میں تھے اس میں سے نکال دیا خدا نے کہا دور ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے ایک مدت تک زمین پر رہنا اور اس سے منفعت اٹھانی ہے اس میں تم جیو گے، اس میں مرو گے، اس میں سے اٹھو گے۔ نافرمانی کی آدم نے اپنے پروردگار کی اور بہک گیا پھر آدم کے دل میں ڈالیں اس کے پروردگار نے چند باتیں پھر اس کو خدا نے معاف کیا وہ بے شک بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے آدم اور اس کی جورو نے کہا کہ اے پروردگار ہمارے ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو نہ بخشے گا اور نہ مہربانی کرے گا تو بے شک ہم نقصان والوں میں ہوں گے۔ پھر اس کے پروردگار نے اس کو پسند کیا اور اس کو معاف کیا اور سیدھی راہ بتائی خدا نے کہا کہ تم سب یہاں سے دور ہو پھر میرے پاس سے تمہارے پاس ہدایت پہنچے گی پھر جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اس پر کچھ خوف نہ وہ گا اور نہ وہ غمگین ہو گا اور نہ وہ بہکے گا اور نہ بد بخت ہو گا۔

اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں۔ ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی قوائے)

ملکوتی) تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ ان قوی کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونوں شامل ہیں) مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے خدا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے گویا قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنے کو ہوں مگر وہی میرا نائب ہونے کے لائق ہے جب میں اس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اس کو سجدہ کرنا اس مقام پر مخاطبین کو اس بات کا کہ اس مخلوق میں قوائے بہیمیہ ہوں گے عالم قرار دیا گیا ہے اور بمقتضائے فطرت ان قویٰ کے انہوں نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ کرے گا جو زمین پر فساد مچاوے اور خون بہاوے اور قوائے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں۔

پچھلا فقرہ قوائے کی فطرت کو بھی بتاتا ہے جو قویٰ جس کام کے لیے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں، کہ وہی ان کی تسبیح اور تقدیس ہے قوت نامیہ، انما اور قوت ناطقہ، نطق، قوت احراق، حرق، قوت سیالہ، سیلان، قوت جامدہ، انجماد کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی انسان باوجودیکہ قوائے متضاد، ملکوتیہ و بہیمیہ سے مرکب ہے مگر اس میں ایسی قدرت ہے کہ ایک قوت پر دوسری قوت کو غلبہ دے سکتا ہے اور جس قوت سے چاہے کام لے سکتا ہے غیر معلوم چیزوں کو جان جاتا ہے، عالم کے اجزاء میں ترکیب دے کر ایک نئی چیز ایجاد کر لیتا ہے اور عالم کے تبدل میں ایک بڑی مداخلت رکھتا ہے اور ٹھیک خدا کا نائب کہلانے کا مستحق ہے۔

انسان کی فطرت کا مخاطبین پر فطرتی تفوق ظاہر کرنے کو، تمام کمالات نفسانی و روحانی حقائق و معارف کو انسان کی فطرت میں ودیعت کر کے جس کو تعلیم اسماء سے تعبیر کیا ہے انسان کو مخاطبین کے سامنے کیا، کہ جو حقائق و معارف اس میں ہیں اس کو بتلاؤ قوائے سبیطہ کی فطرت میں اس کا علم نہ تھا پس گویا وہ بولے کہ ہم تو ان کمالات کو نہیں جانتے ہم تو اتنا

ہی جانتے ہیں جتنا تو نے بتایا ہے یعنی جس محدود فطرت پر پیدا کیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے مگر انسان کی زبان حال نے جس کی فطرت میں ادراک، کلیات و جزئیات تھا مخاطبین کی حقیقت کو بتا دیا اور گویا مخاطبین نے زک پائی اب خدا اپنی قدرت وکمال کے اظہار کے لیے انسانی محاورہ کے موافق، جیسے کہ انسان کسی کو زک دے کر دھراتا ہے، فرماتا ہے کہ کیوں میں نہ کہتا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے ان قوائے متضاد کی جن سے انسان مرکب ہے، اس طرح پر فطرت بتائی ہے کہ قوائے ملکوتی اطاعت پذیر و فرماں بردار ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں الا قوائے بہیمیہ نہایت سرکش اور نا فرماں بردار ہیں انہی کو قابو میں لانا اور فرماں بردار کرنا انسان کا انسان ہونا ہے۔

اس کے سرکش ہونے کو کبھی تو ان لفظوں سے بیان کیا ہے کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا کہیں یوں فرمایا ہے کہ اس نے اپنے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا کہیں فرمایا ہے کہ اس کافر نے غرور کیا اور کہا کہ کیا میں ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جو سڑی مٹی سے بنی ہے میں تو اس سے افضل ہوں وہ تو مٹی کا پتلا ہے اور میں آگ کا پوت ہوں قوائے بہیمیہ کو جن کا مبداء حرارت غریزی وحرارت خارجی ہے، آگ سے مخلوق ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک ان کی فطرت کا بتلانا ہے پھر جو فطرتی تضاد ان دونوں قسم کے قویٰ میں ہے اس کے اظہار کے لئے قوائے بہیمیہ کو بطور ایک سخت دشمن کے قرار دیا ہے اور اس کی زبان حال سے اس کی فطرت بیان کی ہے کہ میں ہمیشہ جب تک انسان زندہ ہے یا قیامت تک یعنی جب تک اس کی اولاد رہے گی اس کو بہکاتا اور راہ راست پر سے بھٹکاتا رہوں گا یہ الفاظ کہ میں انسان کو دائیں بائیں آگے پیچھے غرض کہ ہر چہار طرف سے گھیروں گا صاف صاف ان قوائے بہیمہ کی فطرت کرنے پر خود اپنے میں یہ سب باتیں پاتا ہے اور جان سکتا ہے کہ کس

طرح ان قوائے بہیمیہ نے چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا ہے۔

درمیان	قمر	دریا	تختہ	بندم	کردہ
بازمیگوئی	کہ	دامن	ترمکن	ہشیار	باش

پھر خدا تعالیٰ نے نیک آدمیوں کی فطرت کو اور اس دشمن کے فریب میں آنے والوں اور نہ آنے والوں کے فطری نتیجہ کو بتایا ہے اور فرماتا ہے کہ تو جتنی چاہے دشمنی کر اور جس طرح چاہے اپنے لشکر سے ان پر چڑھائی کر مگر نیک آدمیوں پر تیرا کچھ قابو نہ ہوگا وہی بہکیں گے جو تیرے یعنی قوائے بہیمیہ کے تابع ہونے والے ہیں اور دونوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ پہلے بہشت میں چین کریں گے اور پچھلے دوزخ میں بھرے جاویں گے۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے دونوں حصوں کو بتایا ہے پہلے حصہ کو یعنی جب کہ انسان غیر مکلّف اور تمام قیود سے مبرا ہوتا ہے بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میوؤں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے اور جب دوسرا حصہ اس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہے تو اس کے قدیم دشمن کو پھر بلایا ہے جس نے اس کو بہکا کر درخت ممنوعہ کو کھلایا ہے۔

یہ وہ حصہ انسان کی زندگی کا ہے جب کہ اس کو رشد ہوتا ہے اور عقل وتمیز کے درخت کا پھل کھا کر مکلّف اور اپنے تمام افعال واقوال وحرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے زندگی کے ضروری سامان کے لیے خود محنت کرتا ہے اور نیک و بد کو خوب سمجھتا ہے اپنی بدی سے واقف ہوتا ہے اور اس کو چھپاتا ہے یہ فطرت انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے اس لیے تمام فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے سن رشد وتمیز کے پہنچنے کو درخت معرفت خیر وشر کے پھل کھانے سے اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے۔ مگر شجرۃ الخلد کے پھل تک اس کو نہیں پہنچایا جس

سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقا نہیں۔

اخیر کو نہایت عمدگی سے اس کا خاتمہ بیان کیا ہے کہ تم سب نکل جاؤ اور جا کر زمین پر رہو وہی تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے اس میں تم مرو گے، اس میں سے اٹھو گے تمہاری بدیوں کا علاج بھی وہیں ہے جو نیک بندے ہوں ان کی ہدایات پر چلنا اور اپنی بدیوں سے شرمندہ ہو کر ان کے کرنے سے باز آنا اور خدا سے پکا اقرار کرنا کہ پھر نہ کریں گے اور پھر مت کرنا، تم اپنے دشمن پر فتح پاؤ گے پھر تم کو کچھ ڈر اور خوف نہ ہوگا اچھے خاصے مقبول بندے ہو گے۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور دلچسپ بیان فطرت انسانی کا ہے مگر عام لوگ اس راز فطرت کے سمجھنے کے قابل نہ تھے اس لیے خدا نے ابتداء سے اس راز کو ایک دل چسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور جو نتیجہ راز فطرت سے انسان کو حاصل ہونا چاہیے وہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے خواہ تم یہ سمجھو کہ خدا و فرشتوں میں مباحثہ ہوا اور شیطان نے خدا سے نافرمانی کی اور آدم بھی گیہوں کا درخت کھا کر خدا کا نافرمانبردار ہوا خواہ میں یوں سمجھوں کہ اس بڑے تماشا کرنے والے نے جو بھانمتی کا ایک تماشا بنایا ہے اس کے راز کو اسی بھانت کی اصطلاحوں میں بتایا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

ذکر نوحؑ کے طوفان کا

قبل اس کے کہ طوفان کی نسبت کا ذکر کیا جاوے یہ امر بتانا ضرور ہے کہ حضرت نوح اوران کی قوم کہاں رہتی تھی۔

اس بات کے دریافت کرنے کے لیے بجز توریت کے اور قدیم جغرافیہ کی تحقیقات کے اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم یا یوں کہو کہ حضرت نوح کے اجداد اس قطعہ زمین میں رہتے تھے جہاں چار دریا پشوں ہیجوں اور مدقل اور فرات بہتے تھے۔ ان دریاؤں کے ناموں اور مخرجوں پر اس مقام پر بحث کی چنداں ضرورت نہیں ہے صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ جو ٹکڑا زمین کا بلیک سی، یعنی بحراسود اور بحر کاسپین اور پرشین گلف (خلیج فارس) اور میڈی ٹیرینین سی یعنی بحیرہ روم میں واقع ہے اور آرمینیا کہلاتا ہے یہی قطعہ زمین کا حضرت نوح کے اجداد کا مسکن تھا۔

کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ نوح نے یا اجداد نوح نے اس ملک کو چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کی ہو اور اس لیے اس بات کے باور کرنے کو کوئی امر مانع نہیں ہے کہ حضرت نوح ک ابھی یہ ملک مسکن تھا۔

اس قطع زمین میں وہ ملک بھی واقع ہے جو ارارات کے نام سے مشہور تھا اور اسی ملک کے پہاڑ ارارات کے پہاڑ مشہور ہیں جن کو کالڈی زبان میں فرود اور عربی میں جودی کہتے ہیں۔

یہ ملک دریاؤں سے اور دریاؤں کی بہت سی شاخوں سے اور چھوٹی منڈیوں سے ایسا

پر تھا کہ انسان کو اس بات کا خیال آنا قرین قیاس ہے کہ ان کے عبور کرنے اور ان کی طغیانی کی حالت میں بچاؤ کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت نوح کے دل میں وحی ڈالی کہ وہ ان مصیبتوں سے محفوظ رہنے کے لیے کشتی بنائیں کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ کشتی سب سے پہلی کشتی ہو گی جو دنیا میں بنی۔ اس وقت ایسی چیز جس سے پانی پر چلیں کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی، لیکن اول اول جب اس کے بنانے کا خیال حضرت نوح کو ہوا ہوگا اور اس کے ذریعہ سے پانی پر چلنے اور دریاؤں کے آر پار جانے اور چلے آنے کا ارادہ معلوم ہوا ہوگا تو لوگوں نے اس کو اس قدر عجیب اور ناممکن سمجھا ہوگا کہ ان سے مسخرا پن کرتے ہوں گے ان کو دیوانہ سمجھتے ہوں گے جیسے کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔

حضرت نوح لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے اور خدائے واحد کی پرستش کرنے کی ہدایت کرتے تھے اور لوگ نہیں مانتے تھے حضرت نوح ان پر خدا کا عذاب نازل ہونے کی پشین گوئی کرتے تھے تمام قوموں پر جو عذاب نازل ہوئے ہیں وہ عذاب انہی اسباب سے واقع ہوئے ہیں جن کا واقع ہونا امور طبعی سے متعلق ہے پس ملکی حالات کے خیال سے ضرور حضرت نوح کے دل میں خدا نے ڈالا ہوگا کہ ان لوگوں کی نافرمانی، بدکاری وگنہ گاری سے ایک دن خدا ان کو ڈبودے گا۔

لوگوں نے حضرت نوح سے کہا کہ اے نوح تم ہم سے بہت کچھ جھگڑ چکے ہو، پھر اگر تم سچے ہو تو اب اس کو لاؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو یعنی عذاب کا۔ حضرت نوح نے کہا کہ اگر خدا چاہے گا تو عذاب لاوے گا، تم اس کو مجبور کرنے والے نہیں ہو۔

کشتی کا بنانا اور خصوصاً پہلے پہل اور بالتخصیص اتنی بڑی کا، جتنی کہ نوح کی کشتی تھی اور ایسی مضبوط کہ جو طوفان کی موجوں کو سہار سکے، کچھ آسان کام نہ تھا اور خدا ہی کی القائے وحی سے وہ بن سکتی تھی مگر لوگوں کی امداد اور سعی کی بھی ضرورت تھی جو لوگ حضرت نوح پر ایمان

نہیں لائے تھے بلکہ ان کے اس کام پر تمسخر کرتے تھے، یقیناً وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے انہی کی نسبت خدا نے فرمایا کہ تو ہماری ہدایت سے کشتی بنائے جا ظالموں کا ہم سے ذکر مت کرو، وہ سب ڈوبنے والے ہیں۔

غرض کہ حضرت نوح نے ان لوگوں کی امداد سے جو ان کو مانتے تھے اور ان پر ایمان لائے تھے وہ کشتی تیار کر لی طوفان کا آنا بذریعہ ان اسباب کے جو طوفان آنے سے متعلق ہیں، خدا نے مقدر کا ے تھا چنانچہ بے انتہا مینہ کے برسنے اور زمین سے پانی کے چشمے کھل جانے اور دریاؤں و ندیوں کے ابل پڑنے سے اس ملک میں طوفان آیا حضرت نوح اور ان کے ساتھی کشتی پر بیٹھ کر بچ گئے، اور تمام ملک کے لوگ جس میں طوفان آیا تھا ڈوب کر مر گئے اس قسم کے طبعی واقعوں کو خدا تعالیٰ ہمیشہ بندوں کے گناہوں اور ان کی نافرمانی سے منسوب کرتا ہے جس کی نسبت ہم پہلے بحث کر چکے ہیں حضرت نوح کے زمانہ کا بہت بڑا طوفان ہو گا مگر اس زمانہ میں بھی جن ملکوں میں طوفان آتا ہے وہاں بھی اسی طرح ڈوب کر مر جاتے ہیں البتہ نوح کے طوفان میں چند امور ایسے ہیں جن پر بالتخصیص بحث کرنی ضرور ہے۔

اول یہ کہ طوفان خاص اس ملک میں آیا تھا جہاں حضرت نوح کی قوم رہتی تھی یا تمام دنیا میں طوفان آیا تھا اور کل کرہ زمین کا پانی کے اندر ڈوب گیا تھا اور تمام دناے میں کوئی انسان و چرند و پرند بجز ان کے جو کشتی میں تھے زندہ باقی نہیں رہے تھے۔

یہودی اور عیسائی اس بات کے قائل ہیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا ہمارے علمائے مفسرین کی عادت ہے کہ بغیر اس بات کے کہ قرآن مجید کے الفاظ پر غور کریں ایسے امور میں یہودیوں کی روایتوں کی تقلید کرتے ہیں اور اس لیے وہ بھی اس بات کے قایل ہوئے ہیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا مگر طوفان کا عام ہونا محض غلط ہے اور قرآن مجید سے اس کا تمام دنیا میں عام ہونا ہرگز ثابت نہیں ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ پہاڑوں پر دریائی جانوروں کی ہڈیاں ملنے سے اور سرد ملکوں میں گرم ملکوں کے جانوروں کی ہڈیاں زمین میں دبی ہوئی نکلنے سے طوفان کے عام ہونے کا اور تمام دنیا کے پہاڑوں کا طوفان نوح میں ڈوب جانے کا یقین ہوتا تھا مگر علم جیالوجی (طبقات الارض) کی ترقی سے ثابت ہو گیا کہ وہ خیال غلط تھا اس کو مفصل طور پر میں نے اپنی کتاب ''تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ علی ملۃ الاسلام'' میں بیان کیا ہے اس مقام پر اس کی بحث کچھ ضروری نہیں ہے اس وقت ہم صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید سے طوفان کا تمام دنیا میں عام ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

گو ہم بالتخصیص یہ نہ بتا سکیں کہ آدم یا انسان کے پیدا ہونے کی کس قدر مدت کے بعد طوفان آیا تھا مگر توریت کے مطابق جو قلیل زمانہ تسلیم کیا گیا ہے ہم اسی کو تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ بموجب حساب توریت عبری کے طوفان آیا (1252) برس بعد پیدا ہونے حضرت آدم کے اور بموجب پٹو ریجنٹ توریت کے جس پر ایشیا کے تمام مورخ اور یورپ کے اکثر قدیم مورخ اعتماد رکھتے ہیں، طوفان آیا 2226 برس بعد پیدا ہوئے حضرت آدم کے اور بلا شبہ اس عرص میں انسان کی نسل پھیل گئی ہو گی اور کل پرانی دنیا یا اس کا بہت بڑا حصہ آباد ہو گیا ہو گا۔ یہ بات ناممکن ہے اور قرآن مجید کے بھی برخلاف ہے کہ حضرت نوح تمام دنیا کے لوگوں کو وعظ سنانے اور ہدایت کرنے کو بھیجے گئے ہوں اور امکان سے باہر ہے کہ تمام دنیا میں جو اس وقت تک آباد ہو چکی تھی، حضرت نوح نے وعظ کیا ہو اور تمام دنیا کے لوگوں نے ان کا وعظ سن کر ان کے ماننے سے انکار کیا ہو، بلکہ بہت سے وسیع ملک ایسے ہوں گے جہاں کے باشندوں نے حضرت نوح کے نبی ہونے کی اور ان کے وعظ کرنے کی اور خدا کے راہ کی ہدایت کرنے کی خبر بھی نہ سنی ہو گی۔

قرآن مجید سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کیوں کہ لوگوں کے پاس بھیجا ہے، بلکہ

یہ فرمایا ہے کہ اس کی قوم کے پاس بھیجا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں اور قومیں بھی موجود تھیں پس جس قوم کے پاس نوح بھیجے گئے تھے اسی قوم پر طوفان کا عذاب بھی آیا تھا اور یہی امر قرآن مجید کی ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے جن کو ہم ابھی بیان کرتے ہیں

قرآن مجید میں خدا نے فرمایا ہے

ولقد ارسلانا نوحا الی قومه فقال یا قوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره افلا تتقون (سوره مومنین آیت 23)

یعنی ہم نے نوح کو بھیجا اس کی قوم کی طرف، نوح نے کہا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی، نہیں ہے تمہارے لیے کوئی معبود سوائے خدا کے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح یاک خاص قوم کے پاس بھیجے گئے تھے پس وہ عذاب بھی اسی قوم کے لیے آیا تھا جس کے لیے حضرت نوح بھیجے گئے تھے پس وہ عذاب بھی اسی قوم کے لیے آیا تھا جس کے لیے حضرت نوح بھیجے گئے تھے۔

پھر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ

ونوحا اذ نادیٰ من قبل فاستجبنار فنجینه واهله من الکرب العظیم ونصرناه من القوم الذین کذبوا بایتنا انهم کانوا قوم سوء فاغرقنا هم اجمعین (سوره انبیاء، آیت 77-76)

یعنی ہم نے مدد کی نوح کی اس قوم پر جس نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو بیشک وہ قوم تھی بری پس ڈبو دیا ہم نے ان سب کو اکٹھا اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہی قوم ڈبوئی گئی تھی جس نے حضرت نوح کا انکار کیا تھا۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح سے فرمایا

والا تخاطبنی فی الذین ظلمو انهم مغرقون (سورہ ہود، آیت 39، سورہ مومنین آیت 27)

یعنی تو مت کہہ مجھ سے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے نافرمانی کی کیوں کہ وہ ڈوبنے والے ہیں پس اس آیت سے بھی صرف انہیں لوگوں کا ڈوبنا معلوم ہوتا ہے جنہوں نے حضرت نوح کی ہدایت کو نہیں مانا

پھر خدا نے فرمایا کہ

انا ارسلنا نوحا الی قومہ ان الذر قومک من قبل ان یاتیھم عذاب الیم (سورہ نوح آیت 1)

یعنی ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو پہلے اس سے کہ آوے ان پر عذاب دکھ دیتا اور جب حضرت نوح کی نصیحت انہوں نے نہ مانی، تو حضرت نوح نے دعا مانگی کہ ان پر طوفان کا عذاب آوے اس سے بھی اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ صرف قوم نوح پر عذاب آیا تھا نہ کہ تمام دنیا پر۔

جو لوگ قرآن مجید سے طوفان کا تمام دنیا میں آنا بیان کرتے ہیں وہ صرف دو آیتوں پر استدلال کرتے ہیں اول وہ آیت ہے کہ جب حضرت نوح نے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی کہ

وقال نوح رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا (سورہ نوح آیت 27)

یعنی اے پروردگار مت چھوڑ زمین پر کافروں کا ایک گھر بھی بسا ہوا حالاں کہ اس آیت سے کسی طرح عام ہونا طوفان کا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ اس آیت میں جوارض کا لفظ ہے اس پر بھی الف لام ہے اور کافروں کا جو لفظ ہے اس پر بھی الف لام ہے پس اس سے صاف ثابت ہے کہ زمین سے وہی زمین مراد ہے جہاں نوح کی قوم رہتی تھی اور کافروں

سے وہی کافر مراد ہیں جنہوں نے حضرت نوح کا انکار کیا چناں چہ اسی امر کی تائید ان تمام آیتوں سے پائی جاتی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

دوسری آیت وہ ہے جہاں خدا نے فرمایا

وجعلنا ذریة هم الباقین (سورۂ صافات، آیت 75) وجعلنا هم خلائف (سورۂ یونس، آیت74)

یعنی اور کیا ہم نے نوح ہی کی ذریت کو بچی ہوئی اور ایک جگہ فرمایا ہے کہ کیا ہم نے ان کو جانشین مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان آیتوں سے کس طرح تمام دنیا میں طوفان آنے کا استدلال کیا جاتا ہے کیوں کہ اس آیت کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ جن لوگوں پر طوفان آیا تھا ان میں سے بجز نوح کی ذریت کے اور کوئی نہیں بچا پھر اس سے تمام دنیا پر طوفان کا آنا کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے علماء نے صرف یہودیوں کی پیروی کر کے طوفان کا عام ہونا قرآن مجید سے نکالنا چاہا تھا ورنہ ہمارے قرآن مجید سے عام ہونا طوفان کا نہیں پایا جاتا فتدبر

قرآن مجید میں یہ بیان نہیں ہے کہ طوفان کا پانی اس قدر اونچا ہو گیا تھا کہ اونچے پہاڑ بھی چھپ گئے تھے بلکہ سورۂ قمر میں صرف یہ آیا ہے کہ

ففتحنا ابواب السماء بما منهمر و فجرنا الارض عیونا فالتقی الماء علی امر قد قدر (سورة قمر آیت11,12)

فاذا جاء امرنا و فا التنور (سورۂ مومنین آیت27)

یعنی ہم نے موسلا دھار مینہ پڑنے سے آسمان کے دروازے کھول دیے اور ہم نے زمین کے چشموں کو پھاڑ دیا پھر ایک پانی دوسرے پانی سے مل گیا مقرر کیے ہوئے کام پر سورۂ مومنین میں فجرنا الارض کی جگہ ”فار التنور“ کا لفظ آیا ہے اس کے معنی روٹی پکانے کے تنور

کے لینے صریح غلطی ہے کیوں کہ خود قرآن مجید میں دوسری آیت سے اس کی تفسیر ہوتی ہے یعنی جو معنی فجرنا الارض کے ہیں وہی معنی فار التنور کے ہیں قاموس میں لکھا ہے کہ التنور کل مفجر ماء یعنی جہاں سے زمین میں پانی پھوٹ نکلے اور چشمہ جاری ہو جاوے اس کو تنور کہتے ہیں اور یہ معنی بالکل قرآن مجید کی پہلی آیت کے مطابق ہیں جس سے دوسری آیت کی تفسیر ہوتی ہے پس قرآن مجید سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ مینہ نہایت زور سے برسا، زمین میں سے چشمے جاری ہو گئے اور ایک پانی دوسرے سے مل گیا اور تمام ملک سطح آب ہو گیا اور اس قدر پانی چڑھا کہ کشتی تیرنے لگی اور جو لوگ کشتی میں نہ تھے وہ ڈوب گئے۔

اس پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ اگر پانی اس قدر نہیں چڑھا تھا کہ پہاڑ بھی ڈوب گئے تھے تو لوگوں اور جانوروں نے پہاڑوں پر کیوں نہ پناہ لی جیسے کہ حضرت نوح کے بیٹے نے کہا تھا کہ میں پہاڑ پر پناہ لے لونگا مگر غور کرنا چاہیے کہ ایسے شدید طوفان میں جس میں اس قدر زور سے مینہ برستا ہو دریا ابل گئے ہوں، زمین سے پانی پھوٹ نکلا ہو، کسی جاندار کو کسی مامن تک پہنچنے کی فرصت نہیں مل سکتی اور یہ بات ہم ادنیٰ سے ادنے طغیانی پانی میں دیکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی ڈوب کر مر جاتے ہیں اور کسی طرح جان بچا نہیں سکتے پھر ایسے بڑے طوفان میں جیسا کہ حضرت نوح کا تھا، اور بہت دنوں تک برابر پانی برستا رہا لوگوں کا اور جانوروں کا اس سے بچنا اور جان بچانا ناممکن تھا۔

علاوہ اس کے میری رائے میں توریت مقدس سے بھی طوفان کا عام ہونا اور پانی کا اس قدر چڑھ جانا، جس نے اونچے اونچے دنیا کے پہاڑوں ک وبھی چھپا لیا ہو، ہرگز ثابت نہیں ہوتا چنانچہ میں نے اپنی کتاب تبین الکلام میں اس پر پوری بحث کی ہے مگر چوں کہ اس تفسیر میں توریت کی آیتوں پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے اس لیے ان پر بحث نہیں کی جاتی ہے البتہ ان واقعات ان کی نسبت جو قرآن مجید میں مذکور ہیں اور توریت میں ان کا ذکر نہیں ہے

کچھ لکھنا مناسب ہے

سورہ ھود میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

ونادی نوح ابنہ وکان فی معزل ینبی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین قال ساوی الی جبل یعصمنی منا لماء قال لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم و حال بینھا الموج فکان من المغرقین (سورہ ھود، آیت 45-44)

یعنی: اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو، اور وہ ہو رہا تھا کنارے: اے بیٹے! سوار ہو ساتھ ہمارے اور مت ہو ساتھ کافروں کے، کہا اس نے میں چڑھ جاؤں گا پہاڑ پر بچاوے گا مجھ کو پانی سے نوح نے کہا کہ کوئی بچانے والا نہیں ہے آج کے دن اللہ کے حکم سے، مگر وہ جس پر وہ رحم کرے اور آ گئی ان دونوں میں موج پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں۔

اور اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

ونادی نوح ربہ فقال رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین قال بنوح انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم انی اعطک ان تکون من الجاھلین قال رب انی اعوذبک ان اسئلک ما لیس لی بھعلم والا تغفرلی و ترحمنی اکن من الخسرین (سورہ ھود آیت 48-46)

یعنی: اور پکارا نوح نے اپنے رب کو پھر کہا اے رب میرا بیٹا ہے گھر والوں میں سے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو حاکموں کا حاکم ہے فرمایا اے نوح! وہ نہیں تیرے گھر والوں میں سے اس کے کام ہیں ناکارہ تو مت پوچھ مجھ سے، تجھ کو معلوم نہیں میں بچاتا ہوں تجھ کو جاہلوں میں ہونے سے کہا اے رب میرے! میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے یہ کہ چاہوں میں تجھ سے جو

معلوم نہیں مجھ کو اور اگر تو نہ بخشیگا مجھ کو اور نہ رحم کرے گا تو ہونگا میں ٹوٹے والوں میں سے۔

ان آیتوں سے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ سوائے ان تین بیٹوں کے جن کا ذکر توریت مقدس میں ہے حضرت نوح کے ایک اور بیٹا تھا جو کافروں کے ساتھ ڈوب گیا

مگر یہ خیال غلط ہے کہ حضرت نوح کا کوئی اور بیٹا سوائے ان تین بیٹوں کے نہ تھا اور یہ بیٹا جس کا یہاں ذکر ہے حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا پہلے خاوند سے تھا اور قائن کی نسل سے تھا اور غالباً یہ بیٹا نعمہ کا تھا جس کا نام کتاب پیدائش باب 4 ورس 22 میں آیا ہے۔

یہ جو میں نے بیان کیا یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ ہمارے یہاں کے مفسر بھی یہی لکھتے ہیں تفسیر کبیر میں ہے

انہ کان ابن امرتہ وھو قول محمد الباقر علیہ السلام وقول الحسن البصری ویروی ان علیا رضی اللہ عنہ قراء نادی نوح ابنہ ابنھا والضمیر لا مرتہ وقرآ محمد بن علی الباقر وعروۃ ابن زبیر ابنہ بفتح الھا یرید انہ ابنھا الا انھما اکتفیا بالفتح من الالف وقال قتادہ سالت الحسن من ابنہ فقال واللہ ما کان ابنالہ فقال قلت لہ ان اللہ حکی عنہ انہ قال ان ابنی من اھلی وانت تقول ما کان ابنالہ فقال انہ لم یقل انہ ابنی ولکنہ قال من اھلی وھذا یدل علی قولی (تفسیر کبیر)

یعنی وہ جس کو حضرت نوح نے بیٹا کہا حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا تھا اور یہ قول ہے جناب محمد باقر علیہ السلام کا اور حسن بصری کا اور یہ روایت ہے حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت محمد بن علی الباقر اور عروہ ابن زبیر نے اس آیت میں جو مذکر کی ضمیر ہے اور حضرت نوح کی طرف پھرتی ہے مونث کی ضمیر پڑھتی تھی

تا کہ حضرت نوح کی بیوی کی طرف پھرے اور قتادہ نے کہا کہ میں نے حسن بصری سے حضرت نوح کے بیٹے کا حال پوچھا انہوں نے کہا قسم بخدا کہ حضرت نوح کا کوئی بیٹا جو طوفان میں ڈوبا نہ تھا۔ قتادہ نے کہا کہ خدا نے تو قول نوح کا یوں بیان کیا ہے کہ نوح نے اپنے بیٹے کو جو ڈوب گیا کہا کہ میرا بیٹا میرے خاندان میں سے ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کے کوئی بیٹا، جو طوفان میں ڈوبا، نہ تھا۔ حسن بصری نے کہا کہ حضرت نوح نے یہ نہیں کہا کہ میرا سگا بیٹا بلکہ یہ کہا کہ میرے خاندان کا بیٹا اور یہ ان کا کہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے جو میں کہتا ہوں۔

پس ان روایتوں میں سے ثابت ہوا کہ یہ شخص حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا اور اسی سبب سے توریت مقدس میں حضرت نوح کے بیٹوں کے ساتھ اس کا ذکر نہیں ہے۔

جس آیت سے حضرت نوح کی بیوی کا طوفان میں ڈوبنا خیال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

ضرب اللہ مثلاً الذین کفروا امرۃ نوح و امرۃ لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحسین فخانتا ھما فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئا وقیل اد خلا النار مع الداخلین (سورہ تحریم آیت 10)

یعنی اللہ نے بتائی ایک کہاوت منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی، گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے بندوں میں سے، پھر نافرمانی کی انہوں نے ان کی پھر نہ دفع کیا انہوں نے ان سے تھوڑا سا بھی عذاب اللہ کا اور حکم ہوا کہ جاؤ دوزخ میں ساتھ جانے والوں کے اس آیت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی کافروں میں تھی اور وہ بھی غرق ہوئی اور توریت مقدس میں پایا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی بیوی کشتی میں حضرت نوح کے ساتھ تھی اور انہوں نے ڈوبنے سے نجات

پائی۔

مگر سمجھنا چاہیے کہ باوجودیکہ اس آیت میں حضرت نوح کی بیوی کا ڈوبنا صاف صاف بیان نہیں ہوا لیکن اگر اس پر بھی ان کا ڈوبنا ہی سمجھیں تو اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بات بھی کہنی چاہیے کہ ہمارے ہاں کتابوں سے پایا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی دو بیویاں تھیں ان میں سے ایک بیوی ڈوبی اور ایک حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں گئی چناں چہ تفسیر کبیر میں ابن عباس سے روایت لکھی ہے کہ کشتی میں نوح اور ان کی بیوی تھی سوائے اس بیوی کے جو ڈوب گئی۔ بعض علمائے یہود کہتے ہیں کہ حضرت نوح کی ایک بیوی نعمہ نسل قاین سے تھی اور ایک بیوی اولاد حضرت ادریس سے، پس کچھ عجب نہیں کہ نعمہ کافر ہو اور وہ ڈوب گئی ہو اور اسی سبب سے توریت مقدس میں اس کا ذکر نہ کیا ہو، مگر جب یہ ثابت ہے کہ حضرت نوح کی ایک بیوی بلاشبہ کشتی میں تھی تو اگر اس آیت سے ایک بیوی کا غرق ہونا ہی مراد لیا جاوے تو بھی کچھ اختلاف نہیں رہتا۔

سورہ مومنین میں خدا نے یہ فرمایا ہے

فاذا جاء امرنا وفار التنور فاسلک فیھا من کل زوجین اثنین (سورہ مومنین آیت27-28)

یعنی کہ جب ہمارا حکم آوے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو بٹھا لے اس میں یعنی کشتی میں ہر جوڑے سے دو توریت میں اس مضمون کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے جس سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا کے جانوروں کے جوڑے کشتی میں بٹھائے گئے تھے اور پھر اس کے غیر ممکن ہونے پر بہت سی دلیلیں لائی گئیں ہیں مگر قرآن مجید ان تمام مشکلات سے مبرا ہے کیوں کہ قرآن مجید سے صرف یہ بات کہ جو جانور حضرت نوح کی دست رس میں موجود تھے ان کے جوڑے کشتی میں بٹھائے گئے تھے کچھ تو اس خیال سے کہ کھانے کے کام آویں

گے اور کچھ اس خیال سے کہ طوفان کے بعد ان سے نسل چلے گی کیوں کہ ملک کی بربادی کے بعد سر دست ان جانوروں کا بہم پہنچنا اور دوسرے ملکوں سے لانا علی الخصوص اس زمانہ میں کہ اس کام کیلیے وسائل ناپید تھے نہایت دقت طلب امر تھا۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

اما قوله فاسلک فیها ای دخل فیها یقال سلک فیه ای دخل فیه وسلک غیره واسلکه من کل زوجین اثنین ای کل زوجین من الحیوان الذی یحضره فی الوقت اثنین الذکر والانثی لکی یا ینقطع نسل ذالک الحیوان (تفسیر کبیر)

یعنی خدا کے اس قول نے کہ فاسلک فیہا یہ معنی ہیں کہ داخل کر یعنی بٹھا لے ارض میں یعنی کشتی میں عرب کے محاورہ میں کہا جاتا ہے سلک فیہ یعنی داخل ہوا اس میں اور اسلکہ من کل زوجین اثنین یہ مطلب ہے کہ جو جانور اس وقت پر موجود ہوں ان کے جوڑے نر و مادہ کشتی میں بٹھا لے تا کہ ان جانوروں کی نسل منقطع نہ ہو جاوے۔

باقی قصہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے بہت صاف ہے اخیر پر خدا نے فرمایا ہے کہ یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم نے اس کی تجھ پر وحی کی ہے نہ تو اسے جانتا تھا اور نہ تیری قوم اس سے پہلے، صبر کر (اے محمد! کافروں کے ایذا دینے اور جھٹلانے پر) بے شک آخر کو (کامیابی) پرہیزگاروں کے لئے ہے (ھود آیت 51)

اس آیت پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ کیا اس سے پہلے طوفان نوح کا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور عرب کے لوگوں کو جن میں کثرت سے یہودی آباد ہو گئے تھے اور کچھ عیسائی بھی آباد تھے معلوم نہ تھا مگر یہ بات نہیں ہے زیادہ تر قرین قیاس ہے کہ یہ قصہ عام طور پر مشہور تھا مگر اس کے ساتھ بہت ہی غلط باتیں بھی مشہور تھیں صحیح صحیح قصہ لوگوں کو معلوم نہ تھا

جس کو خدا نے بذریعہ وحی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بتایا پس عدم علم کا جو ذکر اس آیت میں ہے وہ صحیح قصہ کے جاننے سے متعلق ہے نہ کہ عام طور پر اس قصہ سے قرآن مجید میں جس قدر اگلے قصے بیان ہوئے ہیں اگر چہ اصل ان سے عبرت دلانی مقصود ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ قصہ کو صحیح صحیح بیان کیا جاتا ہے تا کہ جو غلطیاں مشہور ہورہی ہیں ان کی صحت ہو جاوے قریباً تمام دنیا کی قوموں میں طوفان کا قصہ بطور ایک مذہبی قصہ کے مشہور تھا اور اس کے بیانات اور واقعات اس قدر مختلف اور عجیب طور پر مشہور ہورہے تھے کہ ایک میں بھی پوری پوری سچائی نہ تھی چند یورپ کے لوگوں مثل مسٹر ٹرینٹ اور ریورنڈ ایل ڈی ھار کورٹ وغیرہ نے کتابیں لکھی ہیں جن میں ان قصوں کو جمع کیا ہے جو طوفان کی بابت بطور مذہبی قصہ کے تمام دنیا میں مشہور ہیں پس وحی نے جو کچھ بتایا اور جو لوگوں کو معلوم نہ تھا وہ یہی ہے کہ صحیح قصہ طوفان کا کیا ہے۔

یہودی اور عیسائیوں نے جو مذہبی طور پر سب سے بڑی غلطی اس قصہ میں ڈال رکھی تھی وہ یہ تھی کہ تمام دنیا میں طوفان آیا تھا اور کل کرہ زمین پانی میں ڈوب گیا تھا اور طوفان کا پانی دنیا کے بڑے سے بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اونچا ہو گیا تھا اور حضرت نوح نے تمام دنیا کے ہر قسم کے جانداروں کا جوڑہ جوڑہ کشتی میں بٹھا لیا تھا اور تمام دنیا کے جانور تمام انسان اور چرند و پرند و حشرات الارض سب کے سب مر گئے تھے اور بجز ان کے جو کشتی میں تھے کوئی جان دار تمام دنیا میں زندہ نہیں رہا تھا یہ ایک بڑی غلطی تھی جس کو قرآن مجید نے صحیح کیا ہے مگر افسوس اور نہایت افسوس کہ ہمارے مفسروں نے قرآن مجید کی اس برکت کو حاصل نہیں کیا اور وہ خود یہودیوں اور عیسائیوں کی تقلید سے اسی غلطی میں پڑ گئے جس غلطی سے قرآن مجید نے ان کو نکالنا چاہا تھا۔

ایک اور امر غور طلب ہے متعلق حضرت نوح کے یعنی تعداد ان کی عمر کی خدا تعالیٰ نے

سورہ عنکبوت میں فرمایا ہے کہ

ولقد ارسلنا نوحا الی قومه فلبث فهيم الف سنة الا خمسين عاما (سورۂ عنکبوت آیت29)

یعنی ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف، پھر وہ رہا ان میں پچاس برس کم ایک ہزار برس۔

توریت میں لکھا ہے کہ نوح چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا (کتاب پیدائش، باب 7 ورس6) اور پھر لکھا ہے کہ بعد طوفان کے نوح تین سو پچاس برس زندہ رہا اور اس کی عمر نو سو پچاس برس کی تھی (کتاب پیدائش، باب 9 ورس29-28) لیکن جب کہ انسان کی نسل بڑھنی شروع ہوئی تھی اور ابھی طوفان نہیں آیا تھا اس وقت خدا نے کہا تھا کہ ''بسبب بودن ایشاں بشر ضالہ نہایت مدت ایام ایشاں یکصد و بست سال خواھد شد'' (توریت کتاب پیدائش، باب 2 ورس3)

مگر یہ ایک بہت طولانی بحث ہے دن اور برس جو توریت میں مندرج ہیں وہ نہایت بحث طلب ہیں دنیا کے ظہور اور انسان کے وجود کی جو مدت توریت میں لکھی ہے وہ بھی بڑی بحث کے قابل ہے۔

اس میں بھی کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ برس کی مدت ہر ایک زمانہ میں مختلف رہی ہے اور جس واقعہ یا انسان کی عمر کی تعداد اس زمانہ کے حساب سے کی گئی ہے وہی تعداد بیان ہوتی رہی ہے جیسے کہ قرآن مجید اور توریت میں حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو برس بیان ہوئی ہے۔

علاوہ اس کے قدیم زمانہ کا یہ رواج بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس خاندان کا کوئی پیٹر یا ٹک ہوا ہے جب تک کہ اس خاندان میں دوسرا پیٹر یا ٹک نامآور نہ ہوا ہو، پہلے پیٹر یا ٹک

ہی کا نام چلا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واذ قال ابراھیم لابیه آزر اتتخذ اصناما آلھة انی اراک وقومک فی ضلل مبین و کذالک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض ولیکون من الموقنین فلما جن علیه الیل رای کوکبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین

یعنی اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ (یعنی چچا) آزر سے کہ کیا تو نے ٹھہرایا ہے بتوں کو خدا؟ بے شک میں تجھ کو اور تیری قوم کو علانیہ گمراہی میں دیکھتا ہوں اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے تھے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی تاکہ وہ ہووے یقین کرنے والوں میں سے پھر جب اس پر رات چھا گئی، اس نے ایک تارے کو دیکھا کہا یہ ہے میرا رب پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں دوست نہیں رکھتا ڈوب جانے والوں کو۔

ان آیتوں میں حضرت ابراہیم کی نسبت جو حالات مذکور ہیں ان میں چند امور غور طلب ہیں۔

1 اول یہ کہ آزر حضرت ابراہیم کے کون تھے قرآن مجید میں آزر کو حضرت ابراہیم کے ''اب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مگر قرآن مجید میں باپ کا اطلاق باپ اور چچا دونوں پر آیا ہے قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوب کی اولاد نے کہا کہ

نعبد الھک وانه آبائک ابراھیم واسماعیل واسحاق

حالاں کہ اسماعیل حضرت یعقوب کے چچا تھے۔ ان پر بھی یعقوب کے باپ کا اطلاق ہوا ہے تفسیر کبیر میں بھی بعض اقوال لکھے ہیں اس آیت میں ''اب'' کا اطلاق ''عم'' پر ہوا ہے ظن غالب ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ کا نام ترح تھا توریت سے پایا جاتا ہے کہ ترح کے بھائی بھی تھے مگر توریت میں ان کے نام نہیں بیان کیے چناں چہ کتاب پیدائش باب 11 ورس 25-24 میں لکھا ہے کا ''وناحور بست ونہ سال زندگی نمودہ ترح را تولید نمودو ناحور بعد از تولید نمودنش ترح یک صد نوزدہ سال زندگانی نمودہ پسران و دختران را تولید نمود'' ان آیتوں سے ترح کے بھائیوں یعنی حضرت ابراہیم کے چچاؤں کا ہونا پایا جاتا ہے۔

علاوہ اس کے توریت کے کسی باب میں لکھا ہے کہ بعد ان تمام واقعات کے جو حضرت ابراہیم پر ان کے وطن ''اور کسدیم'' میں گذرے انہوں نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا اور کنعان کی طرف روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ کے ان کے باپ ترح بھی تھے اور انہوں نے بھی اس ملک کو چھوڑ دیا تھا چناں چہ ورس 31 میں لکھا ہے کہ ''ترح پسر خود ابرام و پسر پسر خود لوط پسر هاران و عروس خود ساری زن پسرش ابرام را برداشت و باهم دیگر از اور کلدانیاں بقصد رفتن بزمین کنعن بیروں آمدند'' پس یہ ایک دلیل اس بات کی ہے کہ جس مباحثہ کا قرآن مجید میں ذکر ہے وہ حضرت ابراہیم کے باپ سے نہیں ہوا تھا بلکہ ''اب'' کا لفظ ''عم'' پر بطور اظہار محبت اور بزرگی چچا کے جن سے مباحثہ پیش آ گیا تھا بولا گیا ہے۔

2 دوسرے یہ کہ جب حضرت ابراہیم نے یہ مباحثہ کیا تو ان کی عمر کیا تھی، اس امر کا تحقیق کرنا ناممکن ہے کیوں کہ ان امور کی تحقیقات صرف توریت پر منحصر ہے نسخے توریت کے اس باب میں نہایت مختلف ہیں عبری توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ دنیوی کے 1958 برس بعد حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے اور یونانی نسخہ توریت سے جس کو سپٹو ایجنٹ کہتے ہیں ان کی پیدائش 2728 برس بعد سنہ دنیوی کے اور سامری نسخہ توریت سے

2598 برس بعد معلوم ہوتی ہے عیسائی مورخوں نے ولادت حضرت ابراہیم کی 2008 بعد سنہ دنیوی کے اوران کا اور کلدانیاں سے نکلنا 2038 سنہ دنیوی میں قرار دیا ہے اور اس حساب سے اس وقت ان کی عمر پچھتر برس کی تھی مگر اس حساب پر اعتماد کرنے کی کوئی کافی وجہ نہیں ہے۔

قرآن مجید سے جہاں خدا نے فرمایا ہے

" قالو سمعنا فتیٰ یذکرھم یقال له ابراھیم"

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حضرت ابراہیم جوان تھے اور دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے

" ولقد آتینا ابراھیم رشده من قبل و کنا به عالمین" (سورہ انبیا، آیت 52)

اوراسی آیت کے اس مباحثہ کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل وقت مباحثہ کے حضرت ابراہیم جوان اور رشید ہو چکے تھے اوران کا دل الہامات ربانی سے معمور تھا حسن کے لئے عموماً چالیس برس کی عمر خیال کی جاتی ہے پس کچھ عجب نہیں ہے کہ یہ واقعہ اسی عمر کے قریب قریب واقع ہوا ہو۔

مگر ہمارے علمائے مفسرین کو

فلما جن علیه اللیل

نے گھبرا دیا ہے وہ سمجھے ہیں کہ یہ پہلی دفعہ تھی جوانہوں نے رات دیکھی تھی اور اس لیے بے اصل قصہ اپنی تفسیروں میں لکھا ہے، کہ اس زمانہ کے بادشاہ کے خوف سے، جس نے ایک خواب دیکھا تھا اور لڑکوں کے قتل کا ارادہ کیا تھا، حضرت ابراہیم کی ماں نے ان کے حمل کو چھپایا اور جب لڑکا پیدا ہونے کا وقت آیا تو ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا کر جنا اور اس کا

منہ پتھروں سے بند کر دیا اور حضرت جبریل نے حضرت ابراہیم کی پرورش کی جب وہ اس پہاڑی کی کھوہ میں بڑے ہو گئے تو اس کھوہ میں سے پہلی دفعہ رات کو ایک ستارہ دیکھا پھر چاند دیکھا پھر سورج دیکھا۔

مگر یہ خیال اور یہ قصہ دونوں صحیح نہیں ہیں حضرت ابراہیم کے ناحور اور ھاران دو اور بڑے بھائی تھے اور حضرت ابراہیم سب سے چھوٹے تھے انسان کی فطرت میں ہے کہ جب وہ کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے تو یا تو اسی قوم کی باتوں پر یقین کرتا ہے اور اسی قوم کے عقاید اور اعمال کی پیروی کرنے لگتا ہے یا اس قول کے افعال واقوال کو تعجب وحیرت کی نگاہ سے دیکھتا رہتا ہے، نہ ان پر یقین کرتا ہے اور نہ ان افعال میں شریک ہوتا ہے اور نہ اس کے ذہن میں آتا ہے کہ اصل بات کیا ہے اور ایک تفکر اور سوچ کی حالت میں ایک زمانہ بسر کرتا ہے اور خدا کی ہدایت جو خدا نے انبیاء اور صلحا کی فطرت میں رکھی ہے، اس کی تائید کرتی رہتی ہے اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے

"کذالک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض"

اسی حالت میں ایک ستارہ اور چاند اور اس کے بعد سورج کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کو وہ خیال آیا جو قرآن مجید میں مذکور ہے پس ضرور نہیں ہے کہ وہ رات پہلی ہی رات ہو جو انہوں نے دیکھی تھی۔

3 تیسرے یہ کہ

ملکوت السموات والارض

سے اور اس کے دکھانے سے کیا مراد ہے علمائے مفسرین نے اس کی نسبت بھی بہت سی رطب ویابس باتیں لکھی ہیں مگر خدا کی قدرت اور اس کی عظمت اور وحدانیت پر یقین کرنے کیلئے موجودات عالم اور اس کی خلقت اور فطرت پر غور کرنے سے زیادہ یقین

دلانے والی کوئی چیز نہیں ہے اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد طریقہ پر وجود عالم سے صانع کے وجود پر استدلال کیا ہے پس خدا نے آسمان و زمین کی بادشاہت کی حقیقت حضرت ابراہیم کے دل پر کھولی جس کی ابتداء تارے و چاند و سورج کے رب خیال کرنا اور اس کی انتہا

" انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض"

کہنا ہے اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے، جہاں فرمایا ہے

" کذالک نری ابراهیم ملکوت السموات والارض"

4 چوتھے یہ کہ علمائے اسلام کو ایک اور مشکل پیش آئی ہے کہ ان کے اصول مقررہ کے موافق انبیا کبھی اور کسی حال میں مرتکب شرک و کفر نہیں ہوئے پس کیوں کر حضرت ابراہیم نے تارہ اور چاند اور سورج کو دیکھ کر کہا '' ھذا ربی'' اس شبہ کے رفع کرنے کو انھوں نے متعدد طرح سے صعوبتیں اٹھائی ہیں مگر یہ امر نہایت صاف ہے جس میں کچھ مشکل نہیں۔

بلا شبہ انبیاء علیہم السلام کبھی مرتکب شرک و کفر نہیں ہوتے ان کی فطرت ہی اس آلودگی سے پاک ہوتی ہے مگر قدیم زمانہ میں جو بت پرستی تھی اور جس کفر و شرک میں اس زمانہ کے لوگ گرفتار تھے اس کی حقیقت پر اول غور کرنی لازم ہے تمام مشرکین ذات باری کا کسی کو شریک نہیں قرار دیتے تھے بلکہ خدا کے سوا موجودات غیر مرئی اور اجرام سماوی کو مدبرات عالم اور مالک نفع و نقصان سمجھتے تھے اور انہی کے نام سے ھیاکل اور اصنام بنا کر ان کی پرستش کرتے تھے اور ان ک ویقین تھا کہ ان کی رضا مندی و خوشنودی فائدہ بخش اور ان کی ناراضی مفرت رساں ہے مگر کسی وجود غیر مرئی کو یا کسی کو اجرام سماوی میں سے صرف مدبر عالم خیال کرنا خواہ وہ خیال صحیح ہو یا غلط کفر و شرک نہیں ہوسکتا بلکہ کفر و شرک اس وقت ہوتا ہے۔ جب کہ اس میں قدرت نفع و نقصان پہنچانے کی مانی جاوے یعنی یہ سمجھا جاوے کہ اس

میں قدرت ہے کہ جب چاہے نفع پہنچاوے جب چاہے نقصان اور اسی خیال سے اس کی پرستش کی جاوے مثلاً مسلمانوں کا یہ خیال کہ مینہ کے برسانے والے فرشتے بادلوں پر متعین ہیں اور مینہ برساتے پھرتے ہیں یا یہ خیال کہ آفتاب فصول اربع کا باعث اور روئیدگی اور پھولوں اور پھلوں کا مدبر ہے نہ کفر ہے نہ شرک ہے۔لیکن جب آفتاب یا میگھ راج کی نسبت یہ اعتقاد کیا جاوے کہ ان کو مینہ برسانے یا نہ برسانے اور میوہ پکانے یا نہ پکانے کا اختیار ہے اور ان کی رضا مندی اس کیلئے مفید اور ناراضی مضرت رساں ہے اور اس خیال پر ان کی پرستش کی جاوے،تو وہ بلا شبہ شرک وکفر ہے ترح کے خاندان میں زیادہ تر اجرام علوی کے اصنام کی پرستش ہوتی تھی اس وجہ سے حضرت ابراہیم کا خیال ستارے اور چاند اور سورج پر رب یعنی مدبرات میں سے ہونے کا گیا نہ الہ ہونے کا اور اس کو بھی خدا کی ہدایت سے جو فطرت انبیاء میں ہے قرار نہ ہوا پس صرف یہ خیال شرک وکفر نہ تھا اور حضرت ابراہیم نے ان میں سے کسی کی پرستش نہیں کی نہ ان میں جب چاہیں نفع اور جب چاہیں مضرت پہنچانے کی قدرت یقین کی اس لیے کسی طرح ان کا اس معصیت میں مبتلا ہونا لازم نہیں آتا۔

اس بیان کی تشریح بعد کی آیتوں سے بخوبی ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیم نے فرمایا ہے کہ ''میں نہیں ڈرتا اس سے جس کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو'' پھر فرمایا کہ '' کیوں کر میں ڈروں اس سے جس کو تم شریک کرتے ہو'' یہ اقوال صاف اس بات پر دال ہیں کہ جن کی نسبت حضرت ابراہیم نے ربی کہا تھا ان کو مالک اور قادر نفع ونقصان پہنچانے پر نہیں مانا تھا۔

5 پانچویں یہ کہ اس آیت میں جو الفاظ '' لیکون من الموقنین'' ہیں زیادہ تر غور کے لائق ہیں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ابراہیم کو ملکوت السموات والارض اس لیے دکھائیں تا کہ یقین کرنے والوں میں ہو ہم ان لوگوں کو جو بہ تقلید آبادئی یا باطاعت کسی کے قول کے خدا پر یقین رکھتے ہیں مومن پاک جانتے ہیں مگر جو لوگ کہ بعد غور وفکر کے اور خدا

کی قدرتوں اور صنعتوں پر غور وفکر کر کے خدا پر یقین لاتے ہیں وہ نہایت اعلیٰ درجہ پر ہوتے ہیں جن کا یقین پورا کامل یقین ہوتا ہے اور کسی طرح زائل نہیں ہوسکتا۔ اسی سبب سے خدا نے حضرت ابراہیم کو ملکوت السموات والارض دکھانے کا مقصد یہ بتلایا ہے کہ ''لیکون من الموقنین''

ہمارا یہ یقین و تجربہ ہے کہ انسان کو جس قدر علم فطرت، قوانین قدرت، علم السماء والافلاک بڑھتا جاتا ہے اور نیچر سینز علوم طبیعیات حقہ، میں جس قدر اس کی واقفیت اور مہارت زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کو خدا کے وجود کا یقیں اور اس کی قدرت وعظمت اور شان الوھیت اور استحقاق معبودیت کا دل میں زیادہ نقش ہوتا جاتا ہے وللہ در من قال

برگ درختان سبز در نظر ھوشیار

ھر ورقے دفتریست معرفت گردگار

پس یہی قوانین قدرت لا آف نیچر تھے جو زبان شروع میں ملکوت السموات ولارض سے تعبیر کئے گئے ہیں اور جن کو خدا نے حضرت ابراہیم کو دکھایا تھا یا یوں کہو کہ سمجھایا تھا اور جس کی بدولت انہوں نے ''لیکون من الموقنین'' کا خطاب پایا۔

6 چھٹے یہ کہ یہ مباحثہ حضرت ابراہیم کا جو قرآن میں مذکور ہے توریت میں نہیں ہے توریت میں کسی واقعہ کا نہ ہونا اس کے عدم وقوع کی دلیل نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کے فرشتے

عہد قدیم کا ایک متنازعہ فیہ مسئلہ

توریت اور قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی خوش خبری دینے کیلئے اور حضرت لوط کو ان کی قوم کے عذاب کی پیشین گوئی کرنے کیلئے خدا نے فرشتوں کو بھیجا سرسید اس سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فرشتے نہیں تھے بلکہ انسان تھے ذیل کے مضمون میں سرسید نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔(محمد اسماعیل)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

" ولقد جائت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ قالو سلما قال سلم فما لبث ان جاء بعجل حنید (سورہ ھود آیت29)"

اور بے شک آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر انہوں نے کہا سلام ابراہیم نے کہا سلام پھر ابراہیم نے دیر نہ کی کہ لایا بھنا ہوا بچھڑا۔

سورۂ عنکبوت میں یہ لفظ ہیں

" لما جاء ت رسلنا ابراھیم"

یعنی جب کہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس سورۂ حجر میں بجائے رسلنا کے ضیف کالفظ ہے خدا نے فرمایا

ونبهم عن ضيف ابراهيم

یعنی ان کو خبر دے ابراہیم کے مہمانوں کی

اور سورۂ ذرایات میں ہے

هل اتاک حديث ضيف ابراهيم المكرمين

کیا تیرے پاس ابراہیم کے مکرم مہمانوں کی خبر پہنچی ہے۔

پس امر بحث طلب یہ ہے کہ یہ بھیجے ہوئے یا ضیف ابراہیم کون تھے؟ توریت باب 18 ورس 2 میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ تین آدمی اس کے برابر کھڑے ہیں عبری میں لفظ شلاشہ انشیئم ہے یعنی ثلاثہ انسانین اور پھر ورس 16,22 میں اور باب 19 ورس 5,10,16 میں بھی ان کو انسان کہا ہے مگر باب 19 کے پہلے ورس میں ان کو ملاخسیم یعنی ملائکین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس لیے یہودی ان تینوں کو فرشتے اعتقاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ جبریل ومیکائیل واسرافیل تھے۔

عیسائی بھی ان کو فرشتے مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پہلی ہی دفعہ تھی کہ فرشتے انسان کی صورت بن کر دنیا میں آئے تھے تفسیر ڈائلی اینڈ مانٹ میں لکھا ہے کہ ان میں کا تیسرا بہ نسبت باقی دو کے اعلیٰ درجہ کا تھا اور اس لیے ابراہیم نے اس کو بطور ایک سردار کے خطاب کیا یعنی ''ادنای'' کہہ کر جس کو موسیٰ ''جھوہ'' کہتا ہے اور یہودی اور عیسائی اس کو خدا کا نام سمجھتے ہیں اور اس لیے بہت سے عیسائی تصور کرتے ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا تھا جو اس صورت میں آیا تھا متوسط زمانہ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی شان میں ایک فرشتہ تھا جس نے گفتگو کی تھی اور بلحاظ اس کی مقتدرانہ گفتگو کے یہ غالب رائے ہے کہ وہ خود حضرت مسیح تھے جو انصاف کرنے

کو آئے تھے۔

قرآن مجید میں صرف لفظ ''رسلنا'' یعنی ہمارے بھیجے ہوئے کا ہے مسلمان مفسروں نے صرف یہودیوں کی روایتوں سے جن کی وہ ہمیشہ ایسے مقاموں میں پیروی کرتے ہیں ان کو فرشتے تسلیم کیا ہے مگر قرآن مجید سے ان کا فرشتہ ہونا ثابت نہیں ہوتا یہ تو ظاہر ہے قرآن مجید میں ان کے فرشتے ہونے پر تو کوئی نص صریح نہیں ہے باقی رہا طرز کلام والفاظ وارده پر استدلال قطع نظر اس کے کہ وہ مفید یقین نہیں ہوسکتا ان سے بھی وہ استدلال پورا نہیں ہوتا علمائے مفسرین نے قبل اس کے کہ الفاظ قرآن مجید پر غور کریں یہودیوں کی روایتوں کے موافق ان کا فرشتہ ہونا تسلیم کرلیا ہے حالاں کہ وہ خاصے بھلے چنگے انسان تھے۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ابراہیم کے مہمانوں نے جو کھانا نہ کھایا اس کا سبب یہ تھا کہ وہ فرشتے تھے اور فرشتے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں وہ مہمانوں کی صورت بن کر اس لیے آئے تھے کہ حضرت ابراہیم مہمانوں کے آنے کو دوست رکھتے تھے اور وہ مہمانوں کی ضیافت میں مشغول رہتے تھے۔

مگر کھانے سے انکار کرنا ان کے فرشتے ہونے کی، جو علانیہ انسان تھے اور انسانوں کی طرح آئے تھے، دلیل نہیں ہوسکتا۔

تفسیر کبیر میں سدی کا یہ قول لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان سے پوچھا کہ کھانا کھاؤ گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بغیر قیمت دیئے کھانا نہیں کھاتے ابراہیم نے کہا کہ اس کی قیمت یہ

---

1 واعلم ان الاضیافت انما امتنعوا من الطعام لانهم ملائکة والملائکة لا یاکلون ولا یشربون وانما اتوه فی صورت الاضیاف لیکونووا علی صفة یحبها وهو کان مثغولا بالضیافة (تفسیر کبیر)

ہے کہ کھانے سے پہلے خدا کا نام لو اور کھانے کے بعد کا خدا شکر کرو اس پر جبریل نے میکائیل سے کہا کہ ایسے آدمی کا حق ہے کہ اس کا پروردگار اس کو اپنا خلیل یعنی دوست قبول کرے۔1

مگر کلام سے بھی یہ بات غیر معلوم رہی کہ بعد اس کے انہوں نے کھانا کھایا یا نہیں

قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو نہ جانا کہ یہ کون ہیں (یعنی دوست مہمان ہیں یا دشمن) اور ابراہیم کے جی میں ان سے خوف ہوا۔2

یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ دشمن اس کے ہاں جس سے دشمنی ہو کھانا نہیں کھاتے تھے مگر اس آیت سے یہ بھی نہیں پایا جاتا کہ اس کے بعد بھی انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔

توریت میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کے پاس بھی کھانا کھایا اور جب وہ حضرت لوط کے پاس گئے تو وہاں بھی کھانا کھایا توریت فارسی کے ترجمہ کی یہ عبارت ہے۔

وخداوند ویرا (یعنی ابراهیم را) در بلاطستان ممری ظاهر شد در حالتیکه بر در چادر بگرمی روز می نشست و چشمان خود را کشاده نگریست که اینک سه شخص در مقابلش ایستاده اند و هنگامے که ایشاں را دید از برائے استقبال ایشاں از در چادر دویدو

1قال السدی قال ابراهیم علیه السلام لهم اتاکلون قالو الا ناکل طعلما الا بالثمن فقال ثمنه ان تذکروا اسم الله تعالیٰ علی اوله ونحمدوه علی آخره فقال جبریل لمیکائیل علیه السلام حق لمثل هذا الرجل ان یتخذه ربه خلیلا (تفسیر کبیر)

2فلما را ایدیهم لا تصل الیه نکرهم وا اوجس منهم خیفه (سوره

بسوے زمین خم شد و گفت اے آقایم حال اگر در نظرت التفات یافتم تمنا اینکه از نزد بنده خود نگذری و حال اندرک آبے آورده شود تا آن که پائهائے خود راشست و شو داده در زیر ایں درخت استراحت فرمائید و لقمه نانے خواهم آورد تاکه دل خود را تقویت نمایند بعد ازاں بذرید زیرا که ازیں سبب نبزد بنده خود عبور نمودید پس گفتند بخوے که گفتی عمل نما پس ابراهیم به چادر نزد سارا شتافت و گفت تعجیل نموده سه پیمانه آورده رقیق خمیر کرده گردها براجاق بیز پس ابراهیم بگله گاؤ شتافت و گو ساله تروتازه خوبے گرفته بخوانے داد که آن را بسرعت حاضر ساخت و کره و شیر باگو سالئیکه حاضر کرده بود گرفت و در حضور ایشاں گذاشت و نزد ایشاں بزیر آن درخت ایستاده تا خوردند (کتاب پیدائش باب18ورس8-1)

پس آن دو ملک بوقت شام بسدوم در آمدند و لوط بدروازه سدوم مے نشست و هنگامے که لوط ملاخط کرد از برائے استقبال ایشاں برخاست و بر زمین خم شد و گفت اینک حال اے آقایانم تمنا اینکه بخانه بنده خود تاں بیائید و بیتوته نموده بائهائے خود راشست و شو نمائید و سحر خیزی نموده براه خود روانه شوید پس ایشاں گفتند که بلکه در چهارر سو بیتوته مینایم پس چوں که ایشاں را بسیار ابرام نمود با او آمده بخانه اش داخل شدند و او ضیافتے بجهت ایشاں بر پا نموده گرد هائے فطیری پخت که خوردند (کتاب پیدائش باب19ورس

(1-3

تفسیر کبیر میں ایک یہ بحث پیش کی ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان تینوں کو انسان جانا یا فرشتہ جو لوگ کہتے کہ حضرت ابراہیم نے ان کو انسان جانا تھا ان کی یہ دلیلیں ہیں کہ اگر وہ ان کو فرشتہ جانتے تو کھانے کی تیاری نہ کرتے اور جب انہوں نے کھانے پر ہاتھ نہ ڈالا تھا تو اس سے خوف نہ کرے۔ علاوہ اس کے جب کہ حضرت ابراہیم نے ان کو انسان کی صورت میں دیکھا تھا تو ان کو فرشتہ کیوں کر سمجھ سکتے تھے۔

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نے ان کو گرشتہ جانا تھا ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے کہنے سے حضرت ابراہیم نے ان کو فرشتہ جانا تھا مگر کوئی لفظ قرآن میں ایسا نہیں ہے کہ ان تینوں شخصوں میں سے کسی نے کہا ہو کہ ہم انسان نہیں ہیں بلکہ فرشتے ہیں اور انسان کی صورت بن کر آئے ہیں۔

تفسیر کبیر میں ایک اور عجیب غریب روایت لکھی ہے کہ جب ان فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو بتلا دیا کہ وہ فرشتوں میں سے ہیں اور انسان نہیں ہیں اور وہ صرف قوم لوط کے ہلاک کرنے کو آئے ہیں تو حضرت ابراہیم نے ان سے معجزہ طلب کیا کہ ان کے فرشتہ ہونے پر دلالت کرے پھر انہوں نے اپنے پروردگار سے اس بھنے ہوئے بچھڑے کے زندہ ہو جانے کی دعا مانگی بچھڑا جہاں رکھا ہوا تھا وہاں سے کودا اور اپنے چراگاہ میں چلا گیا۔

ہم کو افسوس ہے کہ ہمارے علماء نے ایسی بے سر وپا اور بے سند مہمل روایتیں اپنی تفسیروں میں لکھی ہیں خدا ان پر رحم کرے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ وہ جو حضرت ابراہیم کے پاس آئے انسان تھے اور قوم لوط کے پاس بھیجے گئے تھے جیسا کہ

1ان الملائکۃ لما اخبروا ابراھیم علیہ السلام انھم الملائکۃ لا من

البشر وانهم جاوا لا هلاک قوم لوط طلب ابراهیم علیه السلام منهم معجزة دالة علی انهم من الملائکة فدعوا ربهم باحیاء العجل المشوی فطغر ذالک العجل المشوی من الوضع الذی وضع فیه الی مرعاہ (تفسیر کبیر)

خود انہوں نے حضرت ابراہیم سے کہا

لا تخف انا ارسلنا الی قوم لوط (سورۂ ہود)

اور دوسری جگہ کہا

انا ارسلنا الی قوم مجرمین (سورۂ حجر)

اور ایک جگہ کہا

انا ارسلنا الی قوم مجرمین لنرسل علیہم حجارة سن طین مسومة عند ربک للمسرفین (سورۂ الذاریات)

بالبشری یعنی ساتھ خوش خبری کے اور وہ خوش خبری حضرت ابراہیم کے حضرت سارا سے بیٹا اور پوتا یعنی اسحاق اور اسحاق سے یعقوب کے پیدا ہونے کی تھی جس کا بیان آگے آوے گا۔

یعنی حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ ان کا ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھا تو نہ جانا کہ یہ کون ہیں اور ابراہیم کے دل میں ان سے خوف پیدا ہوا۔ 1؎

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ جب انہوں نے کھانے سے اپنے تئیں روکا تو حضرت ابراھیم کو خوف ہوا کہ وہ کچھ مکر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جب کوئی انجان آدمی آوے اور اس کے سامنے کھانا لایا جاوے پھر وہ اگر کھالیوے تو اس سے اطمینان ہو جاتا ہے اور اگر وہ نہ کھاوے تو اس سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ 2؎

یہی مضمون سورہ الذاریات میں ان لفظوں سے آیا ہے کہ حضرت ابراہیم بھنا ہوا بچھڑا ان کے پاس لائے کہا کیا تم نہیں کھاتے؟ یعنی جب انہوں نے اس پر ہاتھ نہ بڑھایا جیسا کہ

1ہ فلما را ایدھم لا تصل الیہ نکرھم واو جس منھم خیفہ (سورۂ ھود)

2ہ فلما امتنعوا من الا کل خاف ان یریدوا بہ مکروھا ان لا یعرف اذا حضرو قدم الیہ طعام فان اکل حصل الا من وان لم یاکل حصل الخوف (تفسیر کبیر)

سورۂ ھود میں مذکور ہے تو حضرت ابراہیم نے کہا کہ کیا تم نہیں کھاتے؟ پھر حضرت ابراھیم کے دل میں ان سے خوف پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم کے اس کہنے کے بعد الاتاکلون ان لوگوں نے کھایا ہو اس لیے کھانے کی نفی اس سے نہیں پائی جاتی۔

سورۂ الحجر میں اس واقعہ کو زیادہ اختصار سے بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جب وہ تینوں شخص ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا سلام حضرت ابراہیم نے کہا کہ ہم تم سے خوف کرتے ہیں 1ہ

پورا واقعہ یوں ہے کہ جب وہ تینوں شخص حضرت ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا سلام حضرت ابراہیم نے بھی کہا سلام پھر حضرت ابراہیم بھنا ہوا بچھڑا ان کے لیے کھانے کو لائے جب انہوں نے کھانے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا تو حضرت ابراہیم کے دل میں خوف پیدا ہوا اس پر حضرت ابراہیم نے کہا کہ کیا تم نہیں کھاتے؟ اور یہ بھی کہا کہ ہم تم سے (نہ کھانے کے سبب) خوف کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم سے خوف نہ کرو ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے ہوئے ہیں اور تم کو بھی بشارت دیتے ہیں پس ان تمام حالت سے نہ تو ان

تینوں شخصوں کا فرشتہ ہونا پایا جاتا ہے اور نہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انہوں نے کھانا نہیں کھایا بلکہ اس طرف قرینہ قیاس زیادہ ہے کہ ان اصراروں کے بعد انہوں نے کھانا کھایا ہو اور خدا تعالیٰ نے جوان کو دو جگہ ضیف ابراہیم کر کے بیان کیا ہے یہ قرینہ قوی

1اذ دخلوا علیه قالوا سلاما قال انا منکم وجلون (سورۂ الحجر)

ہے کہ انہوں نے کھانا بھی کھایا اور حضرت ابراہیم کی ضیافت قبول کی۔

پھر خدا نے فرمایا کہ اس کی بیوی کھڑی تھی پھر ہنس پڑی پھر ہم نے اس کو خوش خبری دی اسحاق کے پیدا ہونے کی اور اس کے پیچھے یعنی اسحاق سے یعقوب کے پیدا ہونے کی۔1

حضرت ابراہیم کی بیوی کے ہنسنے کی علت بیٹا ہونے کی بشارت تھی مگر جو کہ ان کا ہنس پڑنا ایک مقدم امر اور زیادہ تر توجہ کے قابل تھا۔ اس لیے معلول کو علت پر مقدم کر دیا ہے۔

تفسیر کبیر میں بھی لکھا ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر ہے تقدیم کلام الٰہی کی یہ ہے کہ اس کی بیوی کھڑی تھی پھر ہم نے اس کو بشارت دی اسحاق کے پیدا ہونے کی اس کی بیوی خوشی سے ہنسی۔ بسبب اس خوش خبری کے پس ہنسنے کو مقدم کر دیا ہے اور معناً وہ موخر ہے2

ایک امر غور طلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پہلے فرمایا کہ

لقد جائت رسلنا ابراهیم بالبشریٰ

یعنی وہ رسل بشارت لے کر آئے تھے اور پھر فرمایا

فبشرنا ها باسحاق

یعنی ہم نے بشارت دی ابراہیم کی بیوی کو اسحاق کے پیدا ہونے کی اس جگہ بشارت کو خاص اپنی طرف منسوب کیا ہے اور سورۂ الحجر میں ضیف ابراہیم کا قول بیان کیا ہے

انا فبشرک بغلام حلیم "

1 وامرته قائمة فضحكت فبشرنا ها باسحاق ومن وراء اسحاق يعقوب (سورۂ هود)

2 ان هذا على التقديم والتاخير والتقدير وامرته قائمة فبشرنا ها باسحاق فضحكت سرورا بسبب تلك البشارة فقدم الضحک و مغناه التاخير (تفسير كبير)

یعنی ضیف ابراہیم نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ ہم تجھ کو بشارت دیتے ہیں دانا لڑکے کے پیدا ہونے کی اور سورۃ الذاریات میں ہے

" وبشر وه بغلام حليم"

یعنی ضیف ابراہیم نے حضرت ابراہیم کو دانا لڑکے کے پیدا ہونے کی بشارت دی؟

اور اسی طرح سورہ ھود میں ہے

قالت ياويلتىٰ ء الدوانا عجوز وهذا بعلي شيخا

یعنی ابراہیم کی بیوی نے کہا کہ "افسوس مجھ کو کیا میں جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں اور میرا خصم بڈھا ہے۔"

اور سورہ الذاریات میں ہے کہ حضرت ابراہیم کی بیوی حیرت میں ہو کر آگے بڑھی اور منہ لپیٹ لیا اور کہا کہ بانجھ بڑھیا1 (یعنی کیا بانجھ بڑھیا بیٹا جنے گی)

اور سورۃ الحجر میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا کہ "کیا تم مجھ کو بشارت دیتے ہو باوجودیکہ مجھ پر بڑھاپا آگیا ہے پھر کس طرح تم مجھ کو بشارت دیتے ہو2"

مگر وہ تینوں شخص خدا کے بھیجے ہوئے تھے انہوں نے بذریعہ الہام یا وحی کے جوان پر خدا نے بھیجی تھی یہ بشارت دی تھی قرآن مجید کا طرز کلام بہت جگہ اس طرح پر ہے کہ خدا تعالیٰ علۃ العلل ہونے کی وجہ سے بندوں کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس لیے

سورۃ ھود میں اس بشارت کو اپنی طرف نسبت کیا ہے کہ ہم نے بشارت دی اور مقاموں پر اپنے رسل

1فاقبلت امرته فی صرة فصکت وجھا وقالت عجوز عقیم (سورۃ الذاریات)

2قال البشر تمونی علی ان منی الکیر فیما تبشرون (سورۃ الحجر)

کی طرف منسوب کیا ہے جن کے ذریعہ سے وہ بشارت دی گئی تھی مگر درحقیقت بشارت دینے والا خدا ہے۔

یہ بشارت جو حضرت اباہیم کے حضرت سارا سے بیٹا پیدا ہونے کی تھی دونوں کو معاً بشارت تھی یعنی ایک بشارت دونوں کے لیے تھی اور دونوں نے اس کو سنا تھا اور اس لیے کبھی اس بشارت کو حضرت ابراہیم سے اور کبھی ان کی بیوی سے منسوب کیا ہے جو ضمناً اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں کیلئے یکساں بشارت ہے اور اسی سبب سے کہیں حضرت سارا کا قول نقل کیا ہے کہ

" انا عجوزو ھذا بعلی شیخا"

اور کہیں حضرت ابراہیم کا قول نقل کیا ہے کہ

" ابشر تمونی علی ان مسنی الکبر"

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بشارت سن کر دونوں نے یہ بات کہی تھی۔

ان تینوں رسولوں نے جب حضرت سارا کا اس بشارت پر تعجب سنا تو انھوں نے کہا

" اتعجبین من امر اللہ"

یعنی کیا تو تعجب کرتی ہے خدا کے حکم سے اور حضرت ابراہیم کا تعجب سن کر انھوں نے کہا کہ ہم نے تجھ کو خوشخبری دی ہے ٹھیک بس تو نا امیدوں میں سے مت ہو حضرت ابراہیم

نے کہا کہ کون شخص خدا کی رحمت سے ناامید ہوتا ہے بہ جز گمراہوں کے [1]

یہ خیال کرنا کہ حضرت ابراہیم و حضرت سارا کی اولاد مافوق الفطرت ہوئی تھی اس پر قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

---

[1] بشرناک بالحق فلاتکن من القانطین قال ومن یقنط من رحمۃ ربہ الا الضالون (سورۂ الحجر)

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی نسبت لفظ شیخ آیا ہے اور لفظ شیخ ایسا نہیں ہے کہ اس سے یہ سمجھا جاوے کہ حضرت ابراہیم اس حد سے جس میں موافق قانون قدرت کے اولاد ہوسکتی ہے گذر چکے تھے۔

حضرت سارا کی نسبت لفظ عجوز آیا ہے اور عجوز کا لفظ اور شیخۃ کا لفظ دونوں مرادف ہیں بلکہ کبھی جوان عورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے قاموس میں لکھا ہے والعجوز ۔۔۔ المراۃ شابۃ کانت اور شیخۃ اور یہی عجوز کا لفظ شورہ شعراء میں حضرت لوط کی بیوی کی نسبت آیا ہے پس اس لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سارا ایسی حد پر پہنچ گئی تھیں جو موافق قانون قدرت کے ان سے اولاد ہونی ناممکن ہو۔

دوسرا لفظ حضرت سارا کی نسبت عقیم یعنی بانجھ کا آیا ہے۔ جن عورتوں کے ہاں ایک زمانہ تک جو بہ نسبت عام عادت کے زیادہ ہو اولاد نہیں ہوتی ان پر عادتاً عقیم کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ وہ اولاد جننے کے ناقابل ہوتی ہیں کیوں کہ بعض عورتیں اب بھی ایسی موجود ہیں جن کے مدت تک اولاد نہیں ہوئی اور وہ عقیم تصور ہونے لگیں لیکن بڑی عمر میں جب کہ وہ شیخۃ ہوگئیں ان کے اولاد ہوئی ایک شوہر دار عورت کو میں جانتا ہوں کہ قریب چالیس برس کی عمر تک اس کے اولاد نہیں ہوئی بعد اس کے وہ حاملہ ہوئی اور بیٹی جنی بلاشبہ لوگوں کو اس کے حاملہ ہونے اور بیٹی جننے پر تعجب ہوا تھا۔

مسلمان مفسر جو بغیر غور کے یہودیوں کی روایتوں کی پیروی کرنے کے عادی ہوگئے اس لیے انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سارا کی عمر اس قدر بڑی ہوگئی تھی کہ ان سے اولاد کا ہونا ناممکن تھا اور اس لیے انہوں نے اس واقعہ کو بطور ایک معجزہ کے مافوق الفطرت قرار دیا ہے۔

توریت میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کی ننانوے برس کی عمر تھی جب ان کا ختنہ ہوا (کتاب پیدائش باب 17 ورس 24) اور ایک برس بعد وہ تین شخص بشارت دینے کو آئے تھے پس وقت ان کی عمر سو برس کی تھی۔

اور سارا کی نسبت لکھا ہے کہ وہ سال خوردہ ہوگئی تھیں اور عورتوں کی عادت بند ہوگئی تھی (کتاب پیدائش باب 18 ورس 11)

غرض کہ عبری توریت کے حساب سے بشارت کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر سو برس کی تھی اور حضرت سارا کی نوے برس کی تھی مسلمانوں نے ان روایتوں کی پیروی کی اور حضرت اسحاق کا پیدا ہونا فوق الفطرت بطور معجزہ کے قرار دیا باوجودیکہ توریت ہی سے پایا جاتا ہے کہ اس عمر میں بھی لوگوں کے بغیر کسی معجزہ تسلیم کیے اولاد ہوئی ہے۔ چناں چہ توریت کے حساب کے موافق جب حضرت اسماعیل پیدا ہوئے تھے تو حضرت ابراہیم کی عمر چھیاسی برس کی تھی اور جب حضرت یعقوب کے حضرت یوسف پیدا ہوئے ہیں تو مطابق حسب توریت عبری کے حضرت یعقوب کی عمر نوے برس کی تھی اور جب بنامین یوسف کے بھائی پیدا ہوئے ہیں تو حضرت یعقوب کی عمر ایک سو برس کی تھی۔

مسلمان مفسروں نے جو اس باب میں یہودیوں کی روایتوں کی پیروی کی ہے صریح غلطی کی ہے کیوں کہ ان زمانوں کی صحت پر جو توریت سے نکلتے ہیں نہایت شبہ ہے۔

مثلاً عبری توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم 2008 دنیوی میں یعنی

سن 1996 قبل مسیح کے پیدا ہوئے تھے اور یونانی توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ 3394 دنیوی میں پیدا ہوئے تھے اور سامری کی توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ سن 2309 دنیوی میں ہوئے تھے۔

حضرت سارا موافق توریت عبری کے سن 2018 دنیوی میں پیدا ہوئی تھی یعنی دس برس حضرت ابراہیم سے چھوٹی تھیں اور سن 2107 دنیوی میں بشارت ہوئی تھی جب حضرت ابراہیم ننانوے برس کے تھے اور حضرت سارا نواسی برس کی تھیں۔

مگر جب کہ توریت کے نسخوں میں اس قدر اختلاف ہے تو جو زمانہ ان سے نکلتا ہے بطور تخمینہ و انداز کے تصور ہوسکتا ہے نہ بطور ایسے یقین کے جس پر کوئی امر مافوق الفطرت بطور یقین کے مبنی ہو سکے۔

علاوہ ازیں جو زمانے توریت سے تسلیم کیے گئے ہیں ان میں بھی بدیہی غلطیاں ہیں جس کو مفصل بیان کرنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے علاوہ اس کے ایک نہایت بڑی بحث یہ ہے کہ برس جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر اس زمانے کے لوگوں کی عمر کا حساب بتلایا ہے ان کی مقدار کیا تھی کچھ شبہ نہیں ہے کہ مختلف زمانوں میں برس کی مقدار نہایت ہی مختلف رہی ہے اور اسی مقدار سے جس زمانہ میں جس کی عمر جتنے برس کی گئی جتنی تھی وہی تعداد توریت میں اور نیز بعض جگہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اور یہ امر نہایت غور اور تحقیقات اور بیان کا محتاج ہے کیا عجب ہے کہا گر خدا نے مدد کی اور توفیق دی تو تفسیر القرآن کے کسی مناسب مقام میں یا ایک جداگانہ رسالہ میں ہم اس کو بیان کریں گے اس مقام پر صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہے کہ ہرگاہ قرآن مجید سے حضرت ابراہیم اور حضرت سارا کی وہ حالت جس میں مطابق قانون قدرت کے اولاد کا ہونا ناممکن ہو ثابت نہیں ہے تو صرف یہودیوں کی روایتوں یا توریت کی استدلال پر اس کو ایک واقعہ فوق الفطرت یقین کرنا صحیح

نہیں ہے۔

اس کے آگے قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کا ڈر جاتا رہا اوران کوخوشخبری مل گئی اوران کوحضرت لوط کی قوم پرعذاب نازل ہونے کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اس میں جھگڑنا شروع کیا1۔

اول یہ بحث ہے کہ حضرت ابراہیم کوقوم لوط پرعذاب نازل ہونا کس طرح معلوم ہوا (توریت باب 18 ورس 20,21,22 میں لکھا ہے کہ خداوند گفت چوں فریاد سدوم وعموارہ زیادہ وگناھان ایشاں بسیار شنگین است پس فرود آمدہ خواھم دید کہ آیا بالکیہ مثل فریادے کہ بمن رسیدہ است عمل نمودہ اند اگر چنیں نہ باشد خواھم دانست وآن اشخاص توجہ نمودہ بسوے سدوم روانہ شدند۔ جس لفظ کا ترجمہ خداوند کیا گیا ہے وہ لفظ یہوہ یا جھوہ ہے جو خدا کا نام ہے پس توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم کواس سے خبر دی تھی مگر قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی تین شخصوں نے جو بھیجے گئے تھے خبر دی تھی۔

سورۃ الحجر میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا پھر کیا ہے تمہارا کام اے بھیجے ھوؤں انہوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گہنگار قوم کی طرف 2۔

اورسورۂ الذاریات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا پھر تمہارا کیا کام ہے اے بھیجے ہوؤ انہوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گہنگار قوم کی طرف تا کہ ہم ڈالیں ان پر پتھر

1۔ **فلما ذهب عن ابراهيم الروع و جائته البشرىٰ يجادلنا فى قوم نوط** (سورہ هود آيت 77)

2۔ **قال فما خطبكم ايها المرسلون قالو انا ارسلنا الى قوم مجرمين** (سورۂ الحجر)

مٹی سے نشان کیے گئے ہیں تیرے پروردگار کے نزدیک حد سے بڑھ جانے والوں

کے لیے 1؎

دوسری اس پر یہ بحث ہے کہ حضرت ابراہیم نے کس سے بحث شروع کی اس آیت میں ''نا'' کی ضمیر خدا کی طرف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے بحث بمعنی التجا شروع کی۔ توریت باب 18 ورس 23 سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحث خدا ہی سے ہوئی تھی کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ ان اشخاص کے سدوم کو چلے جانے کے بعد ''درحالیکہ ابراھیم در حضور خداوند مے ایستادہ پس ابراھیم تقرب جستہ گفت الخ''

مگر ہمارے علمائے مفسرین لکھتے ہیں کہ یجادلنا سے مراد یجادل رسلنا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جو بحث لکھی ہے وہ نہایت مختصر اور ایک امر کی نسبت ہے اور توریت میں جو لکھی ہے وہ نہایت لمبی ہے ممکن ہے کہ جو بات قرآن مجید میں ہے وہ ان تین شخصوں سے ہوئی ہو اور جس مجادلہ کا ذکر سورہ ھود میں ہے اور یجادلنا کے لفظ سے بیان ہوا ہے وہ التجا خدا ہی سے ہو۔

سورۂ ھود میں تو مجادلہ کا کچھ بیان نہیں ہے اور سورۃ الحجر میں صرف اس قدر ہے کہ ان تین شخصوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گنہگار قوم کی طرف بہ جز آل لوط کے یعنی کہ وہ گنہگار قوم میں نہیں ہیں ہم بیشک ان سب کو بچانے والے ہیں بہ جز اس کی جورو کے ہم نے ٹھیرا دیا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں ہے 2؎

---

1 قال فما خطبکم ایھا المرسلون قالو انا ارسلنا الی قوم مجرمین لنرسل علیھم حجارۃ من طین مسومۃ عند ربک للسرفین (سورۂ الذاریات)

2؎ قالو انا ارسلنا الی قوم مجرمین الا آل لوط انا المنجوھم اجمعین الا امراتہ قدرنا انھا لمن الغابرین (سورۂ ھود)

اور سورہ عنکبوت میں ہے کہ ان تین شخصوں نے جو حضرت ابراہیم کے پاس آئے تھے کہا کہ ہم بیشک اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں بات یہ ہے کہ اس بستی کے رہنے والے ظالم ہیں حضرت ابراہیم نے کہا کہ اس میں تو لوط بھی ہے انہوں نے کہا کہ ہم جانتے ہیں اس کو جو اس میں ہے البتہ بچا دیں گے ہم اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز اس کی جورو کے وہ ہے پیچھے رہنے والوں میں سے 1

اور سورۂ الذاریات میں ہے کہ ان تین شخصوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گنہگار قوم کی طرف تا کہ ہم ڈالیں ان پر پتھر مٹی سے، نشان کئے گئے تیرے پروردگار کے نزدیک حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے پھر ہم نے اس کو نکال لیا جو اس میں ایمان والوں میں ہے اور پھر ہم نے اس میں نہیں پایا سوائے ایک گھر کے مسلمانوں میں سے اور ہم نے اس میں ایک نشانی چھوڑ دی ان لوگوں کے لیے جو دکھ دینے والے عذاب سے ڈرتے ہیں 2

ان آیتوں میں تو حضرت ابراہیم کا صرف حضرت لوط کی نسبت سوال کرنا معلوم ہوتا ہے مگر ان آیتوں میں جو ایک مشکل ہے وہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں جو الفاظ انا لمنجوھم یعنی

1قالو انا مھلکوا ھذہ القیرۃ ان اھلھا کانوا ظالمین قال ان فیھا لوطا قالوا نحن اعلم لمن فیھا الننجینہ واھلہ الا امراتہ انت من الغابرین (سورۂ عنکبوت)

2قالو انا ارسلنا الی قوم مجرمین لنرسل علیھم خجارۃ من طین مسومۃ عند ربک للمسرفین فاخرجنا فیھا من المومنین فما وجدنا فیھا غیر بیت المسلمین و ترکنا فیھا آیۃ للذین یخافون العذاب الا لیم (سورۂ الذاریات)

بیشک ہم ان سب کو بچانے والے ہیں انا مھلکو اھذ ہ القریعنی ہم بیشک اس بستی کے

لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں

لنرسل علیھم حجارۃ

یعنی تا کہ ہم ڈالیں ان پر پتھر فاخرجنا پھر ہم نے لوط کو نکال لیا

فما وجدنا فیھا

یعنی ہم نے بجز ایک گھر مسلمان کے اور نہ پایا وترکنا فیھا اور چھوڑی ہم نے اس میں نشانی اور مثل اس کے اور چند الفاظ ہیں کہ اس پر مقتدرانہ کہنا نہ رسولوں کے اختیار میں ہے نہ فرشتوں کے بلکہ یہ مقتدرانہ کام صرف خدا کی قدرت میں ہیں نہ کسی بندے کے خواہ رسول ہوں یا انسان یا فرشتے۔

اس کی نسبت تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ ان تمام مقتدرانہ کاموں کو جو ان تین شخصوں نے اپنی نسبت کیا ہے جو خدا کے کام ہیں اس لیے کیا ہے کہ خدا سے ان کو تقرب و خصوصیت حاصل تھی[1]۔

مگر میں اس توجیہ کو تسلیم نہیں کرتا کوئی بندہ ایسے مقتدرانہ کام اپنی نسبت منسوب نہیں کرسکتا اس قصہ کو خدا نے حکایۃً بیان کیا ہے جس میں ان تین شخصوں کے اقوال اور خدا کے مقتدرانہ افعال دونوں شامل بیان ہوئے ہیں پس وہ تمام ضمیریں اور مقتدرانہ الفاظ خدا کی طرف ہیں نہ ان تین شخصوں کی طرف۔

اس کا ثبوت خود قرآن مجید کی ایک آیت سے ہوتا ہے جس میں بلا ذکر ان تین شخصوں کے ان مقتدرانہ امور کو خدا نے خاص اپنی طرف منسوب کا ہے سورۂ قمر میں خدا نے فرمایا ہے یعنی جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو بیشک

1۔ **اسنادھم ایاہ الی انفسھم وھو فعل اللہ تعالیٰ لما لھم من القرب والا ختصاص بہ (تفسیر بیضای)**

ہم نے پہنچائی ان پر پتھروں کی بوچھاڑ بجز لوط کے لوگوں کے ہم نے ان کو بچایا صبح کے وقت اپنے پاس سے انعام کر کے اسی طرح ہم بدلا دیتے ہیں اس کو جو شکر کرتا ہے اور بیشک ان کو ڈرایا تھا ہمارے عذاب سے، پھر انہوں نے تکرار کی ڈرانے والوں سے اور بیشک انہوں نے دند مچائی اس یعنی لوط کے مہمانوں سے پھر بیکار کر دیں ہم نے ان کی آنکھیں پھر وہ چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا اور بے شبہ گھیر لیا ان کو بہت سویرے جگہ پر قائم رہنے عذاب نے پھر چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا[1]

توریت میں ایک اور مجادلہ کا یعنی التجا کا ذکر لکھا ہے جو ابراہیم نے خدا سے کی تھی اور سورہ ھود میں جو

یجادلنا فی قوم لوط

آیا ہے اور وہ مجادلہ بیان نہیں کیا کیا عجب ہے کہ اس سے وہی مجادلہ یا التجا مراد ہو جس کا ذکر توریت میں ہے مفسرین بھی اس لفظ سے یہی مجادلہ بمعنی التجا سمجھتے ہیں چناں چہ ہم فارسی ترجمہ توریت کا اس مقام پر نقل کرتے ہیں

و آں اشخاص از آں جا توجہ نمودہ بسوئے سدوم روانہ شدند در حالتیکہ ابراھیم در حضور خدا وندمے ایستادہ پس ابراھیم تقرب جستہ گفت کہ آیا حقیقۃ صالح را با طالح ھلاک خواھی ساخت احتمال دارد کہ در اندرون شھر پنجاہ نفر صالح باشند آیا بشود کہ آں مکان را ھلاک سازی و بسبب آں پنجاہ نفر صالحے کہ در اندرونش

1ء کذبت قوم لوط بالنذر انا ارسلنا علیھم حاصبا الا آل لوط نجیناھم سحر نعمۃ من عندنا کذالک نجزی من شکر ولقد انذرھم بطشتنا فتماروا بالنذر ولقد راودوہ عن ضیفہ فطمسنا اعینھم فذوقوا ھذا

بے ونذر ولقد صبحهم بکرة عذاب مستقر فذوقوا عذابی ونذر (سورۂ قمر)

مے باشند نجات ندهی حاشا از تو که مثل این کارے کنی و صالحان را با طالحان هلاک سازی و صالح با طالح مساوی باشد حاشا از تو آیا میشود که حاکم تمامی زمین عدالت نکند پس خداوند گفت اگر درمیان شهر سدوم پنجاه نفر صالح پیدا بکنم تمامی اهل آن مکان را بسبب ایشان نجات خواهم ذاد و ابراهیم در جواب گفت اینک حال منکه خاک و خاکستر ستم آغاز تکلم نمودن با قایم مے نمایم بلکه از پنجاه نفر صالح پنج نفر کمی نمایند آیا میشود که تمامی اهل شهر را به سبب آن پنج نفر هلاک سازی پس گفت اگر در آنجا چهل و پنج نفر یابم هلاک نخواهم کرد و بار دگر باو متکلم شده گفت بلکه در آن چهل نفر یافته شود پس او گفت که به سبب چهل نفر آن عمل نخواهم نمود و او گفت تمنا اینکه آقایم غضبناک نشود که تکلم تمایم بلکه در آن سی نفر یافته شوند او گفت اگر درا ینجا سی نفر پیدا بکم آن عمل نخواهم نمود دیگر گفت اینک حال آغاز تکلم با آقایم نموده ام بلکه در آنجا بست نفر یافته شود او گفت که به سبب بست نفر هلاک آن نخواهم کرد و دیگر گفت تمنا اینکه آقایم غضب ناک نشود تا آن که یک بار دیگر تکلم نمایم بلکه در آنجا ده نفر پیدا شود و گفت که بسبب ده نفر هلاک شان نخواهم گردد و خداوند هنگامے که کلام را با ابراهیم انجام رسانده بود روانه شد و ابراهیم بمکانش رجعت نمود

(کتاب پیدائش باب18ورس22لغایت33)

ولما جاء ت رسلنا لوطا

اب یہاں سے حضرت لوط کا قصہ شروع ہوا مگر یہاں اس قصہ کے اخیر کا بیان ہے شروع قصہ اورسورتوں میں بیان ہوا ہے توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط جب مصر سے واپس آئے تو علیحدہ علیحدہ ہوگئے حضرت ابراہیم کنعان میں رہے اور حضرت لوط اردن کے میدان میں جو نہایت سرسبز وشاداب وزرخیز خطہ تھا اور جہاں سدوم وعموراہ واوما دزبوئیم کی بستیاں تھیں چلے گئے۔

اس زمانہ میں ان تمام ملکوں میں طوائف الملو کی تھی اور آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں ایک لڑائی میں حضرت لوط قید ہوگئے حضرت ابراہیم نے فوج جمع کر کے پانچ بادشاہوں سے مقابلہ کیا اور حضرت لوط کی اور سدوم والوں کو چھڑایا۔ یہ واقعہ عبری توریت کے حساب سے سن 2092 دنیوی میں یا سن 1912 قبل مسیح ہوا تھا۔

غرض کہ حضرت لوط سدوم میں رہتے تھے جہاں کے لوگ نہایت بدکار تھے حضرت لوط نے ان سے کہا کہ میں خدا کا رسول ہوں میری اطاعت کرو اور جو بد باتیں ان میں تھیں ان کے چھوڑنے کی نصیحت کی۔

سورہ شعرا میں خدا فرماتا ہے کہ [1] جھٹلایا لوط کی قوم نے رسولوں کو جب کہ ان سے کہا ان کے بھائی لوط نے کہ کیا تم نہیں ڈرتے بیشک میں تمہارے لئے رسول ہوں رسالت مجھے سپرد ہے پھر ڈرو اللہ سے اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اس پر

---

1 کذبت قوم لوط المرسلین اذ قال لھم اخوھم لوط الا تتقون افی لکم رسول امین فاتقو اللہ واطیعون وما اسلکم علیہ من اجران اجری الا علی رب العالمین اتاتون الذکران من العالمین وتذرون وما خلق لکھم

ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عادون قالوا لئن لم تنته یالوط لتکونن من المخرجین قال انی لعلملکم من القالین رب بخنی و اھلی مما یعملون فنجیناہ واھلہ اجمعین الا عجوزا فی الغابرین ثم دمرنا الاخرین وامطرنا علیھم مطر فاء مطر المنذرین (26الشعراء 60، لغایت173)

کچھ بدلا نہیں مانگتا، میرا بدلا دینا کسی پر نہیں ہے بجز عالموں کے پروردگار پر، کہا تم مردوں کے پاس آتے ہو جو دنیا میں ہیں اور چھوڑتے ہو اس کو جسے پیدا کیا ہے تمہارے لیے تمہارے پروردگار نے تمہاری جوروؤں میں سے بلکہ تم ایک قوم ہو حد سے بڑھ جانے والی انہوں نے کہا کہ اے لوط اگر تو بس نہ کرے گا تو بیشک نکالے گیوں میں سے ہوگا لوط نے کہا کہ بیشک میں تمہارے کام کے دشمنوں میں سے ہوں اے پروردگار مجھ کو اور میرے لوگوں کو اس کام سے جو وہ کرتے ہیں (یعنی اس کے وبال سے) نجات دے پھر نجات دی ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز ایک ادھیڑ عورت یعنی لوط کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی پھر ہلاک کر دیا ہم نے اوروں کو اور برسایا ہم نے ان پر مینہ ایک قسم کا پھر ڈرائے گیوں پر مینہ برا ہے [1]

اسی طرح سورہ نمل میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے لوط کو بھیجا جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بیحیائی کا کام کرتے ہو اور تم دیکھتے ہو کیا تم بری خواہش سے عورتوں کے سوا مردوں کے پاس آتے ہو بلکہ تم جاہل قوم ہو پھر کچھ نہ تھا اس کی قوم کا جواب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ لوط کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں پھر بچا دیا

1ولوطا اذ قال لقومه اتاتون الفاحشة وانتم تبصرون انکم لتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء بل انتم قوم تجھلون فما کان جواب قومه الا ان قالو اخرجوا آل لوط من قریتکم انھم اناس یتطھرون فانجیناء واھله

الا امراته قدرنا ها من الغابرين و امطرنا علیهم مطرا فساء مطر المنذرین (27نمل55لغایته 59)

ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز اس کی جورو کے ہم نے اس کیلئے ٹھہرا دیا تھا کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے اور برسایا ہم نے ان پر ایک قسم کا مینہ پھر ڈرائے گیوں پر مینہ برا ہے 1؎

اور سورۂ اعراف میں ہے اور بھیجا ہم نے لوط کو جس وقت کہ اس نے کہا کہ اپنی قوم کو کیا تم فحش کرتے ہو کہ اس کو تم سے پہلے کسی ایک نے بھی جہان کے لوگوں سے نہیں کیا بیشک تم مردوں کے پاس آتے ہو شہوت رانی کو عورتوں کے سوا ہاں تم ایک قوم ہو حد سے گزری ہوئی اور نہ تھا ان لوگوں کا جواب بہ جز اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو ان کو اپنی بستی سے بیشک وہ آدمی ہیں اپنے تئیں پاک بنانے والے پھر نجات دی ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بہ جز اس کی عورت کے کہ وہ تھی پیچھے رہنے والوں میں اور برسایا ہم نے ان پر برسانا پھر دیکھ کیا ہوا انجام گنہگاروں کا۔

اسی طرح سورہ عنکبوت میں خدا نے فرمایا ہے کہ 2 بھیجا ہم

1؎ ولوطا اذ قال لقومه اتاتون الفاحشته ما سبقکم بها من احد من العالمین انکم لتاتون الرجال شهوة من دون النباء بل انتم قوم مصرفون وما کان جواب قومه الا ان قالو اخرجوهم من قریتکم انهم اناس یتطهرون فانجیناه و اهله الا امراته کانت من الغابرین و امطرنا علیهم مطر فانظر کیف کان عاقبة المجرمین (7الاعراف78 لغایت82)

2؎ ولوطا اذ قال لقومه انکم لتاتون الفاحشة ما سبقکم بها من احد من العالمین انکم لتاتون الرجال و تقطعون السبیل و تاتون فی نادیکم

النكر فما كان جواب قومه الا ان قالو ائتنا بعذاب الله ان كنت من الصادقين قال رب انصرني على القوم المفسدين (سورۂ عنکبوت)

نے لوط کو جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ البتہ تم بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا کے لوگوں میں سے نہیں کیا کیا یہ ٹھیک بات ہے کہ تم مردوں کے پاس آتے ہو اور رستہ لوٹتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو۔ پھر اس کی قوم کا کچھ جواب نہ تھا بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے خدا کا عذاب لا اگر تو سچا ہے لوط نے کہا اے پروردگار میری مدد کر ظالم قوم پر۔

غرض کہ حضرت لوط ان کو بری باتوں کے چھوڑنے کی نصیحت کرتے تھے اس عرصہ میں یہ تینوں رسول جو حضرت ابراہیم کے پاس آئے تھے وہاں پہنچے۔ حضرت لوط ان کے آنے سے کبیدہ خاطر اور ان کے سبب سے دل تنگ ہوئے اور کہا کہ آج کا دن نہایت سخت ہے۔

یہی مضمون سورۂ عنکبوت میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ جب آئے ہمارے رسول لوط کے پاس تو ان کے آنے سے کبیدہ خاطر اور ان کے سب سے دل تنگ ہوا انہوں نے کہا کہ مت ڈر اور غمگین مت ہو بے شک ہم تجھ کو اور تیرے لوگوں کو بچاویں گے بہ جز تیری جورو کے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے اور ہم اتارنے والے ہیں اس بستی کے لوگوں پر عذاب آسمان سے اس لیے کہ وہ بدکاری کرتے ہیں اور بے شک ہم نے چھوڑا اس بستی کا نشان ظاہر واسطے ان لوگوں کے جو سمجھتے ہیں[1]

---

[1] ولما ان جاء ت لوط سنی بهم وضاق بهم ذرعاء قالوا الا تخف ولا تحزن انا منجوک واهلک الا امراتک کانت من الغابرین انا منزلون علی اهل هذا القریة رجزا من السماء بما کانوا یفسقون ولقد

تر کنا منها آیة بینة لقوم یعقلون (عنکبوت)

یہی مضمون سورہ حجر میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ [1] جب لوط کے لوگوں کے پاس وہ رسول آئے تو کہا تم انجان لوگ ہو انہوں نے کہا کہ ہاں ہم تیرے پاس وہ لائے ہیں جس میں وہ شبہ کرتے تھے اور ہم تیرے پاس سچائی سے آئے ہیں اور بیشک ہم سچے ہیں ان تینوں شخصوں یا رسولوں کے آنے کی خبر پا کر حضرت لوط کی قوم کے لوگ دوڑ پڑے یعنی حضرت لوط کا مکان گھیر لیا۔

یہی مضمون مگر اس سے کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ حجر میں آیا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ شہر کے لوگ خوشی کرتے ہوئے آئے یعنی لوط کے گھر پر اس کا گھر گھیر کر جو لوگ اس کے گھر میں آئے تھے ان کے گرفتار کر لینے کے لیے۔ حضرت لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں پھر ان کو فضیحت مت کرو اور خدا سے ڈرو اور مجھ کو ذلیل مت کرو ان لوگوں نے کہا کہ کیا ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا تھا دنیا کے لوگوں سے (یعنی دوسرے ملک کے لوگوں سے ملنے اور بلانے اور اپنے ہاں رکھنے سے) لوط نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو (یعنی اگر تم میرے مہمانوں کو پکڑنا چاہتے ہو) قسم ہے تیری زندگی کی کہ بے شک وہ اپنی گمراہی میں اندھے ہو رہے تھے پھر جا لیا ان کو ہولناک آواز نے سورج نکلتے ہوئے پھر ہم نے شہر کی بلندی کو نیچان میں ڈال دیا اور ہم نے ان پر آگ میں پکے ہوئے مقدر کیے ہوئے پتھر برسائے بیشک اس

1 فلما جاء لوط المرسلین قال انکم قوم منکرون قالوا بل جئناک بما کانوا فیه یمترون و آتیناک بالحق وانا لصادقون (سورة الحجر)

میں نشانیاں ہیں عبرت پکڑنے والوں کو [1]

اور سورۂ قمر میں فرمایا ہے کہ جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو بے شک ہم نے

بھیجی ان پر پتھروں کی بوچھاڑ بہ جز لوط کے لوگوں کے ہم نے ان کو بچایا صبح کے وقت اپنے پاس سے انعام کر کے اسی طرح ہم بدلا دیتے ہیں ان کو جو شکر کرتا ہے اور بے شک ان کو ڈرایا تھا ہمارے عذاب سے پھر انہوں نے تکرار کی ڈرانے والوں سے اور بے شک انہوں نے دند مچائی اس کے یعنی لوط کے مہمانوں سے پھر بے کار کر دیں ہم کے ان کی آنکھیں پھر وہ چکھیں میرے عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا اور بے شبہ گھیر لیا ان کو بہت سویرے جگہ پر قائم رہنے والے عذاب نے پھر چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا 2ے

سورہ ھود کی اور ان سورتوں کی جن کا ہم نے ذکر کیا تمام آیتوں پر غور کرنے کے بعد تین امور بحث طلب معلوم ہوتے ہیں

اول سدوم والوں نے کیوں حضرت لوط کا گھر گھیرا اور مہمانوں کو پکڑنا چاہا۔

---

1 وجاء اهل المدينة يستبشرون قال ان هولا ضيفى فلا تفضحون واتقوالله ولا تخزون قالوا اولم ننهك عن العالمين قال هولاء بناتى ان كنتم فاعلين لعمرك انهم لفى سكرتهم يعمهون فاخذتهم الصيحة مشرقين فجعلنا عاليها سافلها وامطرقا عليهم حجارة من سجيل ان فى ذالك المتوسمين (سوره حجر)

2ے كذبت قوم لوط بالنذر انا ارسلنا عليهم حاصبا الا آل لوط نجينا هم بسحر نعمة من عندنا كذالك نجرى من شكر ولقد انذرهم بطشتنا فتياروا بالنذر والقد راودوه عن ضيفه فطمنسا اعينهم فذوقوا عذابى و نذر (54القمر 33 لغايته لغايت39)

دوم: ھولاء بناتی ان کنتم فاعلین سے کیا مطلب ہے

سوم: جو عذاب نازل ہوا وہ کیا تھا اور کیوں کر تھا اور سورہ قمر میں جو فطمسنا اعینھم ہے ا

س کا کیا مطلب ہے

امر اول کی نسبت علمائے مفسرین کا یہ خیال ہے کہ وہ رسول جن کو انہوں نے فرشتے قرار دیا ہے نہایت خوب صورت مرد بن کر آئے تھے اور جب وہ حضرت لوط کے گھر میں آئے تو ان کی بیوی نے لوگوں سے جا کر کہہ دیا کہ ہمارے گھر میں ایسے خوبصورت لوگ آئے ہیں کہ ان سے زیادہ خوبصورت دیکھنے میں نہیں آئے ان سے زیادہ اچھے کپڑے پہیے کوئی نہیں ہے اور نہ زیادہ خوش بو والا ہے یہ سن کر لوط کی قوم ان پر دوڑ پڑی اور خدا کے اس کلام سے کہ وہ بدکاری کیا کرتے تھے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا دوڑ پڑنا بدکاری کر لیے تھا۔

مگر میرے نزدیک یہ تفسیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس کی تفسیر کی بنیاد کسی معتبر روایت پر ہے بلکہ صرف یہودی روایت پر مبنی ہے خدا کے اس کلام پر کہ

ومن قبل یعملون السیات

وہی ایک عمل خاص مراد لینا بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ لوگ بہت سے اور بھی گناہ کرتے تھے لوٹ مار کرتے تھے اپنی مجلسوں میں خراب کام کرتے تھے جیسا کہ سورہ عنکبوت میں بیان ہوا ہے پس

" ومن قبل یعملون السیات"

کے عام معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ حضرت لوط کا گھر گھیر لینا اور شورہ پشتی کرنا ان کے لیے کوئی عجیب بات نہیں تھی کیوں کہ وہ پہلے ہی شریر و بد ذات و برے کام کرنے والے تھے۔

اس باب میں ہم کو قیاسات وظنیات پر گھر گھیر لینے کا سبب بیان کرنا ضرور نہیں ہے کیوں کہ خود قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود ہے سورۂ الحجر میں خدا نے فرمایا ہے کہ جب اس شہر کے لوگ خوشی خوشی دوڑے آئے تو لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں ان کو فضیحت

مت کرو تو شہر کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا تھا دنیا کے لوگوں سے 1۔

جس زمانہ میں حضرت لوط سدوم میں جا کر رہے ہیں اس زمانہ میں طوائف الملو کی تھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا حاکم یا بادشاہ جدا جدا تھا سدوم کی بھی ایک چھوٹی سی سلطنت جدا تھی۔صاف صاف قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت لوط وہاں جا کر رہے تو وہاں کے لوگوں نے منع کر دیا تھا کہ تم اور لوگوں سے راہ ورسم وآمیزش نہ رکھنا پس جب کہ یہ اجنبی شخص حضرت لوط کے گھر میں آئے ان لوگوں نے آ کر گھیر لیا کہ یہ اجنبی شخص کون ہیں اوران کو گرفتار کر لینا چاہا حضرت لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں ان کو مت پکڑو مفسرین کی عادت یہودیوں کی تقلید کرنے کی ہوگئی ہے۔انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ

اولم ننھک عن العالمین

پر خیال نہیں کیا اور جو کچھ یہودیوں کی روایتوں میں تھا اسی کو قرآن مجید کی تفسیر میں لکھ دیا۔

دوسرے امر کو بھی مفسرین نے اپنے خیال کے موید سمجھا ہے۔وہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت لوط نے کہا کہ جس بدخیال سے تم میرے مہمانوں کو لینا چاہتے ہو ان کے بدلے میں میری بیٹیاں لے لو اور جو کرنا چاہتے ہو ان کے ساتھ کرو پھر مفسرین

1۔ **وجاء اهل المدینة یستبشرون قال ان هولاء ضیفی فلا تفضحون واتقوالله لا تخزون قالوا اولم ننهک عن العالمین (سورة الحجر)**

کو اس تفسیر کے قرار دینے کے بعد مشکل پیش آئی،بعضوں نے کہا کہ بناتی سے مراد حضرت لوط کی اصلی بیٹیاں ہیں اس پر یہ مشکل پیش ہوئی کہ وہ کیوں کر ان کو ایسا کام کرنے کیلئے دیتے تھے اس پر یہ قرار دیا کہ مطلب یہ تھا کہ بعد نکاح کے ان کے ساتھ جو چاہو کرو۔

بعضوں نے کہا کہ بناتی سے لوط کی امت کی بیٹیاں مراد ہیں کیوں کہ پیغمبر بمنزلہ باپ کے ہےاوراس کی امت کی عورتیں بمنزلہ اس کی بیٹیوں کے ہیں۔

مگر یہ تفسیر محض غلط ہے جس کی بنا توریت کی متزلزل روایتوں پر مبنی ہے حالاں کہ خود توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غلطی ہے غالبًا یہ بات صحیح ہے کہ حضرت لوط کی دو بیٹیاں تھیں توریت میں بھی مذکور ہے کہ حضرت لوط نے ان لوگوں سے جنہوں نے گھر گھیر لیا تھا یہ کہا کہ حال اینک مرا دو دختر یست کہ مردے را ندانستہ اند تمنا اینکہ ایشاں را بہ شما بیروں آورم و با ایشاں آنچہ درنظر شما پسند است بکنید (کتاب پیدائش باب 19 ورس 8)

حالاں توریت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط کی بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے شوہر موجود تھے چناں چہ توریت میں اسی قصہ کے بیان میں لکھا ہے کہ پس لوط بیروں رفتہ و بہ دامادھائش کہ دختر انش را بنکاح آوردہ بودند متکلم شدہ گفت (کتاب پیدائش باب 19 ورس 14) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن عورتوں کو حضرت لوط نے بیٹیاں کہا وہ ان کی اصلی بیٹیاں نہ تھیں۔

بنث اور بنوث عبری زبان میں عام عورتوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ کتاب امثال سلیمان باب 31 ورس 29 میں استعمال ہوا ہے پس توریت میں جو لفظ بنوث اور قرآن مجید میں لفظ بناتی آیا ہے اس سے ایسی عورتیں مراد ہیں جو حضرت لوط کے ہاں کسی تعلق سے موجود تھیں اور کیا عجب ہے کہ لونڈیاں ہوں کیوں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط جب مصر سے واپس آئے ہیں تو متمول اور مالک مویشی و صاحب لونڈی و غلام کے تھے۔

اس بات کی تردید کہ حضرت لوط نے ان لوگوں سے جنہوں نے ان کا گھر گھیر لیا تھا یہ کہا تھا کہ جس بدخیال سے تم میرے مہمانوں کو پکڑنا چہاتے ہو اس کے بدلے میری بیٹیاں لے لو اور ان کے ساتھ جو چاہو سو کرو خود قرآن مجید سے ثابت ہوتی ہے۔

اول یہ کہ قرآن سے پایا جاتا ہے کہ قوم لوط عورتوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی بدفعلی کرتی تھی جیسے کہ مردوں کے ساتھ کرتی تھی قرآن مجید میں آیا ہے کہ وہ لوگ مردوں کے پاس یعنی لونڈوں کے پاس جاتے تھے اور جوروؤں میں بھی جو طریقہ کہ ان کے لیے خدا نے پیدا کیا ہے اس کو بھی چھوڑ دیا تھا[1] خلاف فطرت انسانی اپنی جوروؤں کے ساتھ بھی بدفعلی کرتے تھے پس کیا حضرت لوط ان عورتوں کو خواہ وہ ان کی بیٹیاں ہوں یا اور کوئی اس لیے ان کو حوالے کرتے تھے کہ جس طرح وہ مردوں کے ساتھ بدفعلی کرتے ہیں اس کے بدلے ان کے ساتھ بدفعلی کریں

نعوذ باللہ حاشا و کلا

دوسرے یہ کہ جب حضرت لوط نے کہا کہ یہ میری اچھی بیٹیاں تمہارے لیے ہیں ان کو ماخوذ کرلو اور میرے مہمانوں کو ذلیل مت کرو تو ان لوگوں نے کہا کہ تو واقف ہے کہ ہم کو تیری بیٹیوں میں یعنی ان کے گرفتار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور تو جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں[1] یعنی ان اجنبی آدمیوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں یہ کہنا کہ ہم کو تیری بیٹیوں میں حق نہیں ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان لوگوں میں حق ہے یعنی ان کے گرفتار کرنے کا حق ہے پس اگر وہ حق ان کے ساتھ بدکاری کا سمجھا جاوے تو کیسی غلطی ہے بلکہ وہ حق صرف یہ تھا کہ جو اجنبی لوگ ان کے شہر میں آکر حضرت لوط کے گھر میں چھپے تھے ان کو گرفتار کرلیں پس قرآن مجید سے جو امر ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت لوط ان عورتوں کو بطور اول یا ضمانت کے ان لوگوں کو حوالہ کرنا چاہتے تھے اور یہ درخواست کرتے تھے کہ ان کے مہمانوں کو گرفتار کرکے ذلیل نہ کریں۔

1ہ اتاتون الذکران من العالمین وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عادون (سورۂ شعرا)

اس بیان پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر صرف بطور اول یعنی بطور ضمانت عورتوں کو سپرد کرنا منظور تھا تو

" ھن اطھر لکم"

یعنی وہ پاکیزہ تر ہیں تمہارے لیے کیوں فرمایا

مگر یہ فرمانا اس بدخیال کا جو مفسرین نے قرار دیا ہے مثبت نہیں ہوسکتا اور نہ اس مدعا کے برخلاف ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

اول سورہ الحجر میں ھن اطہر لکم کے الفاظ نہیں ہیں اس میں صرف یہ لفظ ہیں کہ

ھو لاء بناتی ان کنتم فاعلین

دوسرے یہ کہ

ھن اطھر لکم

کے ہونے سے سورہ

1۔ **لقد علمت مالنا فی بناتک من حق و انک تعلم و نرید (سورۂ ھود)**

الحجر کی آیت کے مطلب پر کچھ زیادتی اور سورہ الحجر کی آیت میں ان لفظوں کے نہ ہونے سے سورہ ھود کی آیت کے مطلب سے کچھ کمی لازم نہیں ہوتی۔ ھن اطہر کی دو قرائتیں ہیں مشہور قرأت میں اطہر کی رے کا پیش ہے اور دوسری قرأت میں اطہر کی رے کا زبر ہے یعنی نصب ہے جن لوگوں نے رے کا زبر پڑھا ہے وہ اس کو حال قرار دیتے ہیں اور از روئے قواعد نحوی کے اس کی دو ترکیبیں قرار دیتے ہیں ایک صورت میں لفظ ھن حال اور ذوالحال میں فصل واقع ہوتا ہے اور اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور دوسری صورت میں ھن فصل واقع نہیں ہوتا اور اس پر کوئی اعتراض نحوی بھی وارد نہیں ہوتا صرف اتنی بات ہے کہ "اطہر" کی

رے کو منصوب پڑھنا مشہور قرأت کے برخلاف ہے چناں چہ اس کی بحث تفسیر کبیر و تفسیر کشاف میں مندرج ہے ہم دونوں تفسیروں کی عبارت نقل کرتے ہیں جس دوسری ترکیب نحوی کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ تفسیر کشاف میں مذکور ہے۔

تفسیر کبیر کی عبارت حاشیہ پر ثبت ہے اس میں لکھا ہے کہ عبدالملک بن مروان اور حسن اور عیسیٰ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے

"ھن اطھر لکم"

فتح کے ساتھ پڑھا ہے حال کی بناء پر جیسا کہ ہم نے خدا کے اس قول میں ذکر کیا ہے

"وھذا العلی شیخا"

مگر یہ کہ اکثر نحویوں نے اس بات پر اتفا کیا ہے کہ یہ غلطی ہے اور کہا ہے کہ اگر ھولاء نباتی ھن اطھر فتحہ کے ساتھ پڑھا جاوے تو خدا کے اس قول کے مشابہ ہوگا

"وھذا العلی شیخا"

مگر یہ کہ ھن کا لفظ بیچ میں آ گیا ہے اور یہ امر اس بات کو روکتا ہے کہ اطھر کو فتح سے پڑھا جاوے اس بحث کو لوگوں نے بہت بڑھایا ہے۔[1]

تفسیر کشاف کی عبارت حاشیہ پر ثبت ہے[2] اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن مروان نے ھن اطھر لکم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے سیبویہ نے اس کو ضعیف لکھا ہے اور کہا ہے کہ ابن مروان اپنی غلطی میں جکڑ گیا اور عمرو بن علاء ہے کہ جس شخص نے ھن اطھر کو فتحہ کے ساتھ پڑھا وہ اپنی غلطی میں چارزانو ہو کر بیٹھا اور یہ اس لیے کہ اس کا فتحہ پڑھنا اس بناء پر ہوگا کہ حال قرار دیا جائے اور اس کا عامل معنی فعلیہ ہو جو ھولاء میں موجود ہے جیسے کہ خدا کے اس قول میں

---

1 روی عن عبدالملک بن مروان و الحسن و عیسیٰ بن عمر انھم

قـروا هـن اطهـر لـكم بالنصب على الحال كما ذكرنا فى قوله تعالىٰ وهذا بعلى شيخا اكثر النحويين اتفقوا انه خطاء قالوا لوقر هولاء بناتى هن اطهر (بـالـفتح) كان هذا نظير قوله و هذا بعلى شيخا الا ان كلمة هن قد وقعت فـى البيـن وذالـک يمنع من جعل اطهر (بالفتح) حالا و طو لوا فيه (تفسير كبير)

2ـہ قـرأايـن مـروان هـن اطهـر لـكـم بالنصب وضعفه سيبويه و قال احتبىٰ ابـن مـروان فـى لـحـنـه وعـن ابى عمرو بن العلاء من قراهن اطهر (بـالـفتـح) فـقد تربع فى لحنه وذالـک لان انتصابه على ان يجعل حالا قد عـمـل فيهـا مـا فـى هولاء من معنى الفعل كقوله هذا بعلى شيخا او ينصب هـولاء بـفـصـل مـضـمـر كـانـه قبـل كذوا هولاء و بناتى بدل و يعمل هذا الـمضمرفى الحال و هن فصل و هذا لا يجوز لان الفصل مختص بالوقوع بيـن جـزى الـجـمـلة ولا يقع يين الحال و ذى الحال وقد خرج له وجه لا يـكـون هن فيه فصلا وذالـک ان يكون هولاء مبتداء و بناتى هن جملة فى مـوضـع جـنـرا الـمبتداء كقولـک هذا اخى هو ويكون اطهر حالا (تفسير كشاف)

هذا العلى شيخ

یا یہ کہ ھولاء کوفتحہ دیا جاوے۔فعل مضمر سے گو یا یوں کہا گیا ہے

خذوا هو لاء

اور بناتی بدل ہو اور یہ مضمر حال میں عمل کرے ھن بیچ میں فصل واقع ہوا ہے لیکن یہ جائز نہیں کیوں کہ فصل صرف جملہ کی دو خبروں میں واقع ہوتا ہے حال ذوالحال میں فصل نہیں

واقع ہوتا ہے مگر اس کی ایک اور وجہ نکالی گئی ہے جس میں ھن کو فصل ماننا نہیں پڑھا وہ یہ کہ ھولاء مبتدا ہوا اور بناتی ھن پورا جملہ موضع خبر میں ہے جیسے کہ تیرا قول ھذا اخی ھو اور اطہر حال قرار دیا جاوے (تفسیر کشاف)

غرض کہ اس میں کچھ کلام نہیں ہے کہ چند علمائے مفسرین ونحویین نے ھن اطہر کو حال قرار دیا ہے میں بھی اس کا حال ہونا تسلیم کرتا ہوں اور ہمیشہ قرأت مشہورہ کا اختیار کرنا پسند کرتا ہوں اس لیے اطہر کو مضموم پڑھتا ہوں اور بایں ہمہ حال ذوالحال قرار دیتا ہوں۔

جملہ حالیہ پر سے واو حالیہ کا حذف کر دینا جائز ہے پس تقدیر کلام کی یہ ہے کہ

ھو لاء بناتی و ھن اطھر لکم

یعنی یہ میری بیٹیاں ہیں (اور) وہ پاکیزہ ہیں تمہارے لیے مبتداء وخبر کے درمیان میں جملہ معترضہ حالیہ واقع ہوا ہے اور یہ جائز ہے پوری ترتیب یوں ہے

" ھو لاء بناتی لکم وھن اطھر"

الفیہ ابن مالک میں لکھا ہے کہ جملہ حالیہ جب کہ فعل مضارع مثبت نہ ہو تو آتا ہے صرف واو کے ساتھ یا صرف ضمیر کے ساتھ یا دونوں کے اور اس کا شعر یہ ہے۔

وجملتہ الحال سوے ما قدما
بواو او بمضمر او بھما

اور غایت التحقیق شرح کافیہ میں اس کی یہ مثال دی ہے۔

کلمته فوه الی فی تقدیر

کلام کی یہ ہے کلمتہ وفوہ الی فی مگر واؤ کو محذوف کر دیا ہے۔

پس جب کہ حضرت لوط ان عورتوں کو بطور اول یعنی ضمانت کے ان لوگوں کو سپرد کرنا چاہتے تھے تو ان کی عظمت ظاہر کرنے کو انہوں نے کہا کہ ھن اطہر نہ اس مقصد سے جس کا

خیال مفسروں نے یہودیوں کی روایتوں کی تقلید سے کیا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد ایسے قصے بیان ہوئے ہیں جو توریت میں بھی مذکور ہیں مگر ان قصوں کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا ہے جس سے وہ غلطیاں جو توریت میں ان قصوں کی نسبت ہیں دور ہو جاتی ہیں پس ان قصوں کی تفسیر میں ہر جگہ توریت کی اور یہودیوں کی روایتوں کی تقلید کرنا صریح غلطی ہے بلکہ سب سے مقدم قرآن مجید کے لفظوں پر غور کرنا چاہیے کہ ان سے کیا مطلب حاصل ہوتا ہے اگر وہی مطلب حاصل ہو جو توریت میں ہے تو توریت یا یہودیوں کی روایت کو اس کی تفسیر میں بیان کرنا کچھ مضائقہ نہیں ہے مگر قرآن مجید کے الفاظ کو خواہ مخواہ توریت یا یہودیوں کی روایتوں کے مطابق پھیر پھار کر لانا صریح غلطی ہے۔

تیسرا امر جو عذاب نازل ہونے سے متعلق ہے قدرتی قانون پر مبنی ہے اور جس طرح خدا تعالیٰ ان تمام واقعات کو جو قانون قدرت کے مطابق ہوتے ہیں انسانوں کے گناہوں کی طرف نسبت کیا کرتا ہے اور جس کی وجہ سے ہم اپنی تفسیر میں بتا چکے ہیں اسی طرح اس قدرتی واقع کو بھی سدوم کے لوگوں کے گناھوں سے منسوب کیا ہے۔

مفسرین نے جو لغو و بے ھودہ باتیں اپنی تفسیروں میں لکھی ہیں کہ حضرت جبرئیل اس قطعہ زمین کو اپنے پروں پر اٹھا کر آسمان تک لے گئے اور پہلے آسمان کے اس قدر قریب پہنچے کہ آسمان کے فرشتوں نے کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کے اذان دینے کی آواز سنی یہ محض غلط اور موضوع کہانیاں ہیں جن کی مذہب اسلام میں کچھ بھی اصلیت نہیں ہے۔

سدوم اور عموراہ وادماوزبوئیم یہ چار شہر اور بقول استربیو کے چار یہ اور نو اور کل تیرہ شہر اس مقام پر واقع تھے جہاں اب ڈوسی بمعنی سمندر مردہ جس کو عربی جغرافیہ دان بحر لوط کہتے ہیں واقع ہے تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بحر لوط کے گرد جو ملک کی حالت ہے اس

سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ آتش خیز پہاڑوں کے لاوہ کے نشان اب بھی پائے جاتے ہیں اور اب بھی زلزلے کثرت سے آتے ہیں۔

علاوہ اس کے سدوم کی گھاٹی میں نفطہ کی کان تھی اور جا بجا نفطہ کے بہت بڑے بڑے غار تھے اور اسی وجہ سے اس شہر کا نام سدوم رکھا گیا تھا (توریت کتاب پیدائش باب 14 ورس 10) میں لکھا ہے کہ ''سدوم از چاہ ھائے گل چرپ پر بود'' گل چرب جس کو لکھا ہے وھی نفطہ کا مادہ ہے جو پانی پر آجاتا تھا اور مٹی میں بھی ملا ہوا ہوتا تھا اور یہ آتش گیر مادہ ہے جس میں حرارت سے دھواں اٹھتا ہے اور کبھی کبھی زیادہ حرارت سے بھڑک جاتا ہے۔

جغرافیہ کے محققوں نے لکھا ہے کہ ''اکثر اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ ڈوسی یعنی بحرلوط سے دھوئیں کے بادل کے بادل اٹھتے ہیں اور اس کے کنارہ پر نئے سوراخ پائے جاتے ہیں آج تک بحرلوط میں ایک قسم کا مادہ جس کو انگریزی میں اسفالنس کہتے ہیں اور نفطہ کی ایک قسم ہے پانی کے اوپر آجاتا ہے۔''

غرض کہ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں سدوم وعموراہ وغیرہ شہر آباد تھے وہاں آتشیں پہاڑ تھے اور نفطہ یا گندھک کی کانیں کثرت سے تھیں آتشیں پہاڑ کے پھٹنے اور نفطہ یا گندھک کے مادہ میں آگ لگ جانے سے وہ تمام شہر غارت ہوئے اور زمین کی وہ موٹی تہ جو نفطہ کے مادہ سے بنی ہوئی تھی پھٹ گئی اور جل گئی اور تمام قطہ زمین کا دھنس گیا اور پانی جو اس تہ کے نیچے تھا اوپر آگیا اور ایک بہت بڑی جھیل پیدا ہوگئی جو اب ڈوسی یا بحرلوط کے نام سے مشہور ہے اور دنیا میں عجائبات سے ہے۔

قرآن مجید سے اس حادثہ کا واقع ہونا اس طرح پر معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس شام کو جب کہ قوم لوط نے جا کر حضرت لوط کا گھر گھیرا وہ آتش خیز پہاڑ اور نفطہ یا گندھک کی کانیں جلنی شروع ہوئیں اور کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ ان کا دھواں تمام شہر میں گھٹ گیا ہوگا اور قوم لوط

جو حضرت لوط کا گھر گھیرے ہوئے تھی شہر میں دھواں گھٹ جانے کے سبب کامیاب نہ ہو سکی اندھیرے کے سبب ان کو کچھ نہ دکھلائی دیتا ہو گا اور دھوئیں کے سبب ان کی آنکھیں بے کار ہو گئی ہوں گی جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورہ قمر میں فرمایا ہے کہ بے شک انہوں نے دند مچائی لوط کے مہمانوں سے پھر بے کار کر دیں ہم نے ان کی آنکھیں

" ولقد روادوہ لاعن ضیفه فطمسنا اعینهم"

مفسرین نے فطمسنا اعینھم کے معنی لکھے ہیں کہ اندھا کر دیا اور یہ امر قرار دیا ہے کہ ان فرشتوں نے جو حضرت لوط کے ہاں آئے ہوئے تھے بطور اعجاز کے ان کو اندھا کر دیا اور ان کو حضرت لوط کے مکان کا دروازہ جس کو وہ توڑ کر اندر جانا چاہتے تھے نہیں ملا۔

لیکن جو روایت کہ انہوں نے بیان کی ہے اس کی کوئی معتبر سند نہیں ہے اور نہ اعجاز کی کچھ حاجت ہے جب کہ آتشیں پہاڑوں کا اور زمین کی گندھک و نفطہ میں آتش پیدا ہوئی اس کے دھوئیں کے گھٹ جانے سے ان کی آنکھیں بے کار ہو گئیں اور دکھائی دینے سے رہ گیا اسی کی نسبت خدا نے فرمایا کہ **فطمسنا اعینهم**

یہ حال دیکھ کر ان تینوں شخصوں نے جو حضرت لوط کے ہاں آئے ہوئے تھے سمجھا کہ آتش فشانی زیادہ ہونے والی ہے اور حضرت لوط کو صلاح دی کہ یہاں سے بھاگ چلو چناں چہ سورہ ھود میں آیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا اے لوط ہم تیرے خدا کے بھیجے ہیں سو تو اپنے اھل کو لے کر رات کے حصہ میں نکل جا اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی کہ اس کو بھی وہی پہنچنے والا ہے جو اوروں کو پہنچا ہے بے شبہ ان کا وعدہ صبح کا وقت ہے کیا صبح قریب نہیں 1۔

اور سورۂ حجر میں یہ ہے کہ اپنے اھل کو لے نکل جا اور ان کے پیچھے چلا جا اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم دیا جاتا ہے ہم نے اس کی طرف یہ طے کر دیا

کہ ان کا پیچھا صبح کے وقت کٹ جائے گا2؎

ولا یلتفت منکم احد

یعنی کوئی مڑ کر نہ دیکھے اس سے غرض وہاں سے جلد چلے جانے کی تاکید ہے جیسے کہ خدا نے

1؎ **قالو یالوط انا رسل ربک من یصلوا الیک فاسر باھلک یقطع من الیل ولا یلتفت منکم احد الا امراتک انہ مصیبھا ما اصابھم ان موعدھم الصبح الیس الصبح بقریب (سورۂ ھود)**

2؎ **فاسر باھلک بقطع من اللیل واتبع ادبارھم ولا یلتفت منکم احد و امضوا حیث تومرون و قضینا الیہ ذالک الامران دابر ھولاء مقطوع مصبحین (سورۂ حجر)**

حضرت آدم کی نسبت کہا تھا

ولا تقربا ھذہ الشجرۃ

یعنی پاس نہ جانا اس درخت کے مگر حضرت لوط کی بیوی جو ایمان والوں میں نہ تھی اس نے اس نصیحت کو نہیں مانا اور اس عذاب میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کے ساتھ مرگئی۔

جن لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت لوط کی بیوی بھی ساتھ بھاگی تھی مگر اس نے بھاگتے میں جو مڑ کر دیکھا تو نمک کی ہوگئی یا مڑ کر دیکھنے کے سبب مرگئی اس کی کچھ اصل نہیں ہے اور نہ قرآن مجید سے یہ بات پائی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

حضرت ابراہیم اور کعبہ کی تعمیر

کعبہ درحقیقت نماز پڑھنے کی جگہ یعنی مسجد ہے جس کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا خود خدانے اس کومسجد کہا ہے جہاں فرمایا ہے

" ان المشر کین نجس فلا یقربو المسجد الحرام"

اور جہاں فرمایا ہے

" لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللہ"

ابراہیم اوراس کی تمام اولاد ایسے مقام کو بیت اللہ کہا کرتے تھے اوراس لیے کعبہ کو بھی بیت اللہ کہتے ہیں۔

انسان کی ایک جبلی عادت ہے کہ ایک ایسے وجود کے لیے جو نہ دکھائی دیتا ہے، نہ چھوا جاتا ہے اور نہ سمجھ میں آتا ہے اور یہ جزاس کے کہ ہے، اور کوئی خیال اس کی نسبت قائم نہیں ہوسکتا۔ کوئی نہ کوئی محسوس نشان قائم کر لیتا ہے اوراس محسوس نشان کے ذریعہ سے اپنا عجز اور نیاز اس غیر محسوس اور بیچون وبچگوں ذات کے سامنے ادا کرتا ہے قدیم زمانہ کے لوگوں کو بالطبع ایسے نشان کے قائم کرنے کی زیادہ تر رغبت ہوتی تھی اور یہی بات ہے کہ جس کے سبب سے ہم قدیم سے قدیم قوموں کا اور وحشی سے وحشی لوگوں کا جب حال تحقیق کرتے ہیں تو ان میں بت پرستی کے یعنی ایک شئے محسوس کے پوجنے کے آثار پائے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال حضرت ابراہیم بھی خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے

تھے اور یہ رسم حضرت موسیٰ کے وقت تک قائم تھی اس فعل میں جو انبیاء نے کیا اور اس فعل میں جو بت پرست کرتے تھے فرق یہ ہے کہ بت پرست غیر خدا کے نام محسوس شے قائم کر کے پرستش کرتے تھے اور اس لیے وہ خدا کی پرستش نہ تھی بلکہ اس غیر خدا کی پرستش تھی جس کے نام سے وہ محسوس شے قائم تھی۔ انبیاء نے جو محسوس شے قائم کی وہ خدا ہی کے نام پر قائم کی اور خدا ہی کی پرستش کی، نہ کسی غیر خدا کی مگر مبارک ہو اس کو (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) جس نے ان تمام نشانیوں کو مٹا دیا اور اس بے نشان کی عبادت کو بغیر کسی نشان کے قائم کیا اور بحر و بر اور پہاڑ اور گھر اور مسجد سب یکساں خدا کی عبادت ہونا سکھا دیا کوئی سمت خدا کی عبادت کے لیے مخصوص نہیں کی۔ یہ سمجھنا کہ کعبہ سمت خدا کی عبادت کے لئے مخصوص ہے، محض غلطی ہے اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف وہ سمت عبادت کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک تمیز اور تفرقہ کے لئے مخصوص ہے، جس کو ہم آگے بیان کریں گے

کتاب پیدائش باب 12 ورس 7 میں ہے کہ ''تب خداوند نے ابراہیم کو دکھلائی دے کر کہا یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا اور اسی باب کی آٹھویں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر وہاں سے حضرت ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جا کر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے یعنی خدا کے گھر کے نام سے اس کو موسوم کیا۔''

اسی کتاب کے تیرھویں باب کی اٹھارویں آیت میں ہے کہ بلوطستان ممری میں ابراہیم جا رہا تھا اور وہاں خداوند کے لیے ایک مذبح بنایا۔

ان تینوں آیتوں سے ثابت ہے کہ خدا کے لیے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اس کو پکارنا اور وہاں خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا۔

یہ طریقہ ان کی اولاد میں بھی جاری تھا۔ چناں چہ کتاب پیدائش

باب 26 ورس 25 میں لکھا ہے کہ ''بیر شبع میں اسحاق پسر ابراہیم کو خدا دکھائی دیا اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اس کو موسوم کیا۔''

اب ہم کو یہ بتانا رہا کہ یہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا اس کی تفصیل بھی توریت مقدس میں موجود ہے۔

کتاب خروج باب 20 ورس 25 میں لکھا ہے کہ ''اگر تو میرے لیے پتھر کا مذبح بنا دے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائیو کیوں کہ اگر تو اسے اوزار لگاوے گا تو اسے ناپاک کرے گا۔''

اور اسی کتاب کے باب 24 ورس 4 میں لکھا ہے کہ ''اور موسیٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کے بارہ سبطوں کے عدد کے موافق بارہ ستون بنائے گئے۔''

اور کتاب پیدائش باب 28 ورس 18,19,22 میں لکھا ہے کہ یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا لے کے ستون کی مانند کھڑا کےا اور اس کے سر پر تیل ڈالا اور اس کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا اور کہا کہ یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہوگا۔

جب کہ حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بیوی حاجرہ کو مع حضرت اسماعیل اپنے بیٹے کے جو حاجرہ بیوی کے پیٹ سے تھے نکال دیا اور وہ اس کوہستان ملکہ میں آ کر ٹھہرے تو حضرت ابراہیم نے ان کی عبادت کے لیے اسی طرح جیسا کہ وہ کیا کرتے تھے ایک پتھر کھڑا کر کے مذبح بنایا ہوگا جواب ہم مسلمانوں میں حجر اسود اور یمین الرحمان کے نام سے مشہور ہے اس حجر اسود کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے کیوں کہ وہ ایک جز و کعبہ کا ہو گیا تھا مگر وہ ایسی شے ہے جواب تک موجود ہے جہاں اس طرح پر مذبح

بنایا جاتا تھا وہاں کوئی عمارت بنا دینے کا بھی دستور تھا جس کا اشارہ توریت کی ان آیتوں سے بھی پایا جاتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں پس بعد اس مذبح بنانے کے حضرت ابراہیم نے وہاں کعبہ بنایا جو اب بیت اللہ کہلاتا ہے اور اسی کے ایک کونے میں پتھر لگا دیا اس آیت میں اسی تعمیر کا ذکر ہے۔

اگرچہ ڈایوڈورس یونانی مورخ کی تاریخ میں کعبہ کا ذکر ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے مگر بعض ناسمجھ آدمی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ توریت میں کہیں اس مقام پر حضرت ابراہیم کے مذبح بنانے یا کعبہ کی تعمیر کرنے کا ذکر نہیں ہے مگر ان کا یہ اعتراض محض لغو اور بے بنیاد ہے توریت میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو مذکور نہیں حالاں کہ اس ان کا تاریخی ثبوت موجود ہے اور توریت میں ذکر نہ ہونے سے اس کا عدم وقوع لازم نہیں آتا اصل یہ ہے کہ توریت اور جو کتابیں اس سے متعلق ہیں وہ خاص بنی اسرائیل کے حالات میں لکھی گئی ہیں اس لیے ان میں بنی اسماعیل کا وہاں تک کا ذکر ہے جہاں تک کہ بنی اسماعیل اور اسرائیل کے مشترک حالات رہے ہیں اور جہاں سے بنی اسماعیل کے حالات علیحدہ ہو گئے ہیں وہاں سے بنی اسماعیل کا ذکر ان کتابوں میں نہیں ہے اللہ ماشاء اللہ کہیں کہیں کسی سبب اور کسی تعلق سے آ جاتا ہے۔ مکہ میں بنی اسماعیل کے لیے حضرت ابراہیم کا مذبح یا کعبہ بنانا بنی اسرائیل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا اور ان کتابوں میں اس کا ذکر نہ ہونے کی یہ کافی وجہ ہے مگر ہر زمانہ کے عرب کی متواتر روایتوں سے جن سے کسی امر کے ثبوت میں کچھ شبہ نہیں رہتا اور نیز غیر قوموں کی کتابوں سے اور نیز قدیم جغرافیہ سے اور خود مکہ کے گرد کی قدیم ویران بستیوں سے جو حضرت اسماعیل کے بیٹوں کے نام پر آباد ہوئی تھیں، کچھ شبہ نہیں رہتا۔

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ بنایا تو صرف اس کی دیواریں بنائی تھیں چھت اس پر

نہیں تھی بنی جرھم کے زمانے میں پہاڑی نالہ کے سبب سے حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا کعبہ ڈھے گیا تب بنی جرھم نے اس کو تعمیر کیا پھر وہ عمالیق کے زمانہ میں جو ایک قبیلہ بنی حمیر کا تھا ڈھے گا تب عمالیق نے اس کو بنایا، پھر اس میں کچھ نقصان آ گیا تو قصی نے اس کو تعمیر کیا پھر آگ لگنے کے سبب کعبہ جل گیا اور قریش نے اس کو تعمیر کیا اس زمانے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو چکے تھے اور آپ کی عمر تخمیناً بارہ چودہ برس کی تھی یزید کے زمانہ میں جب کعبہ پر فوج کشی ہوئی تو پھر کعبہ جل گیا اور عبداللہ بن زبیر نے اس کو تعمیر کیا مگر حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے وقت میں عبداللہ بن زبیر کی عمارت کو ڈھا ڈالا اور از سر نو اس کو اسی طرح پر بنا دیا جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھا اور اب جو عمارت موجود ہے وہ حجاج بن یوسف کی بنائی ہوئی ہے مگر اس کے گرد کی جو عمارتیں ہیں اور جو عمارات حرم کعبہ کہلاتی ہیں ان کو بہت سے بادشاہوں نے بنایا ہے اور وہ نہایت عالیشان عمارتیں ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

حضرت ابراہیم اور مشرکوں کے لئے دعائے مغفرت

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی دعائے مغفرت کا چار جگہ ذکر ہے:

(1) ایک سورہ ابراہیم میں جہاں حضرت ابراہیم نے مکہ کے لیے اور حضرت اسماعیل و حضرت اسحاق کے لیے برکت کی دعا مانگی ہے اسی دعا کے ساتھ یہ بھی دعا کی ہے کہ

" ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب"

یعنی اے ہمارے پروردگار بخش دے مجھ کو اور میرے والد اور والدہ کو اور سب ایمان والوں کو جس دن کہ قائم ہو حساب

(2) دوسرا مقام سورہ مریم میں ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے چچا آذر کو باپ کہہ کر بت پرستی چھوڑنے اور خدا پر ایمان لانے کی نصیحت کی ہے، مگر ان کے چچا نے نہ مانا اور خفا ہو کر کہا اگر تو بس نہیں کرتا تو میں تجھ کو سنگ سار کروں گا اور تو میرے پاس سے چلا جا اس وقت حضرت ابراہیم نے کہا

" سلام علیک فاستغفر لک ربی"

چناں چہ اس کے بعد حضرت ابراہیم اور کلدانیاں سے جو ان کا وطن تھا جلا وطن ہو گئے ۔ یہ وہ آیت ہے جس میں حضرت ابراہیم نے اپنے چچا آذر کے حق میں دعائے مغفرت

کا وعدہ کیا تھا۔

(3) تیسرا مقام سورہ شعرا میں ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے چچا کو باپ کہہ کر اور نیز اس کو گمراہ قرار دے کر اس کے لیے دعائے مغفرت کی اور کہا

" واغفر لا بی انه کان من الضالین"

(4) چوتھا مقام سورہ ممتحنہ میں ہے جہاں خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی بت پرستی کے متعلق دعائے مغفرت کی پیروی نہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ

" الا قول ابراهیم لابیه لا ستغفرن لک وما املک لک من الله من شئی"

یعنی حضرت ابراہیم کے اس قول کی پیروی نہیں چاہیے جو انہوں نے اپنے چچا سے ان کی مغفرت کی دعا کی نسبت کہا تھا اور اسی وعدہ کے مطابق انہوں نے دعا بھی کی تھی۔

سورہ ممتحنہ کی آیت سے بطور دلالت النص ظاہر ہوتا ہے کہ مشرک کے لیے دعائے مغفرت کرنی نہیں چاہیے اور سورہ توبہ کی آیت میں بہ نص صریح بیان ہوا ہے کہ مشرکین کے لیے گو وہ کیسے ہی قریب کے قرابت مند ہوں دعائے مغفرت نہ کی جاوے۔ چناں چہ فرمایا

ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین ولو کان اولی قربی من بعد ماتبین لهم انهم اصحاب الجحیم

یعنی نبی کو اور مومنین کو واجب نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا مانگیں چاہے وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں بعد اس کے کہ ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اہل دوزخ ہیں۔

حضرت ابراہیم نے اپنے چچا کے لیے اس لیے دعائے مغفرت کی تھی کہ ان کو اپنے چچا کے ایمان لانے کی توقع تھی مگر جب ان کو یقین ہو گیا کہ وہ ایمان نہیں لانے کا تو انہوں

نے اس سے اپنی بیزاری ظاہر کی جیسے کہ اسی آیت میں بیان ہوا ہے کہ

" فلما تبین له انه عدوا الله تبرا منه ان ابراهیم لا واه حلیم"

بعض مخالفین اسلام نے ان آیتوں سے اسلام پر بے رحمی کا الزام لگایا ہے کہ اسلام نے نہایت بے رحمی سے مشرک والدین کے لیے بھی دعائے مغفرت کی ممانعت کی ہے مگر یہ ان کی غلطی ہے اس لیے کہ اسلام نے جس قدر والدین کے ابد کی گو وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں اور مشرکوں کے ساتھ بھی صلہ رحم کی تاکید فرمائی ہے جس کی بنا محض رحم اور انسانیت پر ہے شاید اور کسی مذہب میں نہیں ہے مگر مغفرت یا عدم مغفرت کو رحم یا عدم رحم سے کچھ تعلق نہیں ہے اس لیے کہ مغفرت کا مدار صرف ایمان پر ہے کہ اگر کوئی بیٹا اپنے باپ پر ایمان نہیں لایا کیسا ہی رنج وغم وافسوس ورحم کیا کرے اور دعا مانگا کرے اس سے کیا ہوتا ہے اس کی مغفرت نہیں ہوسکتی اور جب کہ یہ بات محقق قرار پا چکی کہ مشرکین کی مغفرت نہیں ہونے کی تو انبیاء کو اور نیز تمام مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ مشرکین کے لیے وہ زندہ ہوں یا مردہ دعائے مغفرت کریں کیوں کہ ایسا کرنے میں اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ ان کو خدا کے اس وعدہ پر کہ مشرکین کو نجات نہیں دینے کا پورا پورا یقین نہیں ہے باقی رہی مشرکین کے لیے دعائے خیر کہ وہ ایمان لے آویں اور کفر وشرک سے نجات پاویں جو ان کے ساتھ اصلی محبت ورحم ہے اس کی ممانعت نہیں ہے خود انبیاء نے ایسا کیا ہے اور ہر ایک مسلمان کو ایسا کرنا چاہیے بلکہ مشرکین سے جو زیادہ تر قرابت قریبہ رکھتا ہو ان کے لیے اور زیادہ اور دلی اضطرار اور رنج وغم سے ایسی دعا کرنی لازم ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت یوسف کا قصہ

(حقیقت کی روشنی میں)

قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو ''احسن القصص'' فرمایا ہے اور مفسرین نے اس پر ایسے عجیب و غریب حاشیے چڑھائے ہیں جن کی انتہا نہیں سرسید نے اس واقعہ کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ لکھا ہے اور بڑی تحقیق کے ساتھ اس پر قلم اٹھایا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جو جو اہم آیات قرآنی آئی ہیں سب کی الگ الگ تشریح اور تفصیل اپنے مخصوص نقطہ نگاہ سے کی ہے نیچے وہ سارا بیان درج کیا جاتا ہے جو سرسید نے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے ناظرین سے امید ہے کہ سرسید کی اس تحقیق اور تلاش کو بہت دل چسپ پائیں گے۔

(محمد اسماعیل پانی پتی)

'' ولقد همت به وهم بها''

کی نسبت مفسرین نے بہت لمبی لمبی دور از کار بحثیں کی ہیں کہیں اس پر بحث ہے کہ'' ہم بھا'' کے لفظ سے حضرت یوسف سے گناہ صادر ہوا یا نہیں۔ کہیں اس پر بحث ہے کہ روایت برھان سے کیا مراد، پھر ایک روایت کہی جاتی ہے کہ حضرت یعقوب کی صورت

دانتوں سے انگلی کاٹتے ہوئے دکھائی دی ایک روایت بتائی جاتی ہے کہ مکان کی چھت پر کچھ الفاظ لکھے ہوئے دکھائی دیے اسی طرح کی بہت سی بے فائدہ اور بے ھودہ باتیں تفسیروں میں لکھی ہیں اوران پر جرح، قدح وتعدیل وتصویب کی ہے مگر قرآن مجید کا مطلب بہت صاف ہے البتہ کسی قدر قواعد نحو کے مطابق اس پر بحث ہوسکتی ہے، اگرچہ ہمارے نزدیک اخفش وسیبویہ یا بصرئین وکوفیین کے مستنبطہ قواعد نحو سے قرآن مجید کو جکڑنا اوراس پر جرح محض غلط ناواجب ہے کیوں کہ کتنا ہی استغرا کیا جاوے، کسی زبان کے تمام محاورات وطرز ادااورایڈیم کا استغراءنہیں ہوسکتا لیکن ہم اول اصلی وصاف معنی قرآن مجید کے بیان کر کے بقدر ضرورت مسئلہ نحوی پر بھی بحث کریں گے۔

پہلی آیت میں خدا نے فرمایا تھا کہ اس عورت نے مکان کے دروازے بند کردیے اور یوسف سے کہا کہ آؤ میں تیرے لیے ہوں یعنی حضرت یوسف سے فحش کی خواہش کی حضرت یوسف نے کہا خدا کی پناہ یعنی انکار کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ جس نے مجھ کو گھر میں رکھا ہے یعنی اس عورت کا شوہر وہ میرا رب یعنی مربی ہے اور مجھ کو عزت سے رکھا ہے اور ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے۔

اب دوسری آیت میں جو لفظ وھم بھا کا ہے اس کے یہ معنی کہ حضرت یوسف نے اس عورت سے فحش کا قصد کیا یا ان کے دل میں اس کا ارادہ آیا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتے کیوں کہ پہلی آیت میں صاف اس کام سے انکار بطور نص قطعی بیان ہو چکا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ہم بھا کے معنی عدم وقوع ''ہم'' کے ہوں پس ہم بھا، لولا، کی جزا ہے اور جزا بسبب اہم اور مقصود بالذات ہونے کی شرط پر مقدم ہوگئی ہے۔ اس لیے دوسری آیت کے صاف معنی جو نص قرآنی سے پائے جاتے ہیں یہ ہیں کہ ''اگر یوسف نے دلیل اپنے رب کی نہ دیکھی ہوتی یعنی نہ سمجھی ہوتی تو یوسف نے اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا'' پس قرآن مجید سے

فحش کا قصد کرنا یا اس کا ارادہ دل میں آنا حضرت یوسف کی نسبت بیان نہیں ہوا ہے۔

رویت کا لفظ آنکھ سے ہی دیکھنے پر مخصوص نہیں ہے بلکہ دل میں جو بات یقین اور استحکام سے آ جاتی ہے اس پر بھی روایت بھی تفسیر کبیر میں آنکھ سے دیکھنے کے معنی نہیں بیان ہوئے ہیں بلکہ اس روایت قلبی کے معنی لیے ہیں جو انبیاء و صلحا کو منکرات پر اقدام کرنے سے روکتی ہے۔

فا المراد بالروئة حصول تلک الاخلاق

(یعنی تطهیر نفوس الانبیاء و تذکیر الاحوال الرادعة لهم عن الاقدام علی المنکرات (تفسیر کبیر)

فالهم عبادة عن جو اذب الطبیعه وروئه البرهان عباره عن جواذب العبوریة (تفسیر کبیر)

اب یہ بات غور طلب ہے کہ ''برھان ربہ'' سے کیا مراد ہے تعجب ہے کہ تمام مفسرین نے پہلی آیت میں جو لفظ ''ربی'' ہے اس سے وہ شخص مراد لیا ہے جس نے حضرت یوسف کو خرید کر اپنے گھر میں رکھا تھا اور پرورش کیا تھا اور دوسری آیت میں جو لفظ ''ربہ'' ہے اس سے خدا مراد لیا ہے جس کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے بلکہ بلحاظ سباق پہلی آیت کے دوسری آیت میں بھی وہی شخص مراد لیا ہے جو پہلی آیت میں تھا۔

اب معنی آیت کے اور اور لفظ ''برھان'' کے بالکل صاف ہیں یعنی اگر یوسف نے یہ دلیل نہ سمجھی ہوتی کہ جس نے مجھ کو اپنے گھر میں رکھا ہے اور میرا رب یعنی مربی یا پرورش کرنے والا ہے اس کی عورت کے ساتھ فحش ظلم ہے اور ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے تو یوسف نے اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا۔

اب رہی یہ بحث کہ ''لولا'' جب بطور شرط کے واقع ہو تو جزا کا اس پر مقدم کرنا

بموجب قواعد مستنطبہ نحو جائز ہے یا نہیں اس کی نسبت تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ:

لانسلم ان یوسف علیہ السلام ھم بھا والدلیل علیہ انہ تعالیٰ قال وھم بھا لولا ان راء برھان ربہ و جواب لولا ھھنا مقدم وھو کما یقال قد کنت من الھالکین لولا ان فلانا خلصک (تفسیر کبیر)

ہم اس بات کو نہیں مانتے کہ حضرت یوسف نے اس عورت کے ساتھ قصد کیا تھا کہ خدا نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا اگر نہ دیکھتا دلیل اپنے پروردگار کی اس جگہ لولا مقدم ہے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ تو ہوتا مرے ہوؤں میں سے اگر نہ فلاں شخص تجھ کو بچاتا۔

اس پر زجاج کا اعتراض نقل کیا ہے اس کا اعتراض یہ ہے کہ لولا کا جواب پہلے لانا شاذ ہے اور کلام فصیح میں موجود نہیں ہے۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ جواب لولا کا موخر لانا بہتر ہے مگر مقدم لانا ناجائز نہیں ہے اس جواب لولا کے مقدم آنے پر سورہ قصص کی اس آیت سے سند لی ہے کہ:

واصبح فوا دام موسیٰ فارغا ان کادٹ لتبدی بہ لولا ان ربطنا علی قلبھا لتکون من المومنین (سورہ قصص)

موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا، قریب تھا کہ اس کو ظاہر کر دیوے اگر ہم نے بندش رکھی ہوتی اس کے دل پر

اس پر زجاج کا دوسرا اعتراض نقل کیا ہے کہ لولا کا جواب بغیر لام کے نہیں آتا اگر ہم بھا، لولا کا جواب ہوتا تو یوں کہا جاتا

ولقد ھمت بہ ولھم بھا لولا ان راء برھان ربہ

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ لولا کا جواب لام کے ساتھ آتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں

آتا کہ بغیر لام کے لانا جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ لولا جواب چاہتا ہے اور یہ یعنی وہم بھا اس کا جواب ہوسکتا ہے پھر ضرور ہے کہ وہ اس کا جواب ہو یہ بات کہنی نہیں چاہیے کہ ہم اس کے جواب کو مضمر مانیں گے اور بتہ جگہ قرآن میں جواب کو چھوڑ دیا جاتا ہے کیوں کہ ہم کہتے ہیں کہ اس بات میں کہ قرآن میں جواب چھوڑ دیا گیا ہے کچھ جھگڑا نہیں ہے مگر اصلی بات یہ ہے کہ جواب کا محذوف ہونا نہیں چاہیے۔ صرف اسی جگہ اس کا حذف کرنا یا چھوڑنا بہتر ہوتا ہے جب کہ لفظ میں ایسی دلالت پائی جاوے کہ اس سے وہ جواب محذوف متعین ہوجاوے اور اگر اس جگہ ہم جواب کو محذوف مانیں تو لفظ میں کوئی دلالت ایسی نہیں ہے جو جواب محذوف کو متعین کردے اور اس جگہ بہت سے جواب مضمر ہوسکتے ہیں اور ایک کو باقیوں سے بہتر سمجھنے کی دلیل نہیں ہے انتہیٰ

صاحب تفسیر کبیر نے اس بات کی کوئی مثال نہیں دی کہ لولا کا جواب بغیر لام کے بھی آیا ہے مگر قرآن مجید میں متعدد اس کی مثالیں ہیں سورہ نور میں ہے

ولولا فضل اللہ علیکم و رحمتہ ماز کی منکم من احدا بدا

(آیت 21)

اور سورہ واقعہ میں ہے

" فلولا ان کنتم غیر مدینین ترجعونھا ان کنتم صدقین

(آیت 85,86)"

اور اس شعر زمانہ جاہلیت میں بھی جواب لولا کا بغیر لام کے آیا ہے اور وہ شعر یہ ہے

ولولا انی رحیل حرام

ھصرت قرونھا ولثمت فاھا

اور فرزدق نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی شان میں کہا ہے

ما قال لا قط الا فی تشھد

لولا التشھد کانت لا وہ نعم

اگر چہ ان آیتوں اور شعروں میں لولا کا جواب موخر ہے مگر جب کہ اس کا جواب بحالت موخر ہونے کے بغیر لام کے آیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بحالت مقدم ہونے کے بغیر لام کے نہ آوے چناں چہ ہم اس کی مثال بھی پیش کریں گے۔

بلا شبہ تفسیر کبیر نے نہایت عمدہ طریق پر بیان کیا ہے کہ وھم بھا جواب مقدم ہے، لولا کا، لیکن ہم مختصر طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے کہ وھم بھا جواب مقدم ہے لولا کا، کیوں کہ پہلی آیت سے کسی قسم کے ہم یعنی قصد سے انکار بیان ہو چکا ہے تو آیت میں ہر قسم کے ہم یعنی قصد سے نفی ہونی چاہیے اور اس کی نفی نہیں ہوتی جب تک کہ وھم بھا کو لولا کا جواب مقدم نہ قرار دیا جاوے پس نص قرآنی سے ثابت ہے کہ ھم بھا، جواب مقدم لولا کا ہے

ہم اسی قدر پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکہ بیان کرتے ہیں کہ عرب کے اشعار میں بغیر لام کے بھی لولا کا جواب مقدم آیا ہے امرا القیس کہتا ہے۔

یغالین فیہ الخبرء لولا ھو اجر

جناد بھا صرعی لھن نصیص

غلو کرتیں وہ اونٹنیاں قناعت کرنے میں پانی سے چارہ پر اگر ایسی دو بھر نہ ہوتی جس پر ٹڈیاں زمین پر گر پڑی ہیں اور وہ چر چر بول رہی ہیں گویا بھنے کی وہ چر چراھٹ ہے۔

زھیر جو بہت مشہور اور قدیم شاعر زمانہ جاہلیت کا ہے کہتا ہے

المجد فی غیر ھم لولا مائرہ

وصبر نفسه والحرب تستعر

بزرگی اس کے سوا اوروں میں ہوتی ہے اگر نہ ہوتی اس کی یعنی ممدوح کی خوبیاں اور استقلال نفس ایسی حالت میں کہ لڑائی بھڑک رہی ہے۔

(شہد شاھد) شاھد کا لفظ زیادہ تر گواہ کے معنوں میں مستعمل ہے مگر ایسے گواہ پر جس نے اس واقعہ کو جس کا وہ گواہ ہے بچشم خود دیکھا ہو اس لیے قرآن مجید کے مترجموں نے اس کا ترجمہ کیا ہے (گواہی داد گواہے) اور اردو میں ترجمہ کیا ہے (گواہی دی گواہ نے) مگر یہ ترجمہ صریح غلط ہے کیوں کہ اگر شاہد کے معنی گواہ کے لیے جاویں تو اس کی گواہی

ان كان قميصه قدمن قبل الى آخره

ہوگی اور صاف ظاہر ہے کہ وہ گوہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک واقعہ کی نسبت حکم یا فیصلہ ہے پس خود سیاق قرآن ان معنوں سے جو مترجموں نے اختیار کیے ہیں انکار کرتا ہے اسی لیے اس تفسیر کے مصنف نے جو تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہے ''شہد شاھد'' کی تفسیر میں لکھا ہے حکم حاکمہ شاہد سے حاکم مراد لینا گو سیاق قرآن کے مناسب ہو مگر لفظ کی دلالت سے بہت بعید ہے۔

شہد اور شاہد کا لفظ جیسا کہ گواہ کے معنوں میں مستعمل ہے اس سے زیادہ حاضر اور موجود ہونے کے معنوں میں مستعمل ہے پس صحیح ترجمہ ان لفظوں کا وہ ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے کہ (حاضر ہوا حاضر ہونے والا) یعنی اس تنازع کے وقت جو اس عورت اور حضرت یوسف میں ہوا ایک شخص آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ

ان كان قميصه قدمن قبل الخ

اب اس بات پر بحث ہے کہ وہ شاہد کون تھا تفسیر کبیر میں متعدد روائتیں اس کی نسبت لکھی ہیں جو اسی قسم کی ہیں جیسے کہ بے سروپا روائتیں تفسیروں میں ہوتی ہیں مگر وہ روایت

جس پر ایک گروہ مفسرین کو اتفاق ہے اس قابل ہے کہ اس پر اعتماد کیا جاوے اور وہ یہ ہے کہ

انـه كان لها ابن عم و كان رجلا حكيما و اتفق في ذالک الوقت انه كان مع الملک يريدان يدخل عليها فقال قد سمعنا الجبلة من وراء الباب و شـق الـقـميـص الا انـا لانـدری ايـكما صاحبه فان كان شق القميص من قـدامـه فـانـت صـادقة و الـرجـل كاذب وان كان من خلفه فالرجل صادق وانت كاذبة فلما نظر والى القميص وراؤ الشق من خلفه قال ابن عمها انه مـن كيـد كن عظيم ای من عملكن ثم قال ليوسف اعرض عن هذا واكتمه وقال لها استغنری لذنبک وهذا قول طائفه عظيمة من المفسرين (تفسير كبير)

اس عورت کا چچازاد بھائی تھا اور وہ ایک حکیم آدمی تھا اتفاق سے اس وقت وہ بادشاہ کے ساتھ تھا اور اس عورت کے پاس جانے والا تھا اس نے کہا کہ میں نے دروازہ سے ورے کھینچا تانی اور آواز قمیص پھٹنے کی سنی، مگر میں نہیں جانتا کہ تم دونوں میں کون آتے تھا پس اگر کرتا آگے سے پھٹا ہو تو تو سچی ہے اور وہ شخص جھوٹا ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہو تو وہ شخص سچا ہے اور تو جھوٹی ہے پھر جب قمیص کو دیکھا اور معلوم ہوا کہ وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس عورت کے چچازاد بھائی نے کہہ دیا بیشک تمہارا مکر ہے اور بیشک تمہارا مکر بڑا ہے یعنی یہ کام تمہارا ہے پھر اس نے یوسف سے کہا کہ اس سے درگذر کرو اور اس کو پوشیدہ رکھو اور اس عورت سے کہا کہ تو معافی مانگ اپنے گناہ سے یہ قول ہے ایک گروہ عظیم کا مفسرین میں سے پس یہ روایت ایسی ہے کہ اس کو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہد شاہد کا لفظ بمعنی گواہ کے نہیں آیا بلکہ ایسے شخص کی نسبت آیا ہے جو وہاں حاضر تھا۔

انیسویں اور بیسویں آیت کے اکثر الفاظ نہایت غور طلب ہیں اور مفسرین نے بلا

شبہ ان پر غور کی ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق ان کی تفسیر بھی بیان کی ہے مگر تشفی کے قابل نہیں ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ تفسیر نا معتمد روایتوں پر مبنی ہے ہم چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے ان کی تفسیر سمجھیں۔

ان آیتوں میں ہے کہ جب شہر کی عورتوں نے حضرت یوسف کے ساتھ عزیز مصر کی عورت کے عشق کا چرچا کیا اور کہا کہ وہ علانیہ گمراہی میں ہے اور جب عزیز مصر کی عورت نے ان کا چرچا کرنا سنا تو ان کو دعوت میں بلایا جس میں حضرت یوسف بھی موجود ہوئے مفسرین لکھتے ہیں کہ وہ چار پانچ عورتیں تھے ایک عزیز مصر کے شراب پلانے والے کی عورت، دوسری اس کی روٹی پکانے والی یعنی داروغہ باورچی خانہ کی عورت، تیسری افسر جیل خانہ کی عورت، چوتھی داروغہ اصطبل کی عورت، پانچویں حاجب یعنی افسر منتظم دربار کی عورت۔

ان آیتوں میں جو الفاظ قابل غور ہیں منجملہ ان کے ایک لفظ بمکرھن ہے یعنی جب عزیز مصر کی عورت نے ان عورتوں کا چرچا کرنا سنا تو اس کو بلفظ بمکرھن سے تعبیر کاے پس غور کرنے کی بات ہے کہ ان کے اس چرچے کو کیوں اس لفظ سے تعبیر کیا تفسیر کبیر میں اور اسی طرح اور تفسیروں میں لفظ بمکرھن کی تفسیر بقولھن کی ہے پھر اس پر بحث کی ہے ان کے قول کو مکر کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا ہے تفسیر کبیر میں اس کی تین وجہیں لکھی ہیں جو صحیح نہیں معلوم ہوتیں۔

اول یہ کہ اس چرچہ سے ان کا مطلب یہ تھا کہ عزیز مصر کی عورت ہم کو بھی یوسف دکھا دے مگر یہ کسی قدر بعید از عقل ہے کہ ان عورتوں نے جو عزیز مصر کے محل میں آنے جانے والی اور اس کے افسروں کی عورتیں تھیں اور حضرت یوسف بھی وہیں رہتے تھے اور انہوں نے ان کو کبھی نہ دیکھا ہو۔

دوسرے یہ کہ عزیز مصر کی عورت کے عشق کا راز ان کو معلوم تھا مگر اس کے چھپانے کو

کہا تھا جب انہوں نے اس کا چرچا کیا تو یہ دغا بازی و مکر ہوا تسلیم کرو کہ دغا بازی اور خلاف وعدگی ہوئی رازداری نہ ہوئی مگر اس میں مکر کیا ہوا۔

تیسرے یہ کہ انہوں نے عزیز مصر کی عورت کی پوشیدہ پوشیدہ غیبت کی جو مکر کے مشابہ تھی اس توجیہہ کا بوداپن خود اس سے ظاہر ہے اب ہم قرآن مجید ہی سے تلاش کرتے ہیں کہ ان عورتوں نے جو چرچا کیا اس پر مکر کا کیوں اطلاق کیا قرآن مجید کی اور آیتوں سے جن کا ہم ذکر کریں گے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورتیں خود حضرت یوسف کے عشق میں مبتلا تھیں اور حضرت یوسف کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتی تھیں اور ظاہر میں عزیز مصر کی عورت کو یوسف کے عشق پر ملامت کرتی تھیں اور اس لئے ان کے اس چرچے اور ملامت کرنے کو ان کے مکر سے تعبیر کیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتیں مع عزیز مصر کی عورت کے اس عشق بازی میں شریک تھیں اور ایک کو دوسری کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے عزیز مصر کی عورت نے ان کی بات چیت کو مکر سے تعبیر کیا اور بسبب رازدار ہونے کے یوسف کی دعوت میں ان کو بلایا اور سب نے مل کر حضرت یوسف کو فحش کے ارتکاب پر مجبور کرنا یا ان کو کسی جرم کے حیلہ میں پھنسانا چاہا تھا کیوں کہ حضرت یوسف پہلے جرم کے اتہام سے بری ہو چکے تھے اور وہ مجلس جس میں حضرت یوسف اور وہ عورتیں بلائی گئی تھیں دعوت کی تھی جس میں متعدد قسم کے کھانے تھے اور ان کے کاٹنے کے لیے ہر ایک کو ایک چھری دی گئی تھی چناں چہ تفسیر کبیر اور نیز تفسیر موسوم بہ ابن عباس میں لکھا ہے کہ وہ عورتیں دعوت میں بلائی گئی تھیں اور پھل کاٹنے یا گوشت کاٹنے کو چھریاں ان کو دی تھیں اور وہ گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھاتے تھے مگر ان عورتوں نے صرف حضرت یوسف کو جرم میں پھنسانے کے لیے خود دانستہ اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور اسی جرم کے اتہمام میں ان کو قید خانہ میں بھیجا تفسیر کبیر اور تفسیر ابن عباس کی اصل عبارتیں یہ ہیں۔

حاصل الكلام انها دعت اولئك النسوة واعتدت لكل واحدة منهن سكينا اما لا جل اكل الفاكهه او لاجل قطع اللحم (تفسير كبير)

واقعت (اعطت) كل واحدة منهن سكينا تقطع بها اللحم لانهم كانوا لا ياكلون الا ما يقطعون بكا لما كينم (تفسير ابن عباس)

اب اس مطلب کو ہم قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کرتے ہیں جب بادشاہ نے خواب کی تعبیروں کو جو حضرت یوسف نے دی تھیں سن کر کہا کہ حضرت یوسف کو قید خانہ سے لاؤ تو جو شخص لینے آیا تھا اس سے حضرت یوسف نے کہا کہ

فارجع الی ربک مسئله ما بال النسوة التی قطعن ایدیهن ان ربی بکیدهن علیهم (آیت50)

تو پھر جا اپنے مالک کے پاس اور اس سے پوچھ کہ کیا حال ہے ان عورتوں کا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے بے شک میرا رب یعنی وہ جس نے میری پرورش کی ہے ان کے مکر کو جانتا ہے اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ خود مکر کرنے کے لیے کاٹے تھے۔

اس پر بادشاہ نے یا عزیز مصر نے ان سے پوچھا کہ

ما قال خطبکن اذ راد دتن یوسف عن نفسه قلن حاش الله ما علمنا علیه من سوء (آیت51)

تمہاری کیا حالت تھی جب کہ تم نے لگاوٹ کی یوسف سے اس کو اپنے آپے کی حفاظت سے ڈگمگا دینے کو ان عورتوں نے کہا دھائی خدا کی ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں جانی اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح عزیز مصر کی عورت نے حضرت یوسف سے لگاوٹ کی باتیں کی تھیں وہی حال ان عورتوں کا تھا جنہوں نے دانستہ مکر کرنے کے لیے اپنے

ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

تفسیر کبیر میں بادشاہ کے اس قول کی نسبت

اذ راد دتن یوسف عن نفسه

دو احتمال لکھے ہیں ایک یہ کہ

ان قولـه اذ راد دتـن یـوسف عـن نـفسـه وان كانت صيغة الجمع فـالـمـراد منها الواحده كقوله تعالیٰ الذين قال لهم الناس ان الناس جمعوا لـكـم (والثانی) ان المراد منه خطاب الجماعته ثم هنها وجهان (الاول) ان كـان واحدة منهن راودت یوسف عن نفسها (والثانی) ان كل واحدة منهن راودت یوسف لا جل امراة العزيز (تفسير كبير)

اگرچہ راودتن صیغہ جمع کا ہے لیکن اس سے مراد واحد ہے یعنی وہی عورت عزیز مصر کی مگر یہ احتمال محض غلط ہے اول تو اس لیے کہ صیغہ جمع سے واحد مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں دوسرے یہ کہ بادشاہ نے یوسف کے پیغام پر سوال کیا تھا اور حضرت یوسف نے صاف کہا تھا کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے پس انہی عورتوں سے بادشاہ نے

اذا راو دتن یوسف عن نفسه

کہہ کر سوال کیا پس تحقیق معلوم ہوا کہ وہ صیغہ جمع کا ہے ان عورتوں کی نسبت بولا گیا ہے جو تعداد میں چار پانچ تھیں پھر اس سے واحد مراد لینا خلاف واقع اور خلاف حقیقت ہے دوسرا احتمال یہ لکھا ہے کہ اس سے گروہ عورتوں کا مراد ہے خواہ ان میں سے ہر ایک نے حضرت یوسف کو خود اپنے نفس کے ساتھ فحش کرنے کی لگاوٹ کی ہو خواہ عزیز مصر کی عورت کے ساتھ مگر گو یہ احتمال اس تفسیر کا موید ہے جو ہم نے بیان کی ہے مگر اس احتمال میں بھی جو دو

شقیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ہم پہلی شق کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ وہ زیادہ تر الفاظ قرآن کے مناسب ہے۔

ان آیتوں کے بعد کی آیت میں جو عزیز مصر کی عورت کا یہ قول ہے کہ

قالت قد لکن الذی المتنی فیه (آیت 32)

یعنی وہی شخص ہے جس کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ہو اس کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ان کی ملامت یوسف کے ساتھ عشق رکھنے کی تھی مفسرین نے اس واقعہ کی صورت اس طرح سمجھی ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور عزیز مصر کی عورت نے ان کو دعوت میں بلایا کہ جب وہ یوسف کے حسن و جمال کو دیکھیں گی تو ملامت نہیں کرنے کیں جب انہوں نے دفعۃً حضرت یوسف کو دیکھا تو ان کے حسن و جمال کے سبب ان کو ہوش نہ رہا انہوں نے بجائے گوشت یا میوہ کے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہا کہ یہ تو انسان نہیں ہے بلکہ فرشتہ ہے اس وقت عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کے عشق کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ہو۔

مگر جس طرح کہ ہم نے قرآن مجید کی ایک آیت کی دوسری آیت سے تفسیر بیان کی ہے اس سے صورت واقعہ کی اس کے برخلاف ہے جو مفسرین نے نکالی ہے بلکہ صورت واقعہ یہ تھی کہ ان عورتوں کی ملامت اس بات پر تھی کہ عزیز کی عورت جو بہت اعلیٰ درجہ کی ہے اپنے ایک غلام پر اس طرح فریفتہ ہو جاوے اور وہ اس پر ملتفت نہ ہو پس اس مجلس دعوت میں جب ان عورتوں نے بھی ہر طرح سے حضرت یوسف کی خوشامد اور ان سے لگاوٹ کی اور آخر کار ان کو دھمکانے اور ڈرانے اور مجرم ٹھہرانے کے لیے اپنے ہاتھ بھی کاٹ لیے اور جب بھی حضرت یوسف فحش کے مرتکب نہ ہوئے تو ان عورتوں نے کہا کہ یہ تو انسان نہیں ہے بلکہ ایک بزرگ فرشتہ ہے کہ کسی داؤ میں نہیں آیا اس پر عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ یہ وہی ہے

جس کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ہو کہ میں تو اس پر فریفتہ ہوں اور وہ مجھ پر ملتفت نہیں ہوتا اس کے بعد عزیز مصر کی عورت کا یہ کہنا کہ

ولقد روادتہ عن نفسہ فاستعصم ولئن لم یفعل ما امرۃ یسجنن ولیکونا من الصاغرین (آیت 32)

میں نے اس سے لگاوٹ کی اس کو اپنے آپے کی حفاظت سے ڈگمگانے کو مگر وہ نہیں ڈگمگایا اور بچا رہا اور اگر وہ نہ کرے گا جو میں اس کو کہتی ہوں تو وہ ضرور قید کیا جاوے گا اور البتہ ہوگا چھٹ بھیوں میں سے اس پر حضرت یوسف کا یہ کہنا کہ

قال رب السجن احب الی مما تدعوننی الیہ (آیت 33)

اے میرے خدا قید خانہ مجھے زیادہ پیارا ہے اس بات سے جو وہ مجھ سے چاہتی ہیں، بالکل موید و مثبت اس واقعہ کا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے پس ان تمام آیتوں کے ملانے سے اس واقعہ کی وہی تصویر سامنے آجاتی ہے جو ہم نے بیان کی ہے

(ثم بدالھم من بعد ما راؤ الایات)

اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت یوسف کے قید میں بھیجنے کا ارادہ مجلس دعوت کے بعد پیدا ہوا پس سوال یہ ہے کہ قید میں بھیجنے کی بنیاد وہی پہلا واقعہ تھا جس میں کرتا پھٹا تھا یا اور کوئی نیا امر پیدا ہوا ہمارے نزدیک دعوت کے جلسہ میں ان عورتوں کا مکر سے ہاتھ کاٹ لینا ایک نیا واقعہ حضرت یوسف کو قید میں بھیجنے کا پیدا ہوا لیکن مفسرین اس پہلے ہی واقعہ کو قید کا سبب قرار دیتے ہیں بہر حال یہ ایک ایسا خفیف امر ہے جس میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں مگر تفسیر کبیر میں جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے، اس کو اس مقام پر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

اعلم ان زوج المراۃ لما ظھر لہ براۃ ساحۃ یوسف علیہ السلام فلا

جرم لم يتعرض له فاحتالت المراة بعد ذالك لجميع الحيل حتى نخمل يوسف عليه السلام على موافقتها على مراد ها فلم يلتفت يوسف اليها فلما ايست دنه احتالت فى طريق اخرو قالت لزوجها ان هذا العبد العبرانى فضحنى فى الناس يقول لهم انى راوته عن نفسه وانا لا اقدر على اظهار عذرى فاما ان تاذن لى فاخرج واعتذرو اما ان تجسه كما حبستنى مغند ذالك وقع فى قلب العزيز ان الاصلح حسبه حتى يسقط عن السنة الناس فكر هذا لحديث حتى تقلى الفضيحة فهذا هو المراد من قوله ثم بدالهممن بعد مارا وا الايات يسبحنه حتى حين لان البدء عبارة عن تعيز المراى عما كان عليه فى الاول والمراد من الاية براته بقد القميص من و بروخش الرجمه والزام المحكم ياهه قوله انه من كيد كن عظيم (تفسير كبير)

جب عورت کے شوہر کو حضرت یوسف کی پاک دامنی معلوم ہوئی تو اس نے حضرت یوسف سے کچھ تعرض نہیں کیا پس عورت نے اس کے بعد ہر طرح کے حیلے کیے تا کہ یوسف اس کے ڈھب پر چڑھ جائیں، لیکن وہ بالکل ملتفت نہ ہوئے پس جب وہ مایوس ہوگئی تو ایک طریقہ نکالا اور اپنے شوہر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھ کو لوگوں میں رسوا کیا لوگوں سے کہتا ہے کہ میں نے اس کو پھسلایا اور میں اس کی کوئی تاویل نہیں کر سکتی یا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں گھر سے نکل کر اس کا دفعیہ کروں یا اس کو قید کر دو جیسا کہ تم نے مجھے قید کر دیا ہے اس بات پر عزیز مصر کو خیال ہوا کہ یوسف کا قید ہی کرنا مناسب ہے تا کہ لوگوں کی زبانوں پر یہ تذکرہ نہ رہے اور رسوائی کم ہو جائے اور خدا کے اس قول میں

ثم بدالھم من بعد مارا والایات

کا یہی مطلب ہے کیوں کہ بدء کے یہ معنی ہیں کہ پہلے جو رائے تھی وہ بدل جائے اور آیت سے مراد حضرت یوسف کی پاک دامنی ہے قمیص کے پیچھے کی جانب سے پھٹے ہونے سے اور فیصلہ کرنے والے کے اس الزام دینے سے کہ یہ تمہارا فریب ہے اور تمہارا فریب بہت بڑا ہے۔

اس کے بعد جو آیتیں ہیں وہ حضرت یوسف کے قید میں جانے اور دو قیدیوں اور فرعون مصر کی خوابوں کے متعلق ہیں جن کی تفسیر بیان ہو چکی ہے۔

اب تمام سورہ میں صرف دو تین مقام قابل غور باقی رہ گئے ہیں ایک یہ

" وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم"

دوسرے یہ کہ

" اذھبو بقیمصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی بات بصیر فلما ان جاء البشیرا التاہ علی وجھہ فاء قد بصیرا"

تیسرے یہ کہ

" ولما فصلت العیر قال ابوھم انی لاجد ریج یوسف لولا ان تغندون"

پس اب ہم تینوں مقاموں کی تفسیر بیان کرنی چاہتے ہیں

" ابیضت عیناہ" سے زوال بصارت یعنی اندھا ہو جانا مراد لینا صحیح نہیں ہے غم سے اور زیادہ رونے سے انسان کی آنکھوں میں اس کی بینائی میں ضعف آ جاتا ہے اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں جو سفیدی ہے اس کی رنگت اصلی سفید رنگ میں اور پر رونق نہیں رہتیں بلکہ بے رونق اور اصلی رنگ سے زیادہ سفید ہو جاتی ہیں اور تراوت کے بجائے خشکی آ جاتی ہے یہاں تک کہ آنسو نکلنے بھی موقوف ہو جاتے ہیں اور آنکھیں ڈگر ڈگر کرنے لگتی ہیں پس یہی

حال حضرت یعقوب کی آنکھوں کا ہوگیا تھا قرآن مجیف کے یہ الفاظ

من الحزن فهو کظیم

صاف اسی مطلب کو ظاہر کرتے ہیں

لیکن یہ حالت دفعتہً بدل جاتی ہے جب کہ وہ غم دور ہو جاوے دل میں طاقت اور دماغ میں قوت آ جاتی ہے خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اوران سب باتوں سے آنکھوں پر رونق ہو جاتی ہے ضعف بصر جاتا رہتا ہے اوراصلی بصارت پھر آ جاتی ہے اسی حالت کی نصبت یات بصیرا اور فاء قد بصیرا کہا گیا ہے یہ سب امور طبعی ہیں جو انسان پر ایسی حالت میں گزرتے ہیں پس کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ان طبعی واقعات کو بے ھودہ اور بے سروپا روایتوں کی بناء پر دور از کار قصے بناویں اور چھوٹے قصوں کو قرآن مجید کی تفسیر میں داخل کر کے کلام الٰہی کے ساتھ بے ادبی کریں۔

تفسیر کبیر میں بھی بعض اقوال ایسے لکھے ہیں جو بہت کچھ اس تفسیر سے جو ہم نے بیان کی ہے مناسبت رکھتے ہیں اس مقام پر ان کا نقل کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

انه لما قال یا اسغیٰ علی یوسف غلبه للبکاء وعند غلبة البکاء یکثر الماء فی العین فتصیر العین کانها ابیضت من بیاض ذالک الماء وقوله ابیضت عیناه من الحزن کنایة عن غلبة البکاء والدلیل علی صحته هذا القول ان تاثیر الحزن فی غلبة البکاء لا فی حصول العمی فلو حملنا الا بیضا من علی غلبة البکاء وکان هذا القلیل حسنا ولو حملناه علی العمی لا یحسن هذا القلیل فکان ما ذکرناه اولی وهذا التفسیر مع الدلیل رواه الواحدی فی البسیط عن ابن عبس رضی الله عنهما (تفسیر کبیر)

یعنی جب حضرت یعقوب نے کہا کہ ہائے افسوس یوسف پر تو ان پر رونے نے غلبہ کیا اور رونے کے وقت آنکھ میں پانی بہت ہوجاتا ہے اور آنکھ ایسی ہوجاتی ہے گویا سپید ہوگئی ہے اسی پانی سے اور خدا کا یہ قول کہ یعقوب کی آنکھیں غم سے سپید ہوگئیں رونے کے غلبہ سے کنایہ ہے اور اس قول کے صحت کی دلیل یہ ہے کہ غم کا اثر رونے کا غلبہ ہے نہ اندھا ہوجانا پس اگر ہم سپیدی کو غلبہ بکا پر محمول کریں تو یہ تعلیل معقول نہ ہوگی اس لیے ہم نے جو ذکر کیا وہی بہتر ہے اور یہ تفسیر باوجود اس دلیل کے حضرت ابن عباس سے مروی بھی ہے جیسا کہ واحدی نے بسیط میں روایت کیا ہے پس اس روایت سے جو حضرت ابن عباس سے بیان ہوئی ہے صاف ظاہر ہے کہ ابیضت عیناہ سے حضرت یعقوب کا اندھا ہوجانا مراد نہیں ہے۔

ایک اور قول اسی مقام پر تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

منهم من قال ما عمی لکنه صار بحیث یدرک ادرا کا ضعیفا (تفسیر کبیر)

بعضوں نے کہا ہے کہ وہ اندھے نہیں ہوگئے تھے بلکہ ان کو نظر آتا تھا لیکن کم نظر آتا تھا۔

اس کے بعد تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

فارقد بصیرا ای رجع بصیراً و معنی الا رتداد انقلاب الشی الی حالة قد کان علیها وقوله فارتد بصیرا ای صیره الله بصیرا کما یقال طالت النخلة والله تعالیٰ اطالها واختلفوا فیه فقال بعضهم انه کان قد عمی بالکلیة فالله تعالیٰ جعله بصیرا فی هذا الوقت قال اخرون بل کان قد ضعف بصره من کثرة البکاء و کثرة الاحزان فلما القوا القمیص علی وجهه و بشر بحیاة یوسف علیه السلام عظم فرحه و انشرح صدره وا

زالست احزانه فضد ذالک قوی بصره و وزال النقصان عنه (تفسیر کبیر)

یعنی پھر وہ بصیر ہو گئے اور ارتداد کے معنی کسی شے کا اس حالت پر واپس آ جانا ہے جو پہلی تھی اور خدا کا یہ قول فارتد قد بصیرا اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے ان کو بصیر کر دیا جیسا کہ محاورہ میں کہتے ہیں کہ کھجور لمبی ہو گئی اور خدا نے اس کو لمبی کر دیا اور اس میں لوگوں نے اختلاف کا ہے سو بعضوں نے کہا کہ وہ بالکل اندھے ہو گئے تھے اور اللہ نے ان کو اس وقت بصیر کر دیا اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کی نگاہ زیادہ رونے سے اور غم سے ضعیف ہو گئی تھی پس جب ان پر کرتہ ڈالا اور یوسف کی زندگی کی خوش خبری دی تو ان کو بہت خوشی حاصل ہوئی اور ان کا سینہ کھل گیا اور غم جاتا رہا پس ان کی نگاہ ٹھیک ہو گئی اور جو نقصان تھا جاتا رہا۔

اب لاجد ریح یوسف پر غور کرنی باقی ہے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب کوا سبات پر کہ حضرت یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہرگز یقین نہیں تھا اور وہ بلا شبہ ان کو زندہ سمجھتے تھے اور ایسے موقع پر یہی خیالات ہوتے ہیں کہ وہ کہیں چلا گیا ہوگا اور کسی نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہوگا یا بطور غلام کے بیچ ڈالا ہوگا اور اس زمانہ کی حالت کے موافق یہ اخیر خیال زیادہ قوی ہوگا انہی وجوہات سے ان کو ہمیشہ یوسف کی تلاش رہتی تھی اور ہمیشہ اس کے ملنے کی توقع رکھتے تھے اور ان کے تلاش کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے یہ ایسا امر ہے جو ہمیشہ ہوتا ہے اس زمانہ میں بھی اگر کسی کا لڑکا گم ہو جاتا ہے یا کہیں نکل جاتا ہے تو ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتا ہے اور اس سے ملنے یا اس کے مل جانے کی توقع رکھتا ہے۔

اس زمانہ میں مصر کی ایسی حالت تھی کہ لڑکے اور لڑکیوں کو پکڑ لے جا کر وہاں بیچ ڈالنا زیادہ قرین قیاس تھا اور کچھ تعجب نہیں ہے کہ حضرت یعقوب کو بھی یہ خیال ہو کہ کسی شخص نے یوسف کو پکڑ لیا ہو اور مصر میں لے جا کر بیچ ڈالا ہو تفسیر کبیر میں ایک روایت لکھی ہے گو اس

روایت کا طرز بیان کیسا ہی فضول ہو مگر اس کی فضولیات چھوڑ کر دو نتیجے اس سے نکالے جا سکتے ہیں ایک یہ کہ حضرت یعقوب کو یوسف کے زندہ ہونے کا یقین تھا دوسرے یہ کہ ان ک و یوسف کے مصر میں ہونے کا احتمال تھا اور وہ روایت یہ ہے کہ

قال یعقوب علیہ السلام واعلم من اللہ تعلمونو ھو انہ تعالیٰ یاتینی بالفرح من حیث لا احتسب فھو اشارہ الی انہ کان بتوقع وصول یوسف الیہ و ذکر والسبب ھذا التوقع امور احدھا ان ملک الموت اتاہ فقال لہ یا ملک الموت ھل قبضت روح ابنی یوسف قال لا یا نبی اللہ ثم اشار الی جانب مصر و قال اطلبہ ھھنا (تفسیر کبیر)

یعنی حضرت یعقوب نے کہا کہ میں خدا کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی میں خدا کا وہ احسان اور رحمت جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور وہ یہ ہے کہ خدا میرے لیے خوشی لائے گا اور مجھے پہلے سے اس کی کچھ خبر نہ ہو گی پس یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت یعقوب یوسف کے ملنے کی امید رکھتے تھے اور لوگوں نے اس امید کے مختلف وجوہ بیان کیے ہیں ایک یہ کہ ملک الموت ان کے پاس آیا تو ان سے یعقوب نے پوچھا کہ تم نے میرے بیٹے کی روح قبض کر لی انہوں نے کہا اے خدا کے پیغمبر! نہیں پھر ملک الموت نے مصر کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ادھر تلاش کیجئے۔

بلاشبہ حضرت یعقوب نے مصر میں بھی تلاش کی ہو گی مگر وہ عزیز مصر کے ہاتھ بیچے گئے تھے اور محلوں میں داخل تھے اور ایک مدت تک قید رہے ان کا پتہ نہیں لگ سکتا ہو گا مگر جب حضرت یوسف کے بھائی مصر میں گئے اور حضرت یوسف بھی اس زمانہ میں عروج کی حالت میں تھے اور رعایت اور سلوک جو انہوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا اور پھر اپنے حقیقی بھائی کے لانے کی بھی تاکید کی تھی اور کچھ حالات بھی ان کے سنے ہوں گے تو ان

کے بھائیوں اوران کے باپ کے دل میں ضرور شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں یہ یوسف ہی نہ ہومگر جس درجہ شاہی پر اس وقت حضرت یوسف تھے یہ شبہ پختہ نہ ہوتا ہوگا اور دل سے نکل جاتا ہو گا۔

اس بات کا ثبوت کہ یوسف کے بھائیوں کے دل میں بھی شبہ تھا کہ وہ یوسف ہی نہ ہوخود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیوں کہ جب حضرت یوسف نیان سے کہا کہ ''تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اوراس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا تو بغیر اس کے کہ حضرت یوسف کہیں کہ میں یوسف ہوں ان کے بھائی بول اٹھے کہ انک لانت یوسف یعنی کیا سچ مچ تم یوسف ہو اسی طرح حضرت یعقوب کے بیٹوں کے مصر میں آنے جانے اور حالات سننے سے یوسف کی نسبت مصر میں ہونے بلکہ یوسف کے یوسف ہونے کا شبہ قوی ہو جاتا تھا اس امر کی تقویت کے علاوہ اس پہلی روایت کی موید چند اور روایتیں تفسیر کبیر میں موجود ہیں۔''

ایک روایت یہ ہے کہ

قال السدی لما اخبرہ بنوہ بسیرۃ الملک و کمال حالہ فی اقوالہ و افعالہ طمع ان یکون ھو یوسف و قال یبعدان یظھر فی الکفار مثلہ (تفسیر کبیر)

یعنی سدی کا قول ہے کہ جب حضرت یعقوب کو ان کے بیٹوں نے عزیز مصر کے صفات اوران کے اقوال وافعال کے کمال سے مطلع کیا تو ان کو امید ہوئی کہ وہ یوسف ہی ہوں گے اور یہ کہا کہ کافروں میں تو ایسا شخص پیدا نہیں ہوسکتا۔

ایک یہ کہ

علم قطعا ان بنیامین لا یسرق وسمع ان الملک ما اذاہ وما ضربہ فغلب علی ظسنہ ان ذالک الملک ھو یوسف (تفسیر کبیر)

یعنی انہوں نے قطعاً جان لیا کہ بنیامین چوری نہیں کرسکتا اور یہ سنا کہ بادشاہ نے اس کو نہ ستایا نہ مارا پس ان کو گمان غالب ہوا کہ یہ بادشاہ یوسف ہی ہوگا۔

ایک یہ ہے کہ

انہ رجع الی اولادہ وتکلم معھم علی سبیل اللطف وھو قولہ یابنی اذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ واعلم انہ علیہ السلام لما طمع فی وجدان یوسف بناء علی الامارات المذکورۃ قال لبنیہ تحسوا من یوسف (تفسیر کبیر)

یعنی وہ اپنی اولاد کی طرف مخاطب ہوئے اور ان کے ساتھ مہربانی سے باتیں کیں جیسا کہ خدا نے کہا

اذھبوا فتحسسوا من یوسف و اخیہ

اور جان تو کہ حضرت یعقوب کو جب ان نشانیوں کی امید بندھی تو انہوں نے بیٹوں سے کہا کہ یوسف کا پتہ لگاؤ۔

پس جب کہ حضرت یعقوب کا شبہ اس قدر قوی ہوگیا اور جو مہربانی یوسف نے اپنے بھائی کے ساتھ کی تھی اس کو سن کر ان کو گمان غالب ہوگیا تھا کہ وہ بنیامین کا بھائی یوسف ہے تو ان کو یقین کامل ہوا کہ اب کے جو قافلہ واپس آوے گا تو ٹھیک خبر یوسف کی لاوے گا جب کہ تیسری دفعہ یہ لوگ مصر میں گئے تو حضرت یوسف نے سب کے سامنے کہہ دیا تھا کہ میں یوسف ہوں اور حضرت یعقوب کو معہ تمام کنبہ کے بلانے کے لیے کہا تھا اور ان کے لیے بہت سا سامان مہیا کرنے کو حکم دیا تھا جس کے لیے کچھ عرصہ لگا ہوگا اس عرصہ میں حضرت یوسف کے مصر میں موجود ہونے کی خبر افواہاً حضرت یعقوب کو پہنچ گئی ہوگی اس افواہ پر ان کو یقین ہوا اور انہوں نے فرمایا کہ

" انی لا جدریح یوسف لو لا ان تفندون"

یعنی میں پا تا ہوں خبر یوسف کی اگر تم مجھ کو بہکا ہوا نہ کہنے لگو۔

ہم کو نہیں معلوم کہ قرآن مجید میں کہیں "رنج" کا لفظ بمعنی بو کے آیا ہو اس مقام پر "رنج" کا لفظ یوسف کی طرف مضاف ہے تو اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اور کہیں بھی رنج کا لفظ کسی شخص یا اشخاص کی نسبت مضاف ہو کر آیا ہے یا نہیں اگر آیا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں تلاش کے بعد ہم کو یہ آیت ملی

واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم (سورہ انفال آیت 48)

یعنی جاتی رہے گی ہوا تمہاری یعنی قوت و اتفاق کی جو خبر مشہور ہے اس کی شہرت جاتی رہے گی۔

علاوہ اس کے خود ریاح کو بشرا یعنی خبر دینے والی خدا نے کہا ہے

" ھو الذی یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمتہ (سورہ اعراف آیت 55)"

اور ریاح کو مبشرات بھی کہا ہے یعنی خبر دینے والیاں

" ومن آیاتہ ان یرسل الریاح مبشرات" (سورہ لقمان آیت 45)

پس ریح یوسف سے مراد اس افواھی خبر سے ہے جس سے یوسف کا ہونا حضرت یعقوب نے سنا تھا۔

مفسرین کے دل میں یہ کہانی بسی ہوئی تھی کہ جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا ہے تو حضرت جبریل نے بہشت سے ایک قمیص لا کر حضرت ابراہیم کو پہنا دیا تھا جس کے سبب سے وہ آگ میں نہیں جلے۔ وہ قمیص حضرت اسحاق اور ان کے بعد حضرت یعقوب

کے پاس آیا حضرت یعقوب نے اس کو بطور تعویذ کے چاندی میں منڈھ کر حضرت یوسف کے گلے میں لٹکا دیا جب ان کو اندھے کنوئیں میں ڈالا ہے تو وہ تعویذ ان کے گلے میں رہ گیا تھا وہی قمیص انہوں نے بھیجا تھا جب وہ نکلا تو ہوا لگ کر تمام دنیا میں بہشت کے قمیص کی خوشبو پھیل گئی اوروں نے تو جانا کہ کاہے کی بو ہے مگر حضرت یعقوب نے بو کو پہچان لیا اور جان گئے کہ بہشت کی یا یوسف کے قمیص کی ہے پس اس خیال پر قرآن مجید میں بھی ریح کے معنی بو قرار دے دیے یہ قصہ تفسیر کبیر میں بھی مندرج ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے جو اپنا کرتا کہ انہوں نے بھیجا تھا وہ بلا شبہ ایک شاہانہ کرتا ہوگا اور صرف بطور نشانی کے بھیجا تھا کوئی اور عجیب بات اس کرتے میں نہ تھی بہ جز اس کے کہ اس سے حضرت یعقوب کو پورا یقین اور ان کے دل کو تسلی ہو جاوے کہ یوسف زندہ ہے اور ایسے عالی درجہ پر خدا نے اس کو پہنچا دیا ہے۔

(لقد کان فی قصصھم عبرۃ)

اب ہم کو غور کرنی چاہیے کہ اس قصے میں عبرت پکڑنے کی کیا چیزیں ہیں مفسرین نے جو کچھ لکھا ہو لکھا ہو مگر چند باتیں بلا شبہ اس میں نہایت عبرت پکڑنے کی ہیں۔

سب سے اول حضرت یوسف کی پاک دامنی ہے حضرت یوسف جوان تھے اور انسان کا نفس امارہ جوانی کے زمانہ میں ادنیٰ سی بات میں پاک دامنی سے ڈگمگا دیتا ہے۔ حضرت یوسف کو اس ڈگمگا دینے کی اس قدر زیادہ ترغیبیں تھیں جو بہت کم کسی انسان کو ہو سکتی ہیں عزیز مصر کی عورت جو ایک بادشاہ کی بیگم ہونے کا درجہ رکھتی تھی اس کی درخواست گار تھی وہ خود بھی جوان اور خوب صورت تھی دنیا کی تمام نعمتیں یوسف کو دینے پر موجود تھی وہ اور یوسف ایک محل میں رہتے تھے جب چاہیں تنہائی میں مل سکتے تھے متعدد دفعہ وہ عورت اس طرح پیش آئی کہ اس حالت میں ایک جوان مرد کا ایک جوان عورت کی خواہش کا نہ پورا کرنا اگر ناممکن

نہیں تو حد سے زیادہ مشکل ہے اور باوجود ان باتوں کے حضرت یوسف کا صرف خدا کے ڈر سے اور اس احسان مندی کی وجہ سے کہ اس بے شوہر نے مجھے خریدا ہے اور پرورش کیا ہے اور اپنے گھروں میں رکھا ہے میں کیوں کر اس کی خیانت کر سکتا ہوں پاک دامن رہنا بے انتہا غور کرنے اور نصیحت پکڑنے کے قابل ہے ادھر خدا کا خوف اور خدا کے احکام کی اطاعت نصیحت دیتی ہے اور ادھر محسن کے احسان کو کبھی نہ بھولنا اور قدرتی جذبات انسانی پر بھی احسان مندی کو غالب رکھنا انسانوں کے واسطے بہت بڑی نصیحت ہے۔

جب عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ اگر تو میری بات نہ مانے گا تو میں تجھ کو قید خانہ میں بھیج دوں گی اور ذلیل کر دوں گی تو یوسف نے اس مصیبت اور دقت کو گوارا کر کے کس سچے دل اور خلوص نیت سے کہا کہ اے میرے پروردگار قید خانہ مجھ کو بہت پیارا ہے اس بات سے جو وہ مجھ سے چاہتی ہے یہ قول حضرت یوسف کا کس قدر دل میں اثر کرنے والا اور عبرت اور نصیحت دینے والا ہے۔

باپ سے کم سنی میں مفارقت، بھائیوں کا ظلم، اندھے کنوئیں ڈال دیے جانے کی مصیبت، بطور غلام کے پکڑے جانے اور بیچے جانے کی ذلت اور پھر عیش و آرام میں آ کر قید خانہ میں ڈالے جانے کی ذلت و مصیبت سب کو صبر سے سہنا اور ہر حالت میں خدا کی مرضی پر راضی رہنا کبھی اس کی شکایت نہ کرنا کیا انسانوں کے لیے عمدہ سے عمدہ نصیحت نہیں ہے۔

اس کے بعد جب یوسف بادشاہت کے درجہ پر پہنچ گئے اور بھائیوں پر بخوبی قابو پایا تو ان کے تمام ظلموں کو جو ان کے ہاتھ سے سہے تھے اور ان کی تمام برائیوں اور بدسلوکیوں کو یک لخت بھلا دینا اور نہایت اخلاق و محبت سے ان کے ساتھ پیش آنا اور نہایت مصیبت کے وقت پے در پے اور طرح بطرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا دنیا میں ان کی خطاؤں سے در گذر کرنا اور عاقبت میں ان کے گناہوں کی معافی چاہنا کیا انسانوں کے لیے اپنے اخلاق

درست کرنے کے لیے کچھ کم نصیحت ہے۔

ماں باپ کی خدمت اور تعظیم و ادب جو عین بادشاہت کے درجہ پر پہنچ کر حضرت یوسف نے ادا کیا ہمارے لیے کیسی عمدہ نصیحت ہے۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے جو بدسلوکی اپنے بھائی اور اپنے بڑھے باپ کے ساتھ کی اور آخر کار اس سے نادم اور پشیمان ہوئے کیا ہمارے لیے ایسے یا اس کی مانند کاموں سے بچنے کیلئے عمدہ نصیحت نہیں ہے۔

حضرت یعقوب کو اس واقعہ سے جو رنج پہنچا اور زمانہ دراز تک اس رنج و مصیبت میں مبتلا رہے مگر ہر حال میں خدا ہی کو رکھی اور اگر کوئی لفظ زبان سے نکلا تو یہی نکلا کہ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ تو کیا ان کی یہ حالت ہم کو خدا کی مرضی پر راضی اور احسان کا شکر ادا کرنے اور اس کے رحم کے ہر حالت میں متوقع رہنے کے لیے کیسی کچھ نہایت موثر نصیحت نہیں ہے۔

پھر اس چھوٹی صورۃ اور مختصر الفاظ میں ان واقعات کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ لفظوں پر غور کرنے سے ہر ایک بات کی تفصیل اور جزئیات اور انسانی جذبات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے اور وہ واقعات دل میں اثر کرتے ہیں اور خدا کے اس فرمانے پر کہ

ماکان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیه و تفصیل کل شئی و ھدی و رحمته لقوم یومنون

دل سے ایمان آجاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

قوم عاد اور قوم ثمود کے حالات

(سرسید کا ایک نہایت تحقیقی مضمون)

عاد اور ثمود کی نسبت کچھ لکھنے سے پہلے مندرجہ ذیل شجرہ، انساب لکھنا مناسب ہے

(سید احمد)

قوم عاد اولیٰ

عاد اولاد سام بن نوع سے ہے سام کا بیٹا آرام اور اس کا بیٹا عوص اور اس کا بیٹا عاد، معالم التنزیل میں لکھا ہے

وهو عاد بن عوص بن آرام بن سام و هم عاد الاولى

قوم عاد کی آبادی عربیا ڈرزتا یعنی عرب کے ریتلے میدان میں تھی اور الاحقاف کہلاتی تھی معالم التنزیل میں لکھا ہے کانت منازل قوم عاد بالاحقاف وہی رمال بین عمان وحضرت موت عرب کے نقشہ میں جو ریگستان پچاس درجہ طول اور بیس درجہ عرض پر واقع ہے وہ جگہ الاحقاف ہے جہاں قوم عاد آباد تھی۔

یہ قوم عاد اولیٰ کہلاتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے

وانه اهلک عاد الاولى (سورہ نجم آیت 51)

ثمود جس کا ذکر آگے آوے گا وہ عاد ثانی کہلاتا تھا اور ایک تیسرا عاد ہے جو عبد شمس

یعنی سبا اکبر کی اولاد میں ہے اور جس کا بیٹا شداد ہے وسنہ 2092 دنیوی میں پیدا ہوا تھا پہلی دونوں قومیں عاد کی حضرت ابراہیم سے پہلے تھیں اور تیسری قوم حضرت ابراہیم کے زمانہ میں ہمارے مفسروں نے علاوہ ان لغو قصوں کے جو قوم عاد کی نسبت لکھے ہیں ایک اور غلطی یہ کی ہے کہ ان تینوں قوموں کے واقعات کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔

قوم عاد اولیٰ کا واقعی زمانہ بتلانا نہایت مشکل ہے مگر انگریزی مورخوں نے جو توریت میں بیان کیے ہوئے حساب کے زمانے قائم کیے ہیں اسی حساب کی بنا پر ہم بیان کرتے ہیں کہ سام 1558 دنیوی میں پیدا ہوا تھا اور ارفکسد جو آرام کا بھائی ہے 1258 دنیوی میں یعنی سو برس بعد پس یہی زمانہ قریباً آرام کی پیدائش کا خیال ہو سکتا ہے اور عاد و پشت بعد آرام سے ہے پس اگر ساٹھ برس دو پشت کے لیے ہم اضافہ کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ عاد 1718 دنیوی یعنی اٹھارھویں صدی دنیوی میں ہوا تھا۔

ھود جن کا نام توریت میں عیبر لکھا ہے وہ بھی اولاد سام بن نوح سے ہیں عیبر کی پیدائش توریت کے حساب سے 1723 دنیوی کی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ عاد اور ھود ایک ہی زمانہ میں تھے اسی صدی میں نمرود نے بابل یا سریا میں بادشاہت قائم کی تھی اور حام پدر مصریم نے مصر میں اور عاد بن عوص نے الاحقاف میں اور عیبر یعنی ھود کے بیٹے یقطان نے یمن اور اس کے اطراف میں حضرت موت یقطان کا ایک بیٹا تھا جس کے نام سے یمن کے قریب کا وہ ملک جو انڈین اوشن یا بحر عرب کے کنارہ پر ہے مشہور ہے۔

یہ قوم عاد اولیٰ کی نہایت قوی اور قد آور تھی جیسے کہ اب بھی بعض ملکوں کے لوگ قوی اور قد آور ہوتے ہیں یہی بات خدا تعالیٰ نے اس قوم کی نسبت فرمائی ہے

"وزادکم فی الخلق بصطة (سورہ اعراف 67)"

ان کے قد معمولی قد آور آدمیوں سے ذراع کا لمبا تھا اور لمبے سے لمبا چار سو ذراع کا

محض غلط ہے۔ نہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے نہ اور کسی سند سے قدیم علماء نے بھی اس سے انکار کیا ہے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

وقال قوم یحتمل ان یکون المراد من قوله و زادکم فی الخلق بصطة کونهم من قبیلة واحدة متشارکین فی القوة والشدة والجلادة و کون بعضهم محبا للباقین ناصر الهم و زوال العداوة والخصومة من بینهم فانه تعالیٰ لما خصهم بهذه الانواع من الفضائل والسنهاقب فقد قور لهم حصولها فصح ان یقال و زادکم فی الخلق بسطة (تفسیر کبیر)

یعنی عالموں نے

" زادکم فی الخلق بصطة"

سے ان کا زیادہ وہ قوی ہونا مراد لیا ہے نہ لمبا قد ہونا بعض عالموں نے ان لفظوں سے یہ مراد لی ہے کہ اس قوم کے لوگ کثرت سے تھے اور آپس میں محبت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے مددگار ہوتے تھے اور اس ارتباط کے سبب سے گویا ایک جسم ہو گئے تھے نہ یہ کہ ان کے قد بہت لمبے تھے اور وہ تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ چوڑے چکلے تھے۔

سورۃ الفجر میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے

" الم تر کیف فعل ربک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلها فی البلاد"

اس آیت میں بھی اسی قوم عاد اولیٰ کا تذکرہ ہے ارم عاد کے داد! کا نام ہے جو کہ متعدد قومیں عاد کے نام سے مشہور تھیں جیسے کہ ہم نے اوپر بیان کیا اسی لیے خدا تعالیٰ نے ایک جگہ اس قوم کو عاد اولیٰ کر کے بیان کیا اور اس جگہ اس کے دادا کے نام سے پس ارم بیان ہے یا بدل ہے لفظ عاد سے یعنی ارم کی اولا دوالا عاد ذات العماد سے بھی اسی طرح ان کا قوی

اور قد آور ہونا بتایا ہے جیسے کہ لفظ زادکم فی الخلق بسطۃ سے بتایا ہے

لفظ لم یخلق مثلھا فی البلاد

سے صاف پایا جاتا ہے کہ عاد سے ان کے مخلوق قد مراد ہیں نہ کسی مکان کے مصنوعی ستون چناں چہ اکثر تفسیروں میں اور نیز تفسیر کبیر میں ہے اس کے مطابق علماء و مفسرین کے اقوال نقل کیے ہیں مگر اس کے سوا اور قول بھی ہیں جن میں غلطی سے ارم کو شہر کا نام سمجھا ہے اور ''ذات العماد'' سے عمارات رفیعہ مراد لی ہے اور یہ محض غلط ہے اس لیے کہ قوم عاد اولیٰ ریگستان میں رہتی تھی اور ان کی کوئی عالی شان عمارتیں نہ تھیں بعض عالموں نے غلطی پر غلطی یہ کی ہے کہ ارم کو باغ تصور کیا ہے اور لکھا ہے کہ عدم کے پاس شداد نے بنایا تھا مگر یہ محض نا واقفیت سے لکھا ہے شداد کے باپ کا نام بھی عاد ہے مگر وہ اس زمانہ میں نہ تھا اور نہ اس نے کوئی ایسا باغ جیسا کہ مفسرین بیان کرتے ہیں بنایا تھا۔

بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کہ قوم ارم خیموں میں رہتی تھی اور خیموں میں ضرور ہے کہ عماد یعنی استادے ہوں جن پر خیمے کھڑے ہوتے ہیں اور عمد کی جمع عماد آئی ہے مگر اس رائے سے یہ الفاظ قرآن مجید کے کہ

''لم یخلق مثلھا فی البلاد''

مساعدت نہیں کرتے رورنڈ فارسٹر نے ایک تاریخانہ جغرافیہ عرب کا لکھا ہے اور اس میں نو یری کے تاریخانہ جغرافیہ سے بعض حالات نقل کیے ہیں 660 عیسوی اور 670 عیسوی کے درمیان یعنی مطابق 40ھ و 50 ہجری کے معاویہ ابن ابی سفیان کے عہد حکومت میں عبدالرحمان یمن کا حاکم تھا اس نے چند کتبے قدیم زمانہ کے یمن و حضر موت کے نواح کے کھنڈرات میں پائے تھے اور پڑھے گئے تھے اور لوگوں نے خیال کیا تھا کہ یہ کتبے قوم عاد کے زمانہ کے ہیں ان کا عربی ترجمہ نو یری کے جغرافیہ میں مندرج ہے ان میں سے چند کتبوں

کے ترجموں کو اس کتاب سے ہم اس مقام پر لکھتے ہیں:

ترجمہ: کتبه اول مندرجه جغرافیه تویری غنینا زمانا فی عراصه ذا القصر بعیش عیهرضنک ولا نذر یفیض علینا البحر بالمد زاجرا فانهارنا مبزعة یجرخلال نخیل باسقات نواطرها نفق بالقسب المجزع والتمر نصطاد صید البر بالخیل والقنا وطور انصید النون من لجبح الجر و نرفل فی الخز المرقم تارة وفی القزا حیانا وفی الحلل الخضر یلینا ملوک یبعدون عن الخنا شدید علیٰ اهل الخیانه والعذر یقیم لنا من دین هود شرایعا ونومن بالا یات والبعث والنشر اذا ما عدوحل ارضا یریدنا بزرنا جمیعا بالمثقفه السمر نحامی علی ادلادنا و نسائنا علی الشهب والکمیق المنیق والشقر نقارح من یبغی علینا و یعتدی با سیافنا حتی یولون یالدبر

دوم: ترجمه کتبه مندرجه جغرافیه نویری غنینا بهذا القصر وهو افلم یکن لناهمة الا البلد ذوالقطف تروح علینا کل یوم هنیدة من الابل یعشق فی معاطننا الطرف واضعاف تلک الا بل شاء کانها من الحسن ارام او البقر القطف فعشتا بهذا القصر سبعة احقب با طیب عیش جل عن ذکره الوصف فجات سنون مجدبات قواحل اذا ما مضا علم اتی اخر یقفو فظلنا کان لم تغن فی الخیر لمحة فما تو اولما یبق خف ولا ظلف کذالک من لم یشکر الله لم یزل معالمه من بعد ساحته تعفو

سوم کتبه مندرجه کتاب ابن هشام قال ابن هشام حضر السیل عن قبر بالیمن فیه امراة فی عنقها سبع مخانق من برو فی یدیها و رجلیها الاسورة والخلا خیل والدما لیج سبعة سبعة وفی کل اصبع خاتم فیه

جوهرة مشنة وعندراسها توباوت مملوما لا ولوح فيه مكتوب

باسمک اللهم اله حمیر

انـا تـاجة بـنـت ذی شـفر بعثت مایرنا الیٰ یوسف فابطا علینا فبعثت لاذتـی بـعد من ورق لتا تینی بعد من طحبن فلم تجده فبعثت بمدمن ذهب فـلـم تـجـده فبعثت بمدمن بحری فلم تجده نامرت به فطحن فلم انتفع به فـاقتـفـلـت فـمن سمع بی فلیر حمنی وایة امراة لیست حلیا من حلیی فلا ماتت الامیتی

1834ء میں سرکار انگریزی نے یمن کی پیمائش کے لیے کچھ افسر بھیجے انہوں نے حضرت موت میں جو سمندر کے کنارے پر ہے ایک پہاڑ پر ایک قلعہ کے کھنڈرات معلوم کیے اور ان کھنڈرات میں پتھر پر کھدے ہوئے کتبے دیکھے تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ قلعہ حصن غراب کے نام سے مشہور ہے (طول بلد 48 درجہ 30 دقیقہ اور عرض بلد 14 درجہ) وہاں ایک اونچی جگہ پر ایک کتبہ ملا پرانے حرفوں میں پتھر پر کھدا ہوا جو حرف کہ کوفی حرفوں سے بھی بہت پہلے کے ہیں اور اس سے کسی قدر نیچے ایک اور کتبہ پایا اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک اور چھوٹا سا کتبہ ملا علاوہ اس کے حصن غراب سے پچاس میل کے فاصلہ پر اور کھنڈرات ملے۔ لقب الحجر کے نام سے اور اس کے دروازہ پر ایک کتبہ ملا ان کتبوں کی بعینہ نقل کر لی گئی۔

ان کتبوں کی تحقیقات ہوتی رہی جب وہ پڑھے گئے تو معلوم ہوا کہ نویری کے جغرافیہ میں جو کتبہ ہے وہ ترجمہ ہے حصن غراب کے بڑے کتبہ کا چناں چہ اصلی کتبہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا جس کا اردو ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں۔

ترجمہ حصن غراب کے بڑے کتبہ کا

ہم رہتے تھے رہتے تھے ہوئے مدت سے عیش وعشرت میں زمانہ میں اس وسیع محل
کے ہماری حالت بری تھی مصیبت اور بدبختی سے بہتا تھا ہمارے تنگ راستہ میں۔

سمندر زور سے لہراتا ہوا اور غصہ سے ٹکراتا ہوا ہمارے قلعہ سے ہمارے چشمے بہتے
تھے گنگناتی ہوئی آواز سے گرتے تھے۔

کھجور کے بلند درختوں سے اوپر جن کے رکھوالے کثرت سے بکھیرتے تھے خشک
کھجور (یعنی ان کی گٹھلیاں) ہماری گھاٹی کی کھجور کی زمین میں وہ اپنے ہاتھ سے پھیلاتے
تھے سوکھے چانول (یعنی بوتے تھے)

ہم شکار کرتے تھے پہاڑی بکروں کو اور نیز خرگوش کے بچوں کو پہاڑیوں رسیوں اور
سرکنڈوں سے بھگا کر ہلاتے تھے جھگڑتی ہوئی مچھلیوں کو۔

ہم چلتے تھے آہستہ مغرور چال سے پہنے ہوئے سوئی کے کام کیے ہوئے مختلف رنگ
کے ریشمی کپڑے بالکل ریشم کے کاھی سبز رنگ کی چارخانہ دار پوشاک۔

ہم پر حکومت کرتے تھے بادشاہ جو بہت دور تھے ذلت سے اور سخت سزا دینے والے
تھے بدکار اور منکر آدمیوں کے اور انہوں نے لکھی ہمارے واسطے مطابق اصول ھود کے۔

عمدہ فتویٰ ایک کتاب میں محفوظ رہنے کے لیے اور ہم یقین کرتے تھے معجزہ کے بھید
میں مردوں کے بھید میں اور ناک کے سوراخ کے بھید میں۔

ایک حملہ کیا لٹیروں نے اور ہم کو ایذا پہنچاتے ہم اور ہمارے فیاض نوجوان جمع ہو
کے سوار ہو کر چلے معہ سخت اور تیز نوکدار برچھیوں کے آگے کو جھپٹتے ہوئے۔

مغرور اور بہادر حمایتی ہمارے خاندانوں اور ہماری بیویوں کے لڑتے ہوئے دلیری

سے گھوڑوں پر سوار جن کی لمبی گردنیں تھیں اور جو سمندر اور لوھیا رنگ اور سرنگ تھے۔

ہم اپنی تلواروں سے زخمی کرتے ہوئے اور چھیدتے ہوئے اپنے دشمنوں کو یہاں تک کہ دھاوا کر کے ہم نے فتح کیا اور کچل ڈالا ان ذلیل آدمیوں کو

ترجمہ اس کتبہ کا جو اس کتبہ کے نیچے کھدا ہوا ہے

علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا گیا اور لکھا گیا۔ سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کی طرف اور نقطہ لگے ہوئے یہ گیت فتح کا سرش اور زرغا نے عوص نے چھید ڈالا (یعنی زخمی کر دیا) اور تعقب کیا بنی عک کا اور ان کے چہروں کو سیاھی سے بھر دیا۔

ترجمہ چھوٹے کتبہ کا جو پہاڑی کی چوٹی پر ہے

دشمن کی سی نفرت سے گناہ گار آدمیوں پر

ہم نے حملہ کیا آگے کو دوڑا کر اپنے گھوڑوں کو ان کو پاؤں کے نیچے روند ڈالا

ترجمہ کتبہ کا جو نقب الحجر کے دروازہ پر ہے

رہتے تھے اس محل میں اب (ابو) محارب اور بحشہ جب کہ یہ ابتداء میں تیار ہوا رہتے تھے اس میں خوشی سے فرزندانہ اطاعت کے ساتھ نواس اور ونیا حاکم اعلی حربحل مالک محل کا جس نے فیاضی سے بنایا کارواں سرائے اور کنواں۔۔۔۔ اس نے نیز بنایا عبادت خانہ فوارہ اور تالاب اور بنایا زمانہ اپنے عہد میں۔

ریورنڈ فاسٹر نے اس بڑے کتبہ کے نیچے جو کتبہ ہے اس میں عک کا نام دیکھ کر اس کتبہ کا زمانہ قرار دینے پر توجہ کی اور کہا کہ عک بیٹا تھا عدنان کا اور مسلمانوں کی حدیث کے مطابق جو ام سلمہ سے منقول ہے عدنان حضرت اسماعیل کی چوتھی پشت میں تھا پس اس

حساب سے کہ ایک پشت کا زمانہ تیس برس لگایا جاوے تو عک یعقوب کی زندگی کے اس زمانہ میں ہوگا جب کہ یوسف بھی موجود تھے اور قریب پچاس برس کے قبل اس وقت کے جب کہ مصر اور اس کے قرب وجوار کے ملکوں میں قحط ہوا تھا۔

ریورنڈ فاسٹر لکھتے ہیں کہ یوسف کی تاریخ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اسماعیل کی اولاد مختلف فرقوں اور قوموں میں منقسم ہو کر پھیل گئی تھی اور نویری کے جغرافیہ میں جو دوسرا کتبہ ہے اس سے قحط کا حال معلوم ہوتا ہے جس میں وہ قوم تباہ ہوگئی ان وجوہ سے وہ ان کتبوں کو یعقوب علیہ السلام کے زمانہ کا قرار دیتے ہیں۔

جب کہ ریورنڈ فاسٹر نے یہ تسلیم کرلیا کہ یہ کتبے قوم عاد کے ہیں جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور ان کا زمانہ انہوں نے حضرت یعقوب کے زمانے کے مطابق قرار دیا تو اب وہ قرآن مجید پر گویا دو اعتراض کرتے ہیں ایک یہ کہ قوم عاد کا نوح کی قوم کے بعد ہونا جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ

" اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح"

صحیح نہیں ہے دوسرے یہ کہ کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے بادشاہوں کے قوانین پر عمل کرتے تھے اور حضرت ھود کا ان لوگوں میں جانا جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ

" والیٰ عاد اخاھم ھودا"

ثابت نہیں ہوتا۔

مگر یہ دونوں اعتراض جیسے عجیب ہیں ویسے غلط بھی ہیں اول یہ کہ قوم عاد اولیٰ جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ یمن یا حضرت موت میں نہیں بستی تھی یمن و حضرت موت و حویلہ میں خود حضرت ھود کی اولاد بستی تھی اور حضر موت اور حویلہ اور سبا جن کے نام سے اب تک وہ

مقامات مشہور ہیں حضرت کے پوتے تھے اور یقطان ابن عیبر یعنی ھود وہاں جا کر بسے تھے پس انہوں نے جوان کتبوں کو عاد کی قوم کے کتبے قرار دیے ہیں یہ محض غلطی ہے۔

دوسرے یہ کہ جو زمانہ ان کتبوں کا ریورنڈ فاسٹر نے قرار دیا ہے وہ بھی غلط ہے ام سلمہ کی روایت جس کی بناء پر ریورنڈ فاسٹر نے عدنان کو حضرت اسماعیل کی چوتھی پشت میں قرار دیا ہے وہ روایت ہی غلط اور محض نا معتبر و بے سند ہے صحیح نسب نامہ کے بموجب جو برخیا گا تب وحی ارمیا نبی نے لکھا ہے (دیکھو خطبات احمدیہ) اس کے مطابق عدنان باپ معدو عک کا اکتالیسویں پشت میں حضرت ابراہیم سے تھا حضرت ابراہیم بموجب حساب مندرجہ توریت کے 2008 دنیوی میں پیدا ہوئے تھے پس جو حساب نسلوں کے پیدا ہونے کا ہے اس حساب سے عک قریباً 3400 دنیوی میں ہوگا یعنی چودہ سو برس بعد حضرت ابراہیم کے اور کتبہ میں عک پر فتح یابی نہیں لکھی ہے بلکہ بنی عک پر لکھی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عک کی بھی کئی پشت کے بعد کا ہے۔

نویری کے دوسرے کتبہ کو جس میں قحط کا ذکر ہے مسٹر فاسٹر پہلے کتبہ کا تتمہ سمجھتے ہیں تا کہ پہلے کتبہ کو بھی یعقوب و یوسف کے زمانے کا قرار دیں مگر وہ اصلی کتبہ دستیاب نہیں ہوا اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں تھا نہ یہ معلوم ہے کہ کس خط میں تھا پس کوئی دلیل نہیں ہے کہ نویری کے پہلے اور دوسرے کتبہ کو ایک زمانہ کا قرار دیا جائے۔

کچھ عجب نہیں کہ یہ کتبے قوم حمیر کے ہوں جس میں سلاطین نام دار اور باوقار گذرے ہیں یقطان ابن عیبر یا ابن ھود یمن میں آباد ہوا اس کا بیٹا سبا تھا اور سبا کا بیٹا حمیر اس کی اولاد میں بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں اور اسی کی اولاد کی سکونت حضرموت میں تھی جو اس کے ایک بیٹے کے نام سے مشہور ہے پس یہ کتبے قوم حمیر کے ہو سکتے ہیں نہ قوم عاد کے اس کی تائید اس کتبہ سے ہوتی ہے جس کا ذکر ابن ھشام نے کیا ہے جو اطراف یمن کی ایک قبر میں

سے نکلا ہے کیونکہ اس کے شروع میں لکھا ہے

" باسمک اللھم اله حمیر "

اور یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس سے قوم حمیر کے کتبہ ہونے سے انکار ہی نہیں ہوسکتا۔

حصن غراب کے چھوٹے کتبہ میں بلا شبہ بنی عک پر فتح پانے کا ذکر ہے عک جو حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھا اور جن کا مسکن حجاز میں تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اولاد یعنی بنی عک نے کسی زمانہ میں یمن پر یا حضرت موت پر حملہ کیا ہوگا زمانہ کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس زمانہ میں ہوا جس زمانہ میں کہ بخت نصر نے مصر اور عرب پر حملے کیے تھے اس حملہ میں بنی عک کو شکست ہوئی ہوگی جس کا ذکر اس کتبہ میں ہے۔

حصن غراب کے بڑے کتبہ سے جو اب موجود ہے نہایت استحکام سے قرآن مجید کے اس تاریخی واقعہ کا ثبوت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عرب میں ھود پیغمبر کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا تھا اور بعث ونشر کے عقاید انہوں نے تعلیم کیے تھے اور جو کہ قوم حمیر اور تمام بادشاہان یمن حضرت ھود کی اولاد میں تھے ان کے بادشاہوں نے ان تمام عقاید کو جو حضرت ھود نے تعلیم کیے تھے اپنی کتابوں میں لکھے تھے جس پر وہ یقین کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ ان تمام عقائد کے ساتھ آخر کو ان لوگوں میں بت پرستی بھی پھیل گئی تھی جس کو محمد رسول اللہ نبی آخر الزمان نے تمام جزیرہ عرب سے بلکہ دنیا کے بہت بڑے حصہ سے معدوم کیا اور خدا کی وحدانیت کے اصول کو ایسی وضاحت اور عمدگی سے بتا دیا جس سے امید ہے کہ ان کے پیروؤں میں بت پرستی قائم ہونی ممتنعات عقلی سے ہے اور یہی ایک امر ہے جس کے سبب ابراہیم خلیل اللہ کے پوتے اور عبداللہ کے بیٹے نے خاتم الانبیاء ہونے کا تاج پہنا اور اس کے دین نے

" الیوم اکملت لکم دینکم واتمت علیکم نعمتی ورضیت لکم

الاسلام دینا"

کا خطاب حاصل کیا

وصلی اللہ تعالیٰ علی جدی محمد رسول اللہ وعلیٰ آلہ وانا منہم اجمعین

اب ہم کو اس عذاب کا بیان کرنا باقی ہے جو قوم عاد پر نازل ہوا تھا اور جس کا ذکر ان آیتوں میں آیا ہے جو حاشیہ پر مندرج ہیں 1ہ وہ عذاب آندھی تھی جو اس ریگستان کے رہنے

1ہ **فارسلنا علیھم ریحا صرصراً فی ایام نحسات لنذیقھم عذاب الخزی فی الحیواۃ الدنیا ولعذاب الاخرہ اخزی و ھم لا ینصرون 41 صورہ فصلت15**

واما عادفا ھلکوا بریح صرصر عاتیۃ سخرھا علیھم سبع لیال و ثمانیۃ ایام حسوما فتری القوم فیھا صرعی کانھم اعجاز نخل خاویۃ 29 سورۃ الحاقہ6,7

فان اعرضو فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود 41 فصلت12

وفی عاد اذا ارسلنا علھم الیریح العقیم مانذر من شی اتت علیہ الا جعلۃ کالرمیم 51سورہ زاریات41,42

وانہ اھلک عاد الاولیٰ 53سورۃ النجم51

" کذبت عاد فکیف کان عذابی و نذر انا ارسلنا علیھم صر صرا فی یوم نحس مستمر تنزع الناس کانھا اعجاز نخل منقعر 54 سورۃ القمر18,19,20."

واذکراخا عاد اذا انذر قومه بالا حقاف وقد خلت النذر من بین یدیه ومن خلفه الا تعبدوا الا الله انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم قالو اجتنا لتا فکنا عن آلھتنا فاتنا بماتعدنا ان کنت من الصادقین قال انما العلم عند الله ابلغکم ما ارسلت به ولکنی اراکم قوما تجھلون. فلما راوہ عارضا مستقبل اودیتھم قالوا ھذا عارض مطرنا بل ھو ما استعجلتم به ریح فیھا عذاب الیم تدمرہ کل شی بامر ربھا فاصبحوا الا یری الامساکنھم کذالک نجزی المجرمین 46 سورہ احقاف100 لغایت24

والوں پر نازل ہوئی تھی آٹھ دن اور سات رات برابر آندھی رہی اور بخوبی یہ بات خیال آ سکتی ہے کہ جب ایسی آندھی ریگستان کے ملک میں چلی جو گرم ملک تھا اور جس میں نہایت سخت لو کی بھی کیفیت ہوگی تو وہاں کے رہنے والوں کا کیا حال ہوا ہوگا بے شک ان کی لاشیں ایسی ہی پڑھی ہوں گی کہ گویا درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑے ہیں جس کی تشبیہہ خدا نے دی ہے

کانھم اعجاز نخل منقعر کانھم اعجاز نخل خاویه

لُو کی گرمی کے مارے ان کے بدن بھگڑی ہو کر بکس گئے ہوں گے جیسے نوزدہ انسان کا بدن ہو جاتا ہے جس کی تشبیہہ خدا نے اس طرح پر دی ہے کہ

" ما نذر من شئی اتت علیه الا جعلته کالرمیم"

ارفسکد بن سام کی اولاد میں حضرت ھود تھے اور آرام بن سام کی اولاد میں عاد اور قوم عاد تھی اسی وجہ سے خدا نے حضرت ھود کو قوم عاد کا بھائی کہا حضرت ھود احقاف میں گئے جہاں قوم عاد بستی تھی اور بت پرستی کرتی تھی تین بت تھے جن کو وہ پوجتے تھے حضرت ھود نے ان کو بت پرستی سے منع کیا اور کہا کہ سوائے خدا کے اور کسی کی عبادت مت کرو مجھ کو خوف ہے

تم پر کسی دن سخت عذاب آوے گا ان لوگوں نے کہا کہ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمارے خداؤں کو ہم سے چھڑا دو اور جس عذاب سے تم ڈراتے ہو اس کو لاؤ اگر تم سچے ہو حضرت ھود نے کہا اس کا علم تو خدا کو ہے میں تو خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیتا ہوں ایک دن انہوں نے دیکھا کہ ان کے ریگستان کی طرف کچھ گھٹا سی چلی آتی ہے انہوں نے خیال کیا بادل ہے جو خوب برسے گا مگر وہ نہایت سخت آندھی تھی جس نے سب چیز کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔

یہ تو قصہ قوم عاد کے عذاب کا ہے مگر جو بحث کہ اس واقع پر اور مثل اس کے دیگر واقعات ارضی وسماوی پر ہوسکتی ہے جن کو قرآن مجید میں کسی قوم کی معصیت کے سبب سے اس واقعہ کا بطور عذاب کے اس قوم پر نازل ہونا بیان ہوا ہے غور طلب ہے آندھی اور طوفان، پہاڑوں کی آتش فشانی ان سے ملکوں کا اور قوموں کا برباد ہونا زمین کا دھنس جانا قحط کا پڑنا کسی قسم کے حشرات کا زمین میں ہوا میں پیدا ہو جانا کسی قسم کے وباؤں کا آنا اور قوموں کا ہلاک ہونا سب امور طبعی ہیں جو ان کے اسباب جمع ہو جانے پر موافق قانون قدرت کے واقع ہوتے رہتے ہیں انسانوں کے گنہگار ہونے یا نہ ہونے سے فی الواقع اس کو کچھ تعلق نہیں ہے اگر چہ توریت میں اور دیگر صحف انبیا میں اس قسم کے ارضی وسماوی واقعات کا سبب انسانوں کے گناہ قرار دیے ہیں جو مثل ایک پوشیدہ بھید کے سمجھ سے خارج ہے اس سے ہم کو اس مقام پر بحث نہیں ہے مگر قرآن مجید میں بھی ایسے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بلاشبہ تعجب سے خالی نہیں ہے۔

اس قسم کے شبہے بلاشبہ انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ شبہات بے شک اصلی ہوتے ہیں کیوں کہ حوارث ارضی وسماوی حسب قانون قدرت واقع ہوتے ہیں ان کو انسانوں کے گناہوں سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور نہ انسانوں کے گناہ ان حوادث کے وقوع کا باعث ہوتے ہیں مگر ان شبہات کے پیدا ہونے کا منشاء یہ ہے کہ لوگ حقیقت نبوت اور اس

کی غایت کے سمجھنے میں پہلے غلطی کرتے ہیں اور پھر اس غلطی کی بناء پر اس شبہ کو قائم کرتے ہیں نبوت ہمیشہ فطرت کے تابع ہوتی ہے اس کا مقصد حقائق اشیاء کو علے ماھی علیہ بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی غایت تہذیب نفس ہوتی ہے پس جو امور کہ کسی قوم میں یا انسان کے خیال میں ایسے پائے جاتے ہیں جو موید تہذیب نفس کے ہیں گو کہ وہ مطابق حقائق اشیاء علی ماھی علیہ کے مذھوں تو انبیا اس سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو بلا لحاظ اس بات کے کہ وہ مطابق حقیقت اشیاء علی ماھی علیہ کے ہے یا نہیں بطور ایک امر مسلمہ مخاطب کے تسلیم کر کے لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک شخص بحث کرنے والا اپنے مخالف کے امر مسلمہ کو باوجودیکہ وہ اس کو صحیح نہ جانتا ہو تسلیم کر کے مخالف ہی کے امر مسلمہ سے مخالف کو ساکت کرنا چاہے پس ایسے موقع پر یہ سمجھنا کہ جو کچھ انبیاء نے تسلیم کیا یا اس کو اپنے مقصد کے لیے کام میں لائے اسی کے مطابق حقائق اشیاء بھی ہیں یہ پہلی غلطی ہے اور یہی غلطی باعث اس قسم کے شبہات کے پیدا ہونے کے ہوتی ہے۔ مثلاً مثلاً لوگ یقین کرتے تھے کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان پیدا کیے اسی کی عبادت کرو اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس پیغمبر کا بیان نسبت چھ دن میں آسمان و زمین کی پیدائش کے بطور بیان حقیقت اشیا ماھی علیہ کے ہے سخت غلطی ہے کیوں کہ اس پیغمبر نے اس قوم کے امر مسلمہ ہی کو تسلیم کر کے آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے کے استحقاق عبادت کو ثابت کیا ہے۔

انسان کی ابتدائی حالت کی فلاسفی پر غور کرنے سے جو وحشی قوموں کی حالت یا وحشی زمانہ سے شروع ہوتی ہے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کے دل میں اپنے سے زیادہ قوی و زبردست اشیا کو اپنے گرد دیکھ کر کسی وجود قوی کا جس کو انھوں نے خدا تسلیم کیا خیال آیا اسی کے ساتھ ساتھ اس کے خوش رکھنے کے لیے اسی کی عبادت کا بھی خیال ہوا ہے اور اسی کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ دنیا میں جو مصیبتیں آتی ہیں وہ اس کی خفگی کے اور

انسانوں کے افعال سے ناراض ہو جانے کے سبب آتی ہیں پس یہ خیال کہ تم آفات ارضی و سماوی انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ہوتی ہیں ایک ایسا خیال تھا جو تمام انسانوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا اور اس زمانہ میں بھی جاہل قوموں کے دلوں میں ویسی ہی مضبوطی سے جما ہوا ہے یہ خیال خواہ وہ حقیقت اشیاء علی ما ھی علیہ کے مطابق ہو یا نہ ہو ایک ایسا خیال ہے جو تہذیب نفس انسانی کا نہایت موید ہے اور بہ موجب اس اصول فطرت کے جس کے تابع انبیا علیہم السلام ہوتے ہیں ان کو ضرور تھا کہ اس امر مسلمہ کو تسلیم کر کے لوگوں کو تہذیب نفس کی ہدایت کریں پس قرآن مجید کے اس قسم کے بیانات کو جن میں حوادث ارضی و سماوی کو انسان کے گناہوں سے منسوب کیا ہے یہ سمجھنا کہ وہ ایک حقیقت اشیا علی ما ھی علیہ کا بیان ہے ان سمجھنے والوں کی غلطی ہے نہ قرآن مجید کی۔

یہ اصول جو میں نے بیان کیا ایک ایسا اصول ہے کہ اگر وہ ذہن میں رکھا جاوے تو بہت سے مقامات قرآن مجید کی اصلی حقیقت منکشف ہوتی ہے مگر یہ اصول ایسا نہیں ہے جس کو میں نے ایجاد کیا ہو اور نبوت کو ماتحت فطرت قرار دیا ہو بلکہ اور محققین علماء کی بھی یہی رائے ہے جس کا بیان بہت مختظر طور پر ''ستۃ ایام'' کے بیان میں گذرا ہے مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات الہیہ میں اس اصول کو زیادہ تر وضاحت سے بیان کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے اس کا مطلب بالکل اسی کے مطابق ہے جو میں نے بیان کیا گو کہ دونوں کے طرز ادا اور طریق تقریر اپنی اپنی طرز پر جداگانہ مذاق سے ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

اعلم ان النبوۃ من تحت الفطرۃ کما ان الانسان قد یدخل فی صمیم قلبہ و جذر نفسہ علوم و ادراکات علیھا تبتنی ما یقاض علیہ من رویا فیری الامور مشبحہ بما اخترتہ دون غیرھا کذالک کل قوم و اقلیم

لهم فطره فطروا عليها امورهم كلها كاستقباح الذبح والقول بالقدم فطرة
فطر الهنود عليها وجواز الذبح والقول بحدوث العالم فطرة فطر عليها
بنو سام من العرب و الفارس فانما يجى النبى يتامل فيها عند هم من
الاعتقاد العمل فما كان موافقا لتهذيب النفس يثبة لهم ويرشدهم اليه وما
كان يخالف تهذيب النفس فانه ينها هم عنه وقد يحصل بعض الا ختلاف
من قبل اختلاف نزول الجود كما ذكرنا فى توجه المبحوس الى القوى
الفلكية وتوجهه الحنفاء الى الملاء الا على لا غير و كما ذكرنا فى عموم
بعثت النبى و خاتمته بخلاف سائر النبوة فالنبوة سويته و تهذيبه وجعله
كاحسن ما ينبغى سواء كان ذالک الشى شمعا اوطينا والفطرة والملة
بمنزلة المعاد كالشمع والطين فلا تعجب باختلاف احوال الانبياء عليهم
السلام واختلاف امورهم عما يتعلق بالمادة فاصل النبوة تهذيب النفس
باعتقاد تعظم الله والتوجه اليه و كسب ما ينجى من عذاب الله فى الدنيا
والاخره واما مجازات السيئة ففى الدورة الاولى كان لا يتوقف على
معرفة البعث بعد الموت ولا الملئكة وفى الدورة الاخرى توقف على
ايمان بالله بالصفات التعظميه والملائكه وكتبه ورسله ولايمان بالبعث
بعد الموت اما مسئلة قدم العالم و حدوثه و مسئلة التناسخ و مسئلة
تحريم الذبع وحله و مسئلة الصاف الله التى من التجده والتنقل
والصفات والمحدثة كالروية والنزول والارادة المتجددة والبداء وغير
ذالک فانها كلها من الفطرة والمادة ليست ببحث عن ذالک بالامالة
(تفهيمات)

یعنی یہ بات جان لینی چاہیے کہ نبوت فطرت کے ماتحت ہے جیسا کہ انسان کے کبھی دل میں بہت سے علوم اور باتیں جم کر بیٹھ جاتی ہیں اورانہی پر مبنی ہوتی ہیں وہ چیزیں جو اس پر اس کے رویا میں فائض ہوتی ہیں پھر وہ ان چیزوں کی صورتوں کو دیکھتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے اور نہ اس کے سوا اور کسی کو ایسے ہی ہر ایک قوم اور اقلیم کی ایک فطرت ہے جس پر اس کی سب باتیں پیدا کی گئی ہیں جیسے جانور کے ذبح کرنے کو برا جاننا اور عالم کو قدیم کہنا یہ ایک فطرت ہے کہ فطرت ھنود کی اس پر ہے اور ذبح جانور کو جائز ماننا اور عالم کو حادث کہنا فطرت ہے جس پر بنی سام یعنی عرب اور فارس مخلوق ہوئے ہیں نبی جو آیا کرتا ہے وہ ان کے علوم اور اعتقادات اور اعمال میں تامل کیا کرتا ہے جو ان میں سے موافق تہذیب نفس کے ہوتا ہے اس کو ثابت رکھتا ہے اور ان کو وہی راہ چلاتا ہے اور جو کہ تہذیب نفس کے خلاف ہو اس سے منع کرتا ہے اور کبھی کچھ اختلاف ہو جاتا ہے بوجہ اختلاف فیض الٰہی جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے بیچ معاملہ متوجہ ہونے مجوس کے قوائے فلکیہ کی جانب اور متوجہ ہوئے حنفا کے ملاء اعلیٰ کی جانب اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے بعثت نبی کے عام ہونے اور خاتم النبیین کے بیان میں بخلاف اور نبیوں کے پس نبوت اس فطرت کا درست اور آراستہ کرتا ہے اور اس کو درست کرنا جس قدر اس کا عمدہ تر ہونا ممکن ہے خواہ وہ شے موم ہو خواہ گارا فطرت مذہب کے لیے بمنزلہ مادہ کے ہے مثل موم اور گوندھی مٹی کے پس تعجب نہ کرنا چاہیے اختلاف احوال دنیا سے اور ان کے اس اختلاف سے جو ان امور سے متعلق ہیں جو بمنزلہ مادہ کے ہے پس اصل نبوت تہذیب نفس کی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اعتقاد سے اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے اور ان امور کے کرنے سے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے دنیا اور آخرت میں بچاوے برائی کا بدلہ پہلے زمانہ میں اس پر موقوف نہ تھا کہ مرنے کے بعد اٹھنے کو جانیں اور پچھلے زمانہ میں اس پر موقوف ہے کہ اللہ پر ایمان لاویں اور اس کی صفات تعظیمیہ پر اور

فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھنے پر ایمان لاویں اور مسئلہ قدم عالم اور حدوث عالم اور مسئلہ تناسخ اور مسئلہ حرام ہونے ذبح جانور کا اور مسئلہ صفات کا جو کہ بدلتے رہتے ہیں اور صفات جو کہ حادث ہیں جیسے دیکھنا اور اترنا اور نیا ارادہ اور ایسے ہی اور صفات پس یہ مسئلہ فطرتی ہے اور بمنزلہ مادہ کے ہے ایسے مسائل سے اصلی طور پر نبی بحث کرتا ہے۔

یہ بیان شاہ ولی اللہ صاحب کا ہماری دلیل سے بالکل مطابق ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری دلیل کا ماخذ بھی بیان ہے جو نہایت عالی دماغی اور بلاخوف نومتہ لایم کے شاہ صاحب نے فرمایا ہے۔

قوم ثمود

ثمود جس کے نام سے قوم ثمود مشہور ہے جثر بن آرام بن سام بن نوح کا بیٹا ہے اور عاد اولیٰ اور ھود کا ھمعصر ہے حضرت صالح پیغمبر اس کی چھٹی پشت میں ہیں اور اسی لیے زمانہ حضرت صالح کا اخیر انیسویں یا شروع بیسویں صدی دنیاوی میں اور قریباً سو برس پیشتر حضرت ابراہیم سے پایا جاتا ہے۔

قوم ثمود الحجر میں آباد تھی اور پہاڑ کو کھود کر اس میں گھر بنائے تھے تقدیم البلدان میں اسماعیل ابوالفلدا نے ابن حوقل کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ان پہاڑوں میں گیا تھا اور اس نے ان مکانات کو دیکھا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنائے تھے افسوس ہے کہ سلاطین اسلامیہ نے اس طرح پر عرب کے قدیم حالات کی تحقیقات نہیں کی، کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جزیرہ عرب میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہوں گی جن سے پرانے تاریخی حالات کی صحت پر بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

عاد اولیٰ حضرت نوح سے پانچویں پشت میں تھا اور عاد اور ثمود دونوں آپس میں بھائی تھے قوم عاد کے برباد ہونے کے بعد قوم ثمود نے ترقی کی تھی جس کی نسبت خدا نے فرمایا

" واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد"

اور جو کہ قوم ثمود نے قوم عاد کے بعد ترقی کی تھی اسی سبب سے ثمود کو عاد ثانی کہتے ہیں جیسے کہ نوح کو آدم ثانی۔

حضرت صالح قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے جو واقعات کہ ان کے زمانہ نبوت میں گذرے ان کا بیان مندرجہ حسب ذیل آیتوں میں ہے۔

والیٰ ثمود اخاهم صالحا قال یا قوم ابعدوا الله سالکم من اله غیره قد جاء تکم بینة من ربکم هذه ناقة الله لکم آیة فذروها تاکل فی ارض الله ولا تمسوها بسوء فیاخذکم عذاب الیم واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد وبواکم فی الارض تتخذون من سهونها فصوراً وتنتهون الجبال بیوتاً فاذکروا الاء الله ولا تعنوا فی الارض مفسدین. فعقروا النافة وعتوا عن امر ربهم واخذتهم الرجفة فاصبحوا فی دارهم جاثمین (الاعراف)

قال یاقوم ارائیتهم ان کنت علی بینة من ربی واتانی منه رحمة فمن ینصر نی من الله ان عصیة فما تزیدونی غیر تخسیر ویاقوم هذه ناقة الله لکهم آیة فذروها تاکل فی ارض الله ولا تمسوها بسوء فیاخذکم عذاب قریب فعقروها فقال تمتعوا فی دارکم ثلثه ایام ذالک وعد غیر مکذوب فلما جاء امرنا نجینا صالحا والذین آمنوا معه برحمة مناومن خذی یومئذان ربک هوا لقوی العزیز واخذ الذین ظلموا الصیحه فاصبحوا فی دارهم جاثمین (11هود66,70)

قـالـو انـمـا انـت من المسحرين ما انت الا بشر مثلنا فات بايات ان كـنـت مـن الـصـدقيـن قـال هذا ناقة لها شرب ولكم شرب يوم معلوم ولا تـمسـوهـا بسـوء فيـاخـذكـم عـذاب يوم عظيم فعقروها فاصبحوا نادمين فـاخـذهـم الـعـذاب ان فـى ذالك لاية ومـا كـان اكثـر هـم مـوقـنيـن (26الشعراء153,158)

واما ثـمود فهدينا هم فاستحبو العمى على الهدى فاخذتهم صاعقة العذاب الهون بما كانوا يكسبون (41 فصلت160)

انـا مرسلوا الناقة فتنة لهم فارتقيهم واصطبروا نئبهم ان الماء قسمة بيـنهم كل شرب مستضر فنادوا صاحبهم فتعاطى فعقر فكيف كان عذابى و نـذر انـا ارسلنا عليهم صيحة واحدة فكانوا كهشيم المحتظر (54سورة القمر27,21).

فاما ثمودا فاهلكوا بالطاغيه (9الحاقه 6)

كـذبـت ثـمود بطغوها اذ نبعث اشقها فقال لهم رسول الله ناقة الله وسـقيـاهـا فكذبوه فعقروها فدمدم عليهم ربهم بذنبهم فسواها (91سورة الشمس 14-11)

ان آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت صالح نے ان لوگوں سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو خدا کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ان لوگوں نے کہا کہ تم تو سحر زدہ ہو تم تو ہم ہی جیسے ایک آدمی ہو اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ حضرت صالح نے کہا کہ تمہارے پاس ایک دلیل تمہارے پروردگار کے پاس سے آتی ہے یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے اس کو چھوڑ دو کہ خدا کی زمین پر چرتی پھرے باقی رہا پانی ایک دن اس کو پی

لینے دیا کرو اور ایک دن تم لے لیا کرو اور اس کو کچھ برائی مت پہنچاؤ نہیں تو تم کو دکھ دینے والا عذاب پکڑ لے گا وہ لوگ اونٹنی سے اتنے تنگ آ گئے انہوں نے اس کو ذبح کر ڈالا یا اس کی کونچیں کاٹ دیں کہ مرگئی۔ حضرت ھود نے کہا کہ تم تین دن اپنی جگہ میں چین کر لو عذاب آنے کا وعدہ نہیں ٹلنے کا اس کے بعد ان پر یہ خدا کا عذاب پڑا کہ بڑی گڑ گڑ ھٹ سے اور حد سے زیادہ بھونچال آیا اور وہ اپنے رہنے کی جگہ میں گھٹنوں کے بل گر کر مر گئے۔

قرآن مجید میں تو قصہ اسی قدر ہے مگر ہمارے مفسرین نے اس قصہ کو ایک تودہ طوفان بنا دیا ہے جس کے لیے کوئی معتبر سند بھی نہیں ہے انہوں نے قرآن مجید کے ان لفظوں کو کہ

"فات بایة ان کنت من الصادقین"

اور ان لفظوں کو کہ

"قد جائتکم بینة من ربکم"

دیکھ کر یہ تصور کیا کہ وہ اونٹنی کسی عجیب و معجز طریقہ سے پیدا ہوئی ہو گی کچھ عجب نہیں کہ پہلے سے عرب میں اس اونٹنی کی نسبت عجیب باتیں مشہور ہوں گی مفسروں نے ان افواہی باتوں کو قرآن مجید کے ان الفاظ کے خیال سے سچ سمجھا اور تفسیروں میں لکھ دیا حالاں کہ اس کے لیے کوئی معتبر سند نہیں ہے انہوں نے لکھا کہ جب حضرت صالح نے بتوں کی پرستش سے ان کو منع کیا اور خدائے واحد کی پرستش کی ہدایت کی تو قوم ثمود نے جس میں کہ خود حضرت صالح نے بتوں کی پرستش سے ان کو منع کیا اور خدائے واحد کی پرستش کی ہدایت کی تو قوم ثمود نے جس میں کہ خود حضرت صالح بھی تھے معجزہ طلب کیا حضرت صالح نے کہا کہ تم کیا چاہتے ہو انہوں نے کہا کہ تم ہمارے تیوہار کے دن ہمارے ساتھ چلو ہم اپنے بتوں کو نکالیں گے تم خدا سے معجزہ مانگنا ہم اپنے بتوں سے مانگیں گے اگر تمہاری دعا کا اثر ہوا تو تم

ہمارے مرید ہو جانا اس اقرار پر دونوں شہر کے باہر گئے انہوں نے اپنے بتوں سے کچھ دعا مانگی مگر کچھ نہ ہوا حضرت صالح سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس پہاڑ کے ٹکڑے میں سے ایک اونٹنی نکلے حضرت صالح نے ان سے اقرار لیا کہ اگر نکلے تو تم ایمان لے آؤ گے سب نے اقرار کیا جب بات پکی ہو گئی تو حضرت صالح نے دو رکعت نماز پڑھی اور خدا سے دعا مانگنی شروع کی وہ پہاڑ کا ٹکڑا پھولنا شروع ہوا اور حاملہ کے پیٹ کی مانند پھول گیا پھر پھٹا اور اس میں سے نہایت بڑی موٹی مشٹنڈی اونٹنی نکلی اور اسی وقت اس نے اپنے برابر کا بچہ بھی دے دیا۔

اس اونٹنی کا پیدا ہونا ہی عجیب طرح پر بیاں نہیں کیا بلکہ اس کی عجیب عجیب صفات بھی بیان کی ہیں لکھا ہے کہ جہاں قوم ثمود رہتی تھی وہاں پانی بہت کم تھا اور ٹھیرا تھا کہ ایک دن وہ پانی اونٹنی پیا کرے اور ایک دن وہ لوگ لیا کریں اونٹنی میں یہ عجیب صفت تھی کہ وہ سارا پانی جس کو تمام لوگ پی سکتے تھے سڑپ جاتی تھی اور پہاڑ پر چلی جاتی تھی پھر وہاں سے آتی تھی اور لوگ اس کا دودھ دوھتے تھے اور اس قدر کثرت سے دودھ ہوتا تھا کہ تمام قوم کے لیے بجائے پانی کے کافی ہوتا تھا۔

حضرت صالح نے کہا کہ تمہارے شہر میں ایک لڑکا پیدا ہونے کو ہے کہ تمہاری موت اس کے ہاتھ سے ہو گی انہوں نے یہ بات سن کر جو لڑکا پیدا ہوا اس کو مار ڈالا یہاں تک کہ نو لڑکوں کو مارا جب دسواں لڑکا پیدا ہوا کہا کہ بھئی اب تم ہم نہ ماریں گے مگر بدبختی سے یہ وہی لڑکا تھا جس کے ہاتھ سے ان کی موت ہونے والی تھی۔

بہر حال وہ لڑکا بڑا ہوا جوان ہوا یاروں میں بیٹھنے لگا ایک دن وہ اپنے یاروں کی مجلس میں تھا اور سب نے شراب پینے کا ارادہ کیا اور شراب میں پانی ملانے کو پانی چاہا مگر وہ دن اونٹنی کے پانی پینے کا تھا وہ سب پانی پینے کا تھا وہ سب پانی پی گئی ایک قطرہ شراب میں ملانے

کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔

اس جوان کو نہایت غصہ آیا وہ پہاڑ میں گیا اور اونٹنی کو لایا جب آئی تو اس کو ذبح کر ڈالا یا کونچیں کاٹ ڈالیں کہ وہ مر گئی پھر ان میں تین دن میں عذاب آیا پہلے دن سب کے بدن سرخ ہو گئے دوسرے دن زرد ہو گئے تیسرے دن کالے ہو گئے اس پر بھی نہ مرے تب بھونچال آیا اور اس کے سبب سے مر گئے اس قصہ کا لغو اور مہمل ہونا خود اس قصہ سے ظاہر ہوتا ہے مفسرین نے اس قصہ کو اگرچہ لکھا ہے مگر چنداں اعتبار نہیں کیا بعضوں نے تو ''ردی'' کر کر لکھا ہے کہ یہ لفظ خود قصہ کے ضعیف اور بے سند ہونے پر دلالت کرتا ہے صاحب تفسیر کبیر نے لکھا ہے کہ:

اعلم ان القرآن قد دل علیٰ ان فیھا آیة فاما ذکر انھا کانت آیة من ای الوجوہ فھو غیر مذکور والعلم حاصل بانھا کانت معجزة من وجه الا محالة (تفسیر کبیر جلد3صفحه261)

یعنی قرآن سے پایا جاتا ہے کہ اس اونٹنی میں کچھ نہ کچھ ایک نشانی تھی مگر یہ بات کہ وہ کیا نشانی تھی اور کس طرح پر تھی بیان نہیں ہوئی مگر اتنی بات معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے معجزہ تھی۔

مگر میں کہتا ہوں کہ جس وجہ سے صاحب تفسیر کبیر نے اس کو معجزہ مافوق الفطرت قرار دیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔

ثمود کی قوم نے بتوں کی پرستش اختیار کی تھی اور کئی نسلیں ان کی بت پرستی میں گذر گئی تھیں جب حضرت صالح نے ایسے خدائے واحد کی پرستش کی ہدایت کی جس کی نہ کوئی صورت ہے، نہ شکل ہے، نہ اس کا وجود دکھائی دیتا ہے، نہ کوئی اس کے پاس جا کر اسے دیکھ سکتا ہے صرف خیال ہی خیال میں وہ اور خیال میں بھی بیچون وبیچگوں میرا حیز ومکانا ور شکل و

صورت و جہت و مثال سے تو ایک فطرتی بات تھی کہ ایک پشتینی بت پرست کہتے کہ اگر تم سچے ہو تو اس کی نشانی لاؤ جس کے ذریعہ سے وہ اس بن دیکھے خدا کی پرستش کریں کیوں کہ بغیر کسی ظاھری وجود کے ان کے دل کو تسلی نہیں ہو سکتی تھی انہوں نے ایک اونٹنی کو بطور سانڈ کے چھوڑ دیا کہ یہ خدا کی اونٹنی ہے اور تمہارے لیے خدا کی نشانی ہے اس کو کسی قسم کی ایذا مت پہنچاؤ اور چرنے پھرنے دو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح پر جانوروں کے چھوڑنے کی قدیم رسم تھی عرب متعدد طرح پر سانڈ چھوڑتے تھے اونٹنی جب پانچ بچے جن لیتی تھی تو اس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور جہاں وہ چرتی چرنے دیتے تھے اور پانی پینے سے نہ ھکاتے تھے بیماری سے اچھا ہونے یا سفر سے آنے پر یا دس برس خدمت لیے کے بعد اونٹ کو بتوں کے نام پر بطور سانڈ کے چھوڑتے تھے جو بحیرہ اور سائبہ اور حام کے نام سے مشہور ہیں حضرت صالح نے بھی اسی طرح اس اونٹنی کو چھوڑا صرف اتنا فرق کیا کہ کسی بت یا کسی مخلوق کے نام پر نہیں چھوڑا بلکہ خدا کے نام پر چھوڑا۔

آیت کے لفظ کے معنی معجزہ کے نہیں ہیں اور اس لیے مصنف تفسیر کبیر کا یہ لکھنا کہ

” **والعلم حاصل بانها کانت معجزة بوجه مالا محالة**“

صحیح نہیں ہے آیت کے معنی نشانی کے ہیں محمد بن ابی بکر الرازی نے لغات قرآن میں لکھا ہے کہ

الاية العلامة و منه قوله تعالیٰ ان آية ملكه،

وقوله تعالیٰ، وجعلنا الليل والنهار آيتين، اى علامتين،

اس آیت کے لفظ سے یہ قرار دینا کہ وہ اونٹنی یا سانڈھنی ایک معجزہ تھی جو خلاف قانون قدرت یا موفوق الفطرت پیدا ہوئی تھی قابل تسلیم نہیں ہے۔

دوسرا لفظ ان آیتوں میں

بینة من ربکم

کا ہے ان الفاظ کا جو قرآن مجید میں ہیں ترجمہ یہ ہے کہ کہا (صالح) نے اے میری قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں تمہارے لیے کوئی خدا سوائے اس کے بے شک آئی ہے تمہارے پاس دلیل تمہارے پروردگار سے یہ اونٹنی اللہ کی تمہارے لیے نشانی ہے اگر یہ کہا جاوے کہ اونٹنی ہی وہ دلیل تھی تو الفاظ ''لکم آیۃ'' بیکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ اس حالت میں صرف اتنا کہنا کافی تھا کہ

قد جاء تکم بینة من ربکم هذه ناقة الله فذروها تاکل الخ

دوسرے یہ کہ خدا کی تمام مخلوقات وہ کسی طرح پر پیدا ہو خدا پر دلیل ہے اونٹنی کے پیدا ہونے سے گو کہ وہ کسی عجیب طرح سے پیدا ہوئی ہو خدا پر دلیل ہونے کی کچھ خصوصیت نہیں ہو سکتی پس صاف ظاہر ہے کہ

قد جاء تکم بینة من ربکم

جدا جملہ ہے اور اس سے وہ دلیل مراد ہے جو انبیاء اپنی امت کو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید اور اس کے استحقاق عبادت کی نسبت بتاتے ہیں اور

هذه ناقة الله لکهم آیة الی اخره جمله مستانفه هے

اس کو بینۃ من ربکم سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ اس کو بینۃ من ربکم سے تعلق ہے تو بھی اس سے کوئی نتیجہ سوائے اس کے نہیں نکلتا کہ حضرت صالح نے اس اونٹنی کو جس طرح ایک نشانی بتایا تھا اسی طرح اور اسی مقصد سے اس کو دلیل یا گواہ بھی کہا تھا۔ بینۃ کے لفظ سے اس سانڈھنی کا معجزہ ہونا اور خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت پیدا ہونا کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام قصہ حضرت صالح کا بیان کیا اور جو بات سب سے مقدم اور سب

سے زیادہ عجیب تھی کہ پہاڑ کو فی الفور اونٹنی کا حمل رہا اور وہ مثل حاملہ کے پیٹ کے پھولنا شروع ہوا اور شق ہو گیا اور اونٹنی پلی پلائی ساٹھ گز چوڑی اور معلوم نہیں کس قدر لمبی سنڈ مسنڈ اس میں سے پیدا ہوئی اور پیدا پیدا ہوتے ہی اپنی برابر کا بچہ جنا اور قدرتی مسئلہ المظر وف المرمن الظرف والجزا اقصر من الکل کو بھی باطل کر دیا اس کا بیان بالکل چھوڑ دیا اور مفسرین کو اس کا الہام کیا کیوں کہ انہوں نے بغیر غور و فکر اور بغیر کسی معتبر سند کے اس قصہ کو لکھا ہے جو بغیر الہام کے اور کسی طرح لکھا نہیں جا سکتا تھا افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے ایسے ہی لغو بے معنی قصوں کو قرآن مجید کی تفسیروں میں داخل کر کے مسائل مستحکم اسلام کو مضحکہ اطفال بنایا ہے اور اس کے نور عالم افروز کو لغویات کے گرد و غبار سے دھندلا کر دیا ہے خدا ان پر رحم کرے آمین۔

جب کہ ان لوگوں نے اس سانڈھنی کو مار ڈالا اور کفر و بت پرستی کو نہ چھوڑا تو حضرت صالح نے فرمایا کہ تم تین دن اور چین کر لو پھر تم پر خدا کا عذاب ضرور آوے گا اعداد جو ایسے مقام پر بیان ہوتے ہیں ان سے وہی عدد مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک زمانہ مراد ہوتا ہے اس طرح کے کلام کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ چند روز تم اور چین کرو پھر تم پر عذاب ہوگا بدکار انسان کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ تین دن کا یا چند روز کا یہ عیش و آرام ہے اور اس سے اس کی تمام عمر مراد ہوتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کا حال معلوم ہوگا پس اسی طرح حضرت صالح نے فرمایا

تمتعوا فی دیارکم ثلثة ایام

جو امت کہ قوم ثمود پر آئی وہ شدید بھونچال تھا لفظ طاغیہ جو بعض آیتوں میں ہے وہ اس کی شدت اور حد سے زیادہ ہونے پر دلالت کرتا ہے لفظ صیحہ کا اس بھونچال کی آواز گڑ گڑاہٹ پر اشارہ کرتا ہے اور رجفہ کے معنی بھونچال کے ہیں غرض کہ جس طرح عادت اللہ جاری ہے

بھونچال کے آنے وہ قوم غارت ہوگئی یعنی اس کے بہت سے آدمی مر گئے اور بہت سے بچے بھی رہے قوم نمود کے مکانات پہاڑوں میں بھی تھے اور میدانوں میں بھی تھے میدانوں کے مکانات پر تو بھونچال سے صدمہ ظاہر ہے مگر پہاڑ کے اندر کے مکانات پر بھی متعدد طرح سے صدمہ پہنچ سکتا ہے یہ واقعہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کو معجزہ یا خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت تصور کیا جاوے۔

☆☆☆☆☆☆☆

قصہ طالوت و جالوت

طالوت و جالوت کی لڑائیوں کا ذکر سورۂ بقر میں آیا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب بنی اسرائیل میں شموئیل نبی تھے اور ان آیتوں میں پانچ واقعوں کا بیان ہے۔

1 بنی اسرائیل کا اپنے نبی سے درخواست کرنا کہ ان پر کوئی بادشاہ مقرر کرے۔

2 شموئیل نبی کا بنی اسرائیل پر طالوت کو بادشاہ مقرر کرنا۔

3 تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد میں بنی اسرائیل کے پاس آ جانا

4 طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی سے منع ہونا

5 فلسطینیوں کا شکست پانا اور جالوت کا داؤد کے ہاتھ سے مارا جانا۔

یہ تمام واقعات توریت کی کتاب شموئیل میں مندرج ہیں مگر تیسرے اور چوتھے واقعہ میں کسی قدر اختلاف ہے یعنی کتاب شموئیل میں تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد سے پہلے آ جانا لکھا ہے اور قرآن مجید میں طالوت کے عہد میں اور اس پر عیسائی مورخوں نے اعتراض کیا ہے کہ غلطی سے ماقبل کے واقعے کو مابعد کے واقعے میں شامل کر دیا۔

کتاب شموئیل سے پایا جاتا ہے کہ تابوت سکینہ بمقام شیلوہ تھا جہاں علی بنی اسرائیل پر حاکم تھا اس کے عہد میں بنی اسرائیل اور فلسطینیوں میں بمقام ابن عیدز لڑائی ہوئی اور بنی

اسرائیل کی شکست ہوئی (دیکھو کتاب شموئیل 1 باب 4 ورس 2) تب بنی اسرائیل نے تابت سکینہ کو شیلوہ سے لشکر گاہ میں منگایا اور دوبارہ لڑے اور شکست عظیم ہوئی اور عیلی کے دونوں بیٹے مارے گئے اور تابوت سکینہ کو فلسطینی چھین لے گئے (دیکھو کتاب شموئیل 1 باب 4 ورس 10,11) عیلی بھی یہ خبر سن کر کرسی سے گر پڑا اور مر گیا اس زمانہ میں شموئیل نبی ہو چکے تھے مگر ان کی عمر چھوٹی تھی۔

فلسطینی تابوت سکینہ کو مقام ابن عیزر سے جہاں سے انہوں نے فتح کیا تھا بمقام اشدود لے گئے اور واگون بت کے مندر میں رکھا (دیکھو کتاب شموئیل 1 باب 5 ورس الغایت 5) پھر وہاں سے بمقام گٹ لے گئے (دیکھو کتاب مذکور ورس 8) پھر وہاں سے بمقام عقرون لے گئے (دیکھو کتاب مذکور ورس 10) اس کے بعد فلسطینیوں نے ایک گاڑی میں دو گایوں کو جوت کر اور تابوت سکینہ کو اس پر رکھ کر جنگل میں چھوڑ دیا اور وہ گائیں اس کو لے کر بمقام بیت الشمّس چلی آئیں اور یوشع کے کھیت میں جا کھڑی ہوئیں اس نے تابوت اتار لیا اور اپنے ہاں رکھا (دیکھو کتاب شموئیل 1 باب 6) کتاب شموئیل میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کی شکست ہونے اور تابوت چھین لے جانے کے سات مہینہ بعد ہوا۔

اس کے بعد تابوت سکینہ قریات یعارلم میں آیا اور ابینا داب کے گھر میں بمقام گبعاہ رکھا گیا (دیکھو کتاب شموئیل 1 باب 7 ورس 1) مگر کتاب شموئیل میں نہیں لکھا کہ بیت الشمّس میں کس قدر مدت رہا عیسائی مورخوں کے نزدک سن 1141 قبل مسیح کے تابوت سکینہ فلسطینیوں نے چھین لیا تھا اور سن 1140 میں قریات یعاریم میں آگیا وہاں آنے کے بیس برس بعد یہودیوں نے بتوں کی عبادت شموئیل نبی کی فہمائش سے موقوف کی اور خدا کی پرستش اختیار کی (دیکھو کتاب شموئیل 1 باب 7 ورس 1,2) اور بنی اسرائیل سے شموئیل کی سرداری میں ایک لڑائی فلسطینیوں سے ہوئی اور فلسطینیوں نے شکست کھائی جب شموئیل

ضعیف ہوئے تب بنی اسرائیل نے کسی بادشاہ کے مقرر کرنے کو کہا اور طالوت کو سن 1095 قبل مسیح میں بادشاہ مقرر کیا۔

کتاب شموئیل میں طالوت یعنی شاؤل اور جالوت کی لڑائی اور اس کے مارے جانے کا ذکر ہے مگر طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ توریت کی کتاب قضاۃ باب ہفتم میں جدھون کے لشکر کو ایک چشمہ کے پانی پینے سے منع کیا گیا تھا اور یہ واقعہ سن 1249 قبل مسیح کے ہوا تھا اس لیے عیسائی مورخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقع کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے۔

ان دونوں اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے لیے جو مخالفت کتاب شموئیل پر مبنی ہے ضرور ہے کہ کتاب شموئیل میں جو واقعات اور جو ترتیب ان واقعات کی ہے ان کو صحیح تسلیم کر لیا جاوے اور یہ بات بھی مان لی جاوے کہ کوئی واقعہ طالوت کے لشکر کا ایسا نہیں ہے جو کتاب شموئیل میں لکھنے سے رہ گیا ہو حالاں کہ خود عیسائی مورخ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے شموئیل کی کتابوں کے مضامین میں باہم اختلاف کتاب اول شموئیل باب 16 ورس 21,22 سے ظاہر ہے کہ طالوت داؤد سے اور اس کے باپ یشی سے بخوبی واقف تھا داؤ کو اس کے باپ کے پاس سے بلایا تھا اور اپنا سلح دار کیا تھا اسی کتاب کے باب ہفتدھم ورس 15 سے ظاہر ہے کہ داؤد طالوت سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔لڑائی کے ہنگامہ میں جب داؤد اپنے بھائیوں کی خبر لینے آیا تو داؤد نے کہا کہ جالوت سے میں لڑوں گا یہ خبر سن کر طالوت نے داؤد کو بلایا اور گفتگو کے بعد لڑنے کی اجازت دی اور اپنی زرہ وخود وتلوار بھی دی جس کو داؤد نے لے کر پھر دے دیا(دیکھو کتاب اول شموئیل باب 17 ورس 31 لغایت 39) مگر اسی باب کے ورس 55 میں لکھا ہے کہ جب داؤڈ لڑنے کو بڑھا تو

طالوت نے اپنے لشکر کے سردار سے پوچھا کہ یہ جوان کس کا بیٹا ہے اور ورس 58 میں لکھا ہے کہ جب داؤد نے جالوت کا سر کاٹ لیا اور طالوت کے پاس لے آیا تو طالوت نے پوچھا کہ تو کس کا بیٹا ہے پس ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک طالوت داؤد سے مطلق واقف نہ تھا اس اختلاف کے سبب خود عیسائی مورخوں کی یہ رائے ہے کہ کتاب شموئیل میں قصہ الٹ پلٹ ہوگیا ہے جالوت کی لڑائی کے بعد داؤد طالوت کا مصاحب اور صلح دار ہوا ہے اس پر بھی اختلاف رفع نہیں ہوتا کیوں کہ سولھویں باب سے داؤد کی پہلی دفعہ بطور مطرب بربط نواز کے طالوت سے ملاقات ہونی پائی جاتی ہے۔

متقدمین علمائے عیسائی نے خیال کیا ہے کہ باب ہفتم دھم کتاب اول شموئیل کے ورس 11 لغایت 31 ورس 55 لغایت 58 و باب ھیجدھم کے ورس 1 لغایت 5 صحیح نہیں ہیں اور ان کو خارج کر دیا ہے چناں چہ سپٹو ایجنٹ کے قلمی نسخہ ویٹکن میں وہ آیتیں نہیں ہیں اور اگر وہ آیتیں نکال ڈالی جاویں تب بھی اور آیتوں میں جیسے کہ باب 16 کے ورس 18 لغایت 21 و باب 17 کے ورس 33 لغایت 40 کی مطابقت ہی نہیں ہوسکتی۔ انہی اختلافات کے سبب بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ہے کہ سارے کا سارا سترھواں باب الحاقی و نامعتبر ہے جان کیٹو نے اپنی کتاب سیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ’’یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلاکم و کاست صحیح جانیں کیوں کہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا تھا انہوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو۔‘‘

علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق نہیں ہے کہ شموئیل کی کتابیں کب لکھی گئیں اور کس نے لکھی ہیں یہودی اور بڑے بڑے عیسائی عالم خیال کرتے ہیں کہ شموئیل کی کتاب کا بڑا حصہ یا پہلے چوبیس باب شموئیل کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی ناثان نبی و گید نبی کے لکھے ہوئے ہیں ابربانیل اور کروشیس خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کتابیں برمیاہ نبی نے لکھی ہیں

جان کی یہ رائے ہے کہ یہ کتابیں شموئیل کے بہت زمانہ بعد یعنی قید بابل کے تیسویں سال میں لکھی گئی ہیں اگر درحقیقت ایسا ہی ہو کہ تین ہاتھوں نے ان کتابوں کو لکھا ہو تو واقعات کا الٹ پلٹ ہو جانا یا بعض واقعات کا تحتیر سے رہ جانا ایک ایسا امر ہے جو آسانی سے خیال میں آسکتا ہے۔

ہماری غرض اس بحث سے شموئیل کی کتابوں پر جرح وقدح کی نہیں ہے بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی ہے کہ قرآن مجید پر اس وجہ سے کہ شموئیل کی کتابوں سے بیان مختلف ہے اعتراض نہیں ہوسکتا جب تک کہ اور طرح پر اس کی غلطی ثابت نہ کی جاوے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ قرآن مجید میں جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت پر کسی کو اس وجہ پر مجبور کروں کہ قرآن میں لکھا ہے بلکہ میں دونوں واقعوں پر جو قرآن و کتاب شموئیل میں مندرج ہیں بطور ایک نکتہ چین مورخ کے غور کرنا اور اس نکتہ چینی سے دونوں قونوں میں سے ایک کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔

تابوت سکینہ کو فلسطینی فتح کر کے چھین لے گئے تھے کتاب شموئیل میں اس کا واپس بھیج دینا ایسے عجیب اور کراماتی واقعوں پر مبنی کیا ہے جس کو کوئی آزاد رائے کا مورخ جو واقعات کو انسانوں کے حالات اور افعال کا نتیجہ سمجھتا ہے تسلیم نہیں کر سکتا لڑائی کی شکست ہونے کے بعد بنی اسرائیل نہایت ضعیف ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ انہوں نے پھر قوت حاصل کی تھی تابوت سکینہ کا دشمنوں کے ہاتھ میں چلا جانا بلاشبہ ان کو نہایت رنج دیتا ہوگا اور ان کی نہایت آرزو یہ ہوگی کہ وہ اس کو پھر اپنے دشمنوں سے واپس لیں۔

اس شکست کے بیس برس بعد وہ فلسطینیوں سے پھر لڑے اور فلسطینیوں نے شکست پائی جس سے معلوم ہوتا ہے فلسطینی کمزور ہو گئے تھے فلسطینی خوب جانتے ہوں گے کہ بنی اسرائیل جب تک کہ تابوت سکینہ ان کے ہاتھ نہ لگے لڑائی سے باز نہیں آنے کے۔ اس

عرصہ میں بنی اسرائیل کو زیادہ قوت ہوگئی اور شموئیل نبی نے تمام فرقوں کو جو عیلی کے مرنے کے بعد متفرق ہوگئے اکٹھا کرلیا اور طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور یہ امر بنی اسرائیل کی زیادہ قوت کا اور فلسطینیوں کا جو کمزور ہوتے جاتے تھے زیادہ خوف کا باعث ہوا ہوگا۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ اگر تابوت سکینہ واپس کر دیا جاوے تو شاید مصیبت جنگ سے حفاظت ہو جاوے انہوں نے جا بجا اس کو منتقل کیا اور آخر کار ایک گاڑی میں لاد کر مع زر و تحائف کے بیت الشمس کی سرحد میں جو بنی اسرائیل کا ایک شہر فلسطینیوں کی سرحد سے ملا ہوا تھا چھوڑ آئے اور اس تمام اصلی واقعہ پر خیال کرنے سے اس بات کو کہ تابوت سکینہ طالوت کے عہد میں آیا ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں مندرج ہے زیادہ ترجیح ہوتی ہے۔

دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کی نسبت اول ہم کو خیال کرنا چاہیے کہ جہاں طالوت و جالوت میں لڑائی ہوئی تھی وہ کیا مقام تھا فلسطینی مقام سوکوہ عریقاہ دمیم میں جمع ہوئے تھے اور بنی اسرائیل وادی، ایلاہ میں دونوں لشکروں کے درمیان دریائے شورق واقع تھا فلسطینی اس کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب جنوب تھے اور بنی اسرائیل اس کے دائیں کنارہ پر یعنی جانب شمال تھے اور بنی اسرائیل نے دریا کو عبور کر کے فلسطینیوں پر حملہ کیا تھا پس قرآن مجید کے ان لفظوں کی کہ

" ان اللہ مبتلیکم بنھر "

جغرافیہ اور تاریخ سے بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔

باقی رہا اس کے پانی پینے سے منع کرنا ہر شخص جو لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر فوج کشی کرتی ہے تو ہر ایک شخص اس کی قوم کا بہادر اور غیر بہادر اور دل چلا اور دل کا بودا قومی لحاظ سے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے لیکن جب وقت حملہ کرنے کا آتا ہے تو سپہ سالار ایک طریقہ ایسے لوگوں کے انتخاب

کرنے کا مقرر کرتا ہے جس کے سبب حملہ میں وہی لوگ شریک رہیں جو نہایت بہادر اور دل چلے ہوں اور در حقیقت اپنے دلی جوش سے لڑائی میں شریک ہوئے ہوں۔

جب جدعون نے مدبانیوں پر فوج کشی کی تھی تو اس نے حملہ کے وقت یہ قرار دیا تھا کہ جو شخص اس چشمہ سے جو اس لشکر کے پاس تھا پانی پی لے وہ حملہ میں شریک نہ ہو اور جو نہ پئے بلکہ صرف ہاتھ بھگو کے زبان تر کر لے وہ حملہ میں شریک رہے اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ جن لوگوں کو لڑنے اور جان دینے میں تذبذب ہو وہ چھٹ جائیں اور جو بالکل لڑنے اور مرنے پر آمادہ ہوں وہ حملہ میں شریک رہیں۔

اگر چہ شبہ ہے کہ جہاں جدعون کی مدیانیوں سے لڑائی ہوئی تھی وہاں کوئی چشمہ نہیں تھا اور اس لیے کتاب قضاۃ میں طالوت کا واقعہ جدعون کے قصہ سے ملا دیا ہے لیکن اگر اس کو جدعون ہی کے وقت کا واقعہ تسلیم کر لیا جاوے تو طالوت کو یہ واقعہ ضرور معلوم ہوگا اور اتفاق سے طالوت کا لشکر بھی دریا کے کنارہ پڑا تھا اور دریا کے پار اتر کر حملہ کرنا قرار پایا تھا ہر طرح پر یقین کرنے کا موقع ملا ہے کہ طالوت نے بھی اسی طریقہ پر ان لوگوں کا جو حملہ میں دل سے شریک ہو کو تھے انتخاب کرنا چاہا ہوگا اور وہی طریقہ انتخاب کا اختیار کیا ہوگا جو جدعون نے اختیار کیا تھا ہاں کتاب شموئیل میں اس انتخاب کا ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کتاب شموئیل میں اس کا ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ نہ ہوا ہو عیسائی مورخوں نے کج بحثی سے یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید میں جدعون کے قصہ کو طالوت کے قصہ میں ملا دیا ہے پس یہ اعتراض کرنے والوں کی غلطی ہے کیوں کہ تمام واقعات کو خیال کرنے سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جدعون کے عہد میں جو واقعہ ہوا وہ علیحدہ ہے اور طالوت کے عہد میں جو واقعہ ہوا ہے اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ علیحدہ ہے اور کم سے کم اس میں تو کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس زمانہ کے یہود جب قرآن مجید نازل

ہوا اس واقعہ کا طالوت کے عہد میں بھی واقع ہونے کا یقین رکھتے تھے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انہی کے مقابلہ میں قرآن مجید میں اعلانیہ ایسا بیان نہیں ہوسکتا۔

آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہے نہایت صاف ہیں صرف ایک مقام تفسیر کے قابل ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ ''طالوت کے عہد سلطنت میں تابوت سکینہ کو فرشتے اٹھا لاویں گے''''تحملہ الملائکۃ'' جالوت نے جب لڑائی میں مغلوب ہونے کے ڈر سے تابوت سکینہ کو بنی اسرائیل کے ملک میں بھیج دینا چاہا تو اس کو بیلوں کی گاڑی پر لاد کر بنی اسرائیل کے ملک کی سرحد میں چھڑوا دیا تھا یہ قصہ شموئیل کی کتاب میں ہے ہمارے علمائے مفسرین نے کہہ دیا کہ ان بیلوں کو جن پر کوئی ھانکنے والا نہ تھا فرشتے ھنکا لائے تھے اور یہی معنی تحملہ الملائکۃ کے قرار دیے ہیں بعض عالموں نے سمجھا کہ یہ معنی تو ٹھیک تحملہ کے لفظ کے چسپاں نہیں ہوتے انہوں نے یہ قیاس لگایا کہ موسیٰ کے بعد سے تابوت سکینہ کو دنیا سے اوپر فرشتے ادھر اٹھائے ہوئے تھے پھر طالوت کو لا کر دے دیا یہ سب غلط قیاسات ہیں آیت کا مطلب صاف ہے کہ بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کے ہاتھ آنے کی بڑی خواہش تھی شموئیل پیغمبر نے جب طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو فرمایا کہ اس کی بادشاہت میں تابوت سکینہ آجاوے گا اور جو کہ اس کا ہاتھ آنا نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا اس لیے انہوں نے کہا کہ اس کو فرشتے اٹھا لاویں گے جیسے کہ ایسے موقع پر بطور تقویت قلب کے بولا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

موسیٰ، فرعون اور بنی اسرائیل

حضرت موسیٰ، بادشاہ فرعون اور حضرت موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل کے متعلق جو واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں وہ 19 موضوعات میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

1 تحقیق لفظ آیہ ولفظ بینہ 2 حقیقت سحر 3 تخیل تحریک حبل وعصائے سحرہ فرعون 4 عصائے موسیٰ اور اس کا بطور اژدھے کے دکھائی دینا 5 بیان ید بیضا 6 ذکر قتل اولاد بنی اسرائیل 7 بیان قحط 8 ذکر طوفان، وجراد وقمل، وضفادع، ودم 9 غرق فی البحر 10 اعتکاف حضرت موسیٰ کا پہاڑ میں 11 حقیقت کلام خدا با موسیٰ 12 حقیقت تجلی للجبل 13 بیان کتابت فی الالواح 14 اتخاذ عجل 15 ستر آدمیوں کا منتخب کرنا 16 ذکر استسقائے قوم موسیٰ اور ظاہر ہونا چشموں کا 17 سایہ کرنا ابر کا 18 من وسلویٰ کا اترنا 19 دخول باب

ذیل میں ہم ان ان انیسوں امور کی نسبت علیحدہ علیحدہ بیان کرنا چاہتے ہیں

اول: تحقیق معنی لفظ آیہ وبیّنہ

ہم نے حضرت عیسیٰ کے بیان میں بہ تحت تفسیر

" واتینا عیسیٰ ابن مریم البینات"

لفظ آیہ وبینہ پر مفصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان الفاظ کے معنی معجزہ کے نہیں ہیں بلکہ احکام کے ہیں اور یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ معجزہ دلیل ثبوت نہیں ہوسکتا اور اس

صورت میں آیہ و بینہ کے معنی اس غرض سے معجزہ کے لینے کہ وہ مثبت نبوت ہوتا ہے خرط القتاد سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتا اس بحث کو آگے کے مضمون حضرت عیسیٰ کے معجزات میں پڑھیں۔

دوم: حقیقت سحر

اور یہ کہ کن معنوں میں اس کا استعمال ہوسکتا ہے

سحر کا لفظ قرآن مجید میں بہت جگہ آیا ہے مگر بہت سے الفاظ زبان عرب میں ایسے مستعمل تھے جن کے لیے فی الواقع کوئی حقیقت نہ تھی اور نہ درحقیقت ان کا مصداق تھا نہ ان کا کوئی مسمی حقیقۃ وجود رکھتا تھا بلکہ عرب جاہلیت نے اپنے وہم میں ایک شے غیر موجود کا وجود قرار دیا تھا اور اس سے کچھ افعال منسوب کئے تھے اور اس شے غیر موجود وھمی کے لئے وہ الفاظ مستعمل کرتے تھے قرآن مجید اہل عرب کی زبان میں نازل ہوا اور اس لئے اس زبان کے محاورہ کے موافق وہ الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں مگر قرآن مجید میں ان کا استعمال ان اثروں کے سمجھانے کے لئے ہوا ہے جو اثر کہ اہل عرب ان لفظوں سے پاتے تھے نہ اس لئے کہ ان لفظوں کے لئے فی الواقع کوئی حقیقت تھی یا درحقیقت ان کا کوئی مصداق تھا۔

اس کی مثال میں ہم ایک مباحثہ لطیف کا ذکر کرتے ہیں جو

قال ابو عبیدة ارسل الی الفضل بن الربیع الی البصرة فی الخروج الیه فقدمت علیه و کفت اخبر عن تبحره فاذن لی قد خلت علیه وهو فی مجلس طویل عریض فیه بساط واحد قد ملاء، و فی صدره فرش عالیة لا یر تقی علیها الا بکرسی وهو جالس علی العرش فسلت علیه بالوزارة فرد

وضحک الی و استد نانی من فرشته ثم سالنی و بسطنی و تلطف بی وقال فانشدنی فانشدته من عیون اشعار جاهلیة احفظها فقال قد عرفت اکثر هذه و ارید من ملیح الشعر فانشدته فطرب وضحک و زاده نشا طاثم دخل رجل فی ذی الکتاب و له هیئة حسنة فاجلسه الی جانبی وقال اتعرف هذا قال لا فقال هذا ابو عبیدة علامة اهل البصره اقد مناه لنستقفید من علمه فد عاله الرجل ثم التفت الی وقال لی کنت الیک مشتا قا و قد سالت عن مسئلة افتادن لی ان اعرفک ایا هاقلت هات فقال قال اللہ تعالیٰ طلعها کانه روس الشیاطین و انما یقع الوعد و الا یعاد بما قد عرف وهذالم یعرف قال فقلت انماکلم اللہ العرب علی قدر کلا مهم اما سمعبت قول امری القیس ایقتلنی و المشرفی مضاجعی ومسنونة رزق کانیاب اغوال

وهم لم یروالغوال قط ولکنه لما کان امر الغول یهو لهم او عدوابه فاستحسن الفضل و السائل فی ذلک

(مراۃ الجنان ورق157)

خلیفہ منصور کے وزیر ابو الفضل بن ربیع کی مجلس میں ایک بہت بڑے عالم سے ہوا تھا مراۃ الجنان المشہو ر بہ تاریخ یافعی میں لکھا ہے کہ فضل بن ربیع نے جو خلیفہ منصور کا وزیر اور ایک بہت بڑا عالم تھا ابوعبیدہ کے پاس جو اس زمانہ کے بہت بڑے عالم متبحر تھے اور بصرہ میں تھے ایک شخص بھیجا اور اپنے پاس بلایا وہ آئے اور ان کو وزیر کی مجلس میں آنے کی اجازت ملی جب وہ مجلس میں گئے تو دیکھا کہ وہ

ایک بہت لمبے چوڑے مکان میں ہے جس میں بھرپور ایک ہی
کپڑے کا فرش بچھا ہوا ہے اور صدر میں ایک بہت اونچی جگہ پر جس
پر بغیر زینہ کے چڑھا نہیں جا سکتا مسند تکیہ لگا ہوا ہے اور وہ اس پر بیٹھا
ہے ابو عبیدہ نے موافق اس آداب کے جو وزیروں کے لئے مقرر کیا
تھا سلام علیک کی وزیر نے اس کا جواب دیا اور اپنی مسند کے پاس
بیٹھنے کی اجازت دی پھر ابو عبیدہ کی خیر و عافیت پوچھی اور حالات
دریافت کیے اور بہت مہربانی کی پھر کہا کہ کچھ اشعار پڑھو ابو عبیدہ
نے عرب جاہلیت کے نہایت عمدہ اشعار جو اس کو یاد تھے پڑھے وزیر
نے کہا کہ ایسے تو بہت سے اشعار میں بھی جانتا ہوں میرا یہ مقصد تھا
کہ کچھ نمکین چٹ پٹے اشعار سناؤ ابو عبیدہ نے ویسے ہی اشعار
پڑھے جن کو سن کر وزیر خوش ہوا اور ہنسا اور مزے میں آ گیا اتنے میں
وزیر کا ایک منشی جو وجیہہ آدمی تھا آ گیا وزیر نے اس کو ابو عبیدہ کے
پاس بیٹھنے کا حکم دیا اور ابو عبیدہ کی طرف اشارہ

کر کے منشی سے پوچھا کہ تم ان کو جانتے ہو اس نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا وزیر
نے کہا کہ یہ ابو عبیدہ ہیں علامہ اہل بصرہ میں نے ان کو بلایا ہے تا کہ ان کے علم سے ہم فائدہ
اٹھاویں اس منشی نے وزیر کو دعا دی اور ابو عبیدہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ میں آپ سے ملنے
کا بہت مشتاق تھا لوگوں نے مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا آپ مجھ کو اجازت دیتے ہیں کہ اس کو
آپ سے کہوں ابو عبیدہ نے کہا کہ کہو اس منشی نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے دوزخ کے درخت کے
پھل کو شیطان کے سروں سے تشبیہہ دے کر ڈرایا ہے مگر لالچ دینا یا ڈرانا ایسی چیز سے ہو سکتا
ہے جس کو لوگ جانتے ہوں مگر شیطانوں کے سروں کو تو کوئی نہیں جانتا کہ کیسے ہیں ابو عبیدہ

نے کہا کہ خدا نے عرب کے کلام کے مطابق کلام کیا ہے کیا تم نے امراء القیس کا قول نہیں سنا چناں چہ ابوعبیدہ نے وہ شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے۔

کیا وہ مجھ کو مار ڈالیں گے اور تلوار میری ساتھ لیٹی ہے اور نیلی چمک دار برچھیاں ہیں مانند دانتوں غول بیابانی کے۔

اس شخص نے جس کے حق میں یہ شعر کہا ہے یا اور کسی نے غول بیابانی کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر جب کہ غول بیابانی کا ہول اس کے دل میں تھا تو اس سے ان کو ڈرایا اس تقریر کو وزیر ابوالفضل اور اس کے منشی دونوں نے پسند کیا۔

(انتہی)

غرض کہ جس طرح امراء القیس کے شعر سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت غول بیابانی کے لمبے لمبے نیلے نیلے چمک دار دانت ہوتے ہیں اسی طرح قرآن مجید میں جو روش الشیاطین کا لفظ آیا ہے اس کو یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت شیطان کا ڈراؤنا سر ہوتا ہے بلکہ جس چیز سے اپنے خیالات کے موافق عرب دہشت کھاتے تھے اسی سے ان کے خیالات کے موافق وعید آئی ہے اسی طرح سحر کا لفظ جہاں قرآن میں آیا ہے وہ صرف عرب جاہلیت کے خیال کے موافق آیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس طرح پر عرب جاہلیت سحر کو سمجھتے تھے درحقیقت اس طرح پر اس کا وجود تھا یا خدا تعالیٰ نے اس کا واقعی ہونا بتایا ہے یا عرب جاہلیت کے خیالات کی تصدیق کی ہے۔

اسی طرح سینکڑوں لفظ قرآن مجید میں سب محاورہ زبان عرب

و عزمت مذ ذالک الیوم ان اصنع کتابا فی القرآن لمثل هذا واشباهه ولما یحتاج الیه من علمه فلما رجعت الی البصرة علمت کتاب لذی سمیته المجاز (مراة الجنان یافعی صفحه157)

اور بلحاظ خیالات عرب جاہلیت آئے ہیں جن سے ان کا
واقعی ہونا مراد نہیں ہے علمائے متقدمین نے اس باب میں کتابیں لکھی
ہیں چناں چہ تاریخ یافعی میں لکھا ہے کہ اس مباحثہ کے بعد ابوعبیدہ
نے اسی دن سے ارادہ کیا کہ وہ قرآن کے اس قسم کے

الفاظ کے بیان میں ایک کتاب لکھے اور جب وہ بصرہ میں واپس آ گیا تو اس نے کتاب لکھی اور اس کا نام مجاز رکھا افسوس ہے کہ اس قسم کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں ہمارے زمانہ کے عالم ان کتابوں سے ناواقف محض ہیں اور جب کوئی شخص جس کو خدا نے بصیرت دی ہے قرآن مجید پر غور کر کے اور تمام حالات کو پیش نظر رکھ کے اس قسم کے الفاظ کی نسبت کچھ لکھتا ہے تو ان کو ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے اور چونک اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو نص کے برخلاف ہے حالاں کہ جس کو وہ نص سمجھتے ہیں درحقیقت وہی نص کے خلاف ہے۔

سحر جس طرح کہ لوگ اس پر یقین کرتے ہیں اور عرف عام میں جس طرح پر وہ سمجھتا جاتا ہے اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور نہ قرآن مجید سے اس کی تصدیق پائی جاتی ہے ہاں تمام انسانوں میں خواہ وہ انبیاء ہوں یا اولیاء یا عوام الناس یا کسی مذہب کے ہوں حتیٰ کہ حیوانوں میں بھی ایک قسم کی قوت مقناطیسی موجود ہے جو خود اس پر اور نیز دوسروں پر ایک قسم کا اثر پیدا کرتی ہے یہ قوت بمقتضائے خلقت بعضوں میں ضعیف اور بعضوں میں قوی اور بعضوں میں اقوی ہوتی ہے اور جس طرح اور قوائے انسانی ورزش سے قوت پکڑتے ہیں جیسے کہ پنجہ کشی کی ورزش سے پنجہ میں کلائی کی ورزش سے کلائی میں زیادہ قوت آجاتی ہے اسی طرح اس قوت دماغی میں بھی خاص قسم کی ورزش سے قوت زیادہ ہو جاتی ہے۔

انسان جو خواب میں عجیب عجیب چیزیں دیکھتا ہے اور عجیب واقعات و حالات اس پر

گزرتے ہیں جن کو وہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت وہ تمام چیزیں موجود ہیں اور فی الواقع وہ حالات اس پر گزر رہے ہیں اسی قوت کے اثروں میں سے ہے حالاں کہ وہ چیزیں در حقیقت نہ موجود ہوتی ہیں اور نہ فی الواقع وہ حالات اس پر گزرتے ہیں۔

یہ کیفیت جس طرح کہ خواب طبعی میں ہوتی ہے کبھی حالت بیداری میں بھی پیدا ہو جاتی ہے آدمی سمجھتا ہے کہ میں جاگتا ہوں اور درحقیقت وہ جاگتا بھی ہوتا ہے مگر اس پر ایک قسم کی خواب طاری ہو جاتی ہے جو خواب مقناطیسی سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور اس حالت میں انسان ایسی چیزوں کو موجود دیکھتا ہے جو فی الحقیقت موجود نہیں ہیں اور ایسے واقعات اپنے پر گزرتے ہوئے یقین کرتا ہے جو درحقیقت پر اس نہیں گزرتے۔

یہ قوت مقناطیسی جس میں قوی ہوتی ہے وہ دوسرے شخص پر بھی ڈال سکتا ہے اور اس دوسرے شخص پر بحالت بیداری ایک قسم کی خواب مقناطیسی طاری ہوتی جاتی ہے۔ کبھی دوسرا شخص جاگتا رہتا ہے اور خواب مقناطیسی اس پر طاری رہتی ہے اور کبھی وہ اسی خواب مقناطیسی میں بیہوش ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوتا ہے۔

اس قوت مقناطیسی سے کیا کیا چیزیں ظہور میں آتی ہیں بحث طلب ہیں جو لوگ اس فن کے عامل ہیں وہ اس قوت سے بہت سی عجائب و غرائب چیزوں کے ظہور کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جب تک وہ تجربہ اور مشاہدہ میں نہ آویں اس وقت تک ان کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں صرف ان باتوں کے وجود سے یا ان کے ظہور پذیر ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے جو معلومہ قوانین قدرت کے برخلاف ہیں با ایں ہمہ جو امور کہ اس سے ظہور میں آویں وہ صرف خیالی اور وھمی ہوتے ہیں جیسے خواب کی چیزیں نہ اصلی اور واقعی۔

یہ قوت بعض آدمیوں میں خلقی نہایت قوی ہوتی ہے اور جو لوگ مجاہدات کرتے ہیں اور لطائف نفسانی کو متحرک کرتے ہیں خواہ وہ ان مجاہدات میں خدا کا نام لیا کریں یا اور کسی کا

ان میں بھی یہ قوت نہایت قوی ہو جاتی ہے اور اس کے اثر ظاہر ہونے لگتے ہیں ان اثروں کو جب کہ مسلمانوں سے ظاہر ہوتے ہیں مسلمان کرامت سے تعبیر کرتے ہیں اور جب کہ غیر مذہب والے سے ظاہر ہوتے ہیں اس کو استدراج سے تعبیر کرتے ہیں حالاں کہ دونوں کی اصلیت واحد ہے بہر حال جو کچھ کہ اس سے ظاہر ہو اس کا کوئی وجود اصلی و حقیقی نہیں ہے بلکہ صرف وجود وھمی و خیالی ہے۔

اسی قسم کی تاثیرات نفسانی کے ظہور کو جب کہ ان کا برانگیختہ کرنا ایسے مجاہدات سے کیا گیا ہے جو خدا کے سوا اور اشیا یا اشخاص کے تصور و تذکر سے تعلق رکھتے ہیں سحر سے تعبیر کیا گیا ہے اگر چہ صاحب تفسیر کبیر نے بھی سحر کی نسبت بہت لمبی بحث لکھی ہے مگر ابن خلدون نے اس بحث کو نہایت خوبی سے صاف صاف مختصر طور پر لکھا ہے جس کو ہم بجنسہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں چناں چہ انھوں نے لکھا ہے۔

حقیقة السحر و ذالک ان النفوس البریة وان کانت واحدة بالنوع فهی مختلفة بالخواص وهی اصناف کل صنف مختص بخاصیة واحدة بالنوع لا توجد فی الصنف الاخر و صارت تلک الخواص فطرة و جبلة لصنفها فنفوس الا نبیاء علیهم الصلواة والسلام لها خاصیة تستعد بها المعرفة الربانیة ومخاطبة الملائکة علیهم السلام عن الله سبحانه و تعالیٰ کما مروما یتبع ذلک من التاثیر فی الاکوان واستجلاب روحانیة الکواکب التصرف فیها والتاثیر بقوة نفسانیة او شیطانیة فاما تاثیر الانبیاء فمدد الهی و خاصیة ربانیة و نفوس الکهنة لها خاصیة الاطلاع علی المغیبات بقویٰ شیطانیة وهکذا کل صنف مختص بخاصیة لا توجد فی الاخر و النفوس الساحرة علی مراتب ثلاثة یاتی شرحهافا ولها الموثره

بالهمة فقط من غير الة ولا معين وهذا هو الذی تسمية الفلاسفة السحر و الثانی بمعين من مزاج الافلاک او العناصر او خواص الاعداد و يسونها الطلسمات وهی اضعف رتبة من الاول والثالث تاثير فی القویٰ المتخيلة يعمد صاحب هذا التاثير الی القوی المتخيله فيتصرف فيها بنوع من التصرف و يلقی فيها انواعا من الخيالات و المحاكات و صورا مما يقصد من ذلک ثم ينذلها الی الحس من الرائين بقوة نفسه الموثرة فيه فينظر الراؤن كانها فی الخارج و ليس هناک شيئا من ذلک كما يحكی عن بعضهم انه يری السباتين والانهار والقصور وليس هناک شی من ذلک ويسمی هذا عند الفلاسفة الشعودة او الشعبدة هذا تفصيل مراتبه ثم هذه الخاصية تكون فی الساحر بالقوة شان القوی لبشرية كلهما وانما تخرج الی الفعل بالرياضة (مقدمه ابن خلدون صفحه415)

کہ سحر کی حقیقت یہ ہے کہ نفوس انسانی اگر چہ نوعیت کے لحاظ سے متحد ہیں مگر خاصیتوں کے اعتبار سے مختلف ہیں اور وہ چند قسم کے ہیں ہر ایک قسم ایک نوع خاص کی خاصیت کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو دوسری قسم میں نہیں پائی جاتی۔ اور یہ خاصیتیں ان کی جبلت اور سرشت ہیں۔ پس انبیاء علیہم اسلام کے نفوس کو ایک خاص مناسبت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ خدا کی معرفت اور فرشتوں سے (جو خدا کی طرف سے آتے ہیں) بات چیت کی۔ اور اس قسم کے اور کام کی یعنی موجودات میں تاثیر کی اور ستاروں کی روحانیت کی تسخیر کی ان میں تصرف کرنے کی غرض سے قائل ہوتے ہیں اور تاثیر قوت نفسانیہ

سے ہوتی ہے یا شیطانیہ سے لیکن انبیاء کی تاثیر تو وہ امداد الٰہی اور
خاصیت ربانی ہے اور جادوگروں کے نفوس کو غائب چیزوں پر اطلاع
حاصل کرنے کی خاصیت قوائے شیطانیہ کے ذریعہ سے ہے اور اسی
طرح ہر ایک قسم ایک خاصیت کے ساتھ مخصوص ہے جو کہ دوسری میں
نہیں پائی جاتی اور جادوگروں کے نفوس کے مختلف درجے ہیں جن کی
تفصیل آتی ہے۔ قسم اول تو صرف ہمت کے ذریعہ سے بغیر کسی آلہ
اور مددگار کے تاثیر کرنے والی ہیں دوسری قسم بذریعہ کسی معین کی تاثیر
کے ہے یعنی افلاک یا عناصر کے مزاج یا عددوں کی خاصیتوں سے
اور اس کو طلسمات کہتے ہیں اور یہ قسم اول سے رتبہ میں کم ہے تیسری
قسم خیالی قوتوں میں تاثیر کرنا ہے اس تاثیر والا آدمی قوائے متخیلہ کی
طرف توجہ کرتا ہے پس ان میں ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے اور
میں طرح طرح کے خیالات اور گفتگو اور صورتیں جو کچھ اس کو مقصود
ہوتی ہیں ڈالتا ہے پھر ان کو دیکھنے والوں کی حس پر ڈھالتا ہے اپنے
نفس موثرہ کی قوت کے ذریعہ سے سو دیکھنے والے ایسا دیکھتے ہیں کہ
گویا وہ خارج میں موجود ہیں اور حالاں کہ وہاں کچھ نہیں ہوتا جیسا
کہ بعض لوگوں کا قصہ بیان کیا جاتا ہے وہ باغ، نہریں، مکانات
دیکھتے

فلاسفہ کے نزدیک یہ شودہ یا شعبدہ ہے۔ یہ اس کے مراتب کی تفصیل ہے پھر یہ
خاصیت ساحر میں اور قوائے بشریہ کی طرح بالقوہ موجود ہوتی ہے مگر ریاضت کرنے سے
بالفعل موجود ہو جاتی ہے۔

ابن خلدون نے جو سحر کے تین درجے قرار دیے ہیں حقیقت میں وہ تینوں سے واحد ہیں پہلا درجہ صرف ہمت کی تاثیر قرار دیا ہے اور تیسرا درجہ متخیلہ میں چیزوں کا جمع کر کے دوسرے کے متخیلہ میں اس کا القاء کرنا قرار دیا ہے یہ قسم درحقیقت صرف ہمت ہی سے متعلق ہے کوئی شے اس سے علیحدہ نہیں ہے دوسرا درجہ امداد کا مزاج افلاک وعناصر اور خواص اعداد سے قرار دیا ہے حالاں کہ اس بات کے لیے کہ افلاک وکواکب واعداد سے درحقیقت اس میں کچھ اعانت ہوتی ہے کچھ ثبوت نہیں ہے پس یہ دوسری قسم محض فرضی ہے اور تینوں قسمیں قسم واحد ہیں یعنی صرف ہمت سے تاثیرات کا ظہور۔

اسی قوت نفسی کے آثار جب انبیاء علیہم السلام سے ظاہر

والفرق عندهم بين المعجزة والسحران المعجزة قوة الهية تبعث فى النفس ذلک التاثير فهو موئد بروح الله على فعله ذلک والساحر انما يفعل ذلک من عند نفسه و بقوته النفسانية و بامداد الشياطين فى بعض الاحوال فبينهما الفرق فى المعقولية و الحقيقة والذات فى نفس الامرو انما نستدل نحن على التفرقة بالعلامات الظاهرة وهى وجود المعجزة لصاحب الخير و فى مقاصد الخير و للنفوس المتمحضة للخير والتعدى بها على دعوى النبوة والسحر انما يوجد لصاحب الثرو فى افعال الشر فى الغالب من التفريق بين الزوجين و ضرر الا عداء وامثال ذلک وللنفوس المتمحضة للشر هذا هو الفرق بينهما عند الحكماء الا لهيين وقد يوجد لبعض المتصوفة واصحاب الكرامات تاثير ايضا فى احوال العالم و ليس معدودا من جنس السحر وانما هو بالامداد الا لهى لا ن طريقهتم ونحلتم من اثار النبوة و توابعها ولهم فى المدد الا لهى حظ علىٰ

قدر حالهم وايمانهم وتمسكهم بكلمة الله واذ اقتدرا حد منهم على افعال الشر فلا ياتيها لانه متقيد فيما ياتيه ويذره لله امر الا لهى فما لا يقع لهم فيه الاذن لا ياتونه بوجه ومن اتاه منهم فقد عدل عن طريق الحق و ربما سلب حاله ولما كانت المعجزة بامداد روح الله والقوى الا لهية فلذلك لا يعارضها شئى من السحر (مقدمه ابن خلدون صفحه419)

واما الفرق عندهم بين المعجزة والسحر فالذى ذكره المتكلمون انه راجع الى التحدى وهو دعوىٰ وقوعها على وفق ما ادعاه قالوا والساحر مصروف عن مثل هذا التحدى فلا يقع منه و وقوع المعجزة على وفق دعوىٰ الكاذب غير مقدرو لان دلالة المعجزةعلى الصدق عقلية لان صفة نفسها التصديق فلو وقعت مع الكذب لا ستحال الصادق كاذبا وهو محال فاذا لا تقع المعجزة مع الكاذب بالا خلاق واما الحكماء فالفرق بينهما عندهم كما ذكرناه فرق بين الخير والشرفى نهايت الطرفين فالساحر لا يصدر منه الخير ولا يستعمل فى اسباب الخير والا يستعمل فى اسباب الخير و صاحب المعجزة لا يصدر منه الشر ولا يستعمل فى اسباب الشر وكانهما على طرفى النقصيض فى اصل فطرتهما

(مقدمه ابن خلدون صفحه420)

ہوتے ہیں تو اس کو معجزہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ابن خلدون نے معجزہ اور سحر میں یہ فرق بتلایا ہے کہ ان کے نزدیک (یعنی حکمائے الٰہیین کے نزدیک) معجزہ وسحر میں یہ فرق ہے کہ معجزہ ایک قوت الٰہی ہے جو نفس میں اس تاثیر کو برانگیختہ کرتے ہے پس وہ شخص (صاحب

معجزہ) اس کام کے کرنے میں خدا کی روح سے تائید یافتہ ہوتا ہے اور ساحر اسی کام کو اپنی طرف سے اور قوت نفسانیہ کے ذریعہ سے اور بعض حالتوں میں شیاطین کی مدد سے کرتا ہے پس ان دونوں میں معقولیت، حقیقت، ذات، کی رو سے ایک واقعی فرق ہے اور ہم اس تفرقہ پر ظاہری علامتوں سے استدلال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ معجزہ اچھے شخص سے اچھے مقصدوں کے لیے ہوتا ہے اور نفوس متمحصہ سے اچھے کام کے لیے دعویٰ نبوت پر تحدی کے لئے ہوتا ہے اور سحر برے آدمی سے برے کام کے لیے اکثر مرد و عورت میں جدائی ڈالنے کے لیے دشمنوں کو ضرر پہنچانے کے لیے اور اسی قسم کے کاموں کے لیے ہوتا ہے اور نفوس متمحضہ سے شر کے لیے ہوتا ہے حکمائے الٰہیین کے نزدیک و معجزہ و سحر میں یہ فرق ہے اور کبھی بعض صوفیوں سے اور کرامت والوں سے عالم کے حالات میں تاثیر پائی جاتی ہے مگر اس کا شمار سحر کی جنس میں نہیں ہے بلکہ وہ تائید الٰہی سے ہوتا ہے کیوں کہ ان کا طور طریق نبوت کے آثارات اور توابع میں سے ہے اور تائید الٰہی میں علیٰ قدر مراتب اور خدا سے تقرب کے لحاظ سے ان کو بھی حصہ ملا ہوا ہے اور جب ان میں کا کوئی شخص افعال شر پر قادر ہوتا ہے تو اس کو کر نہیں سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنے کام میں پابند ہے اور اس کو خدا کے حکم پر چھوڑ رکھا ہے اور جس میں خدا کا حکم نہیں ہوتا ہے اس کو وہ کسی طرح نہیں کرتا اور اگر کسی نے کیا تو وہ راہ حق سے منحرف ہو گیا اور اکثر اس کی کرامت مسلوب ہو جاتی ہے اور چوں کہ معجزہ خدا کی

مدد اور خدائی قوتوں کی وجہ سے ہوتا ہے تو سحر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا
لیکن ان لوگوں کے نزدیک معجزہ وسحر میں فرق یہ ہے کہ متکلمین تو
کہتے ہیں کہ اس کا مروج تحدی کی طرف ہے اور تحدی کے معنی ہیں
معجزہ کے وقوع کا دعویٰ کرنا اپنے دعویٰ کے موافق اور متکلمین کہتے
ہیں کہ ساحر اس قسم کی تحدی سے معذور ہے اس لیے اس سے تحدی ہو
نہیں سکتی اور جھوٹے شخص کے دعویٰ کے موافق معجزہ کا واقع ہونا نا
ممکن ہے کیوں کہ معجزہ کی دلالت سچائی پر عقلی ہے اس لیے کہ معجزہ
تصدیق کی خاص

صفت ہے تو وہ اگر جھوٹ کے ساتھ واقع ہو تو سچی چیز جھوٹی ٹھیر جائے پس معجزہ
مطلقاً جھوٹے سے نہیں سرزد ہو سکتا۔ لیکن حکما کے نزدیک تو جیسا ہم نے ذکر کیا معجزہ وسحر میں
خیر وشر کا فرق ہے اور وہ بھی انتہا کے کناروں کا تو ساحر سے اچھا کام نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کو
اچھے کام کے اسباب میں صرف کرتا ہے اور صاحب معجزہ سے شر نہیں صادر ہوتا نہ وہ اس کو
اسباب شر میں استعمال کر سکتا ہے گویا وہ دونوں خلقت ہی سے مخالفت کی اخیر سرحد پر ہیں۔

بوعلی سینا نے معجزہ یا کرامات کی نسبت یہ لکھا ہے کہ

لا تستبعدن ان يكون لبعض النفوس ملكة يتعدى تاثير ها بدنها او يكون لقوتها كانها نفس ما للعالم و كما تاثر بكيفية مزاجية يكون قد اثرت لمبدا جميع ما عددته اذ مباديها هذه الكيفيات لاسيما فى جرم صارا ولى بد لمناسبة تخصه مع بدنه لا سيما و قد علمت انه ليس كل مسخن بحارو لا كل مبرد بباردو لا تستنكرن ان يكون لبعض انفوس هذه القوة حتى يفعل فى اجرام اخر ينفعل عنها انفعال بدنه و لا يشتنكرن ان

يتعدى من قواها الخاصة الى قوى نفوس اخرى يفعل فيها لا سيما اذا
كانت شحذت ملكتها يقهر قواها البدنية التى لها فتقهر شهوة او غضبا او
خوفامن غيرها هذه القوة ربما كانت للنفس يحسب المزاج الا صلى لما
يفيده من هيئة نفسانية تصير للنفس الشخصية لتشخصها وقد تحصل
لمزاج يحصل وقد يحصل بضرب من الكسب بجعل النفس كالمجردة
لشدة الذكاء كما يحصل الاولياه وللابرار. والذى يقع له هذا فى جبلة
النفس ثم يكون خيرا رشيدا مزكيا لنفسه فهود و معجزة من الانبياء او
كرامة من الا ونياء و تزيده تزكية لنفسه من هذا المعنى زيادة على
مقتضى جبلة تيبلغ المبلغ الاقصى والذى يقع له هذا ثم يكون شريرا و
يستعمله فى الشر فهو الساحر الخبيث و قد يكسر قدر نفسه من غلوثه
فى هذا المعنى فلا يلحق شييئا من الا زكياء فيه (اشارات بو على سينا)

تم اس بات کو بعید نہ سمجھو کہ بعض نفسوں کو ایسا ملکہ ہو جس سے
اس کی تاثیر اس کے بدن تک پہنچے یا وہ اپنی قوت کی وجہ سے گویا کہ
عالم کے لیے بمنزلہ نفس کے ہو اور جیسا کہ وہ کیفیت مزاجیہ کی وجہ سے
اثر کرتی ہے تو وہ کسی مبدء کی وجہ سے وہ سب پر اثر کرے جن کو ہم
نے گنایا ہے کیوں کہ اس کے مبادی بھی کیفیتیں ہیں خصوصاً اس جرم
میں جس کے ساتھ وہ زیادہ مناسب ہے بوجہ اس مناسبت کے جو کہ
اس کو اپنے بدن کے ساتھ ہے۔ بالخصوص جب تم یہ بات معلوم کر
چکے ہو کہ ہر مسخن گرم نہیں ہے نہ ہر سر دسرد ہے اور اس بات کا انکار کرو
کہ بعض نفسوں کو یہ قوت اس درجہ تک ہو کہ دوسرے اجسام میں اثر

کرے اور وہ ایسا ہی منفعل ہو جیسا کہ اس نفس کا بدن اور اس بات کا
انکار نہ کرو کہ وہ اپنی خاص قوت سے تجاوز کر کے دوسرے نفسوں پر اثر
کرے خصوصاً جب کہ اس نے اپنے ملکہ کو قوائے بدنیہ کے زیر کر لینے
سے تیز کر لیا ہو۔ پس وہ دبا لیتا ہے شہوت کو یا غصہ کو یا دوسرے سے
خوف کو یہ قوت اکثر نفس کو اصلی سرشت کے اعتبار سے ہوتی ہے جو کہ
اس کو ہیئت نفسانیہ سے پہنچتی ہے اور نفس شخصیہ کے لیے بذاتہا ہوتی
ہے اور کبھی کسی مزاج کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی کسی قسم کی
کوشش کی وجہ سے ہوتی ہے جو کہ نفس کو نہایت تیزی کی وجہ سے مجرد
سا بنا دیتی ہے جیسا کہ اولیا اور نیک لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور جس
شخص کی سرشت میں یہ قوت ہو پھر وہ شخص نیک ہدایت یافتہ ہو اور
اس کا نفس پاک ہو تو وہ نبی اور صاحب معجزہ ہوتا ہے یا ولی صاحب
کرامت ہوتا ہے اور جب وہ

نفس کا تزکیہ کرتا ہے تو اصل خلقت سے اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے اور نہایت اونچے
درجے تک پہنچ جاتا ہے اور جس کو یہ قوت ہے اور وہ شریر ہے اور اس قوت کو برے کام میں
صرف کرتا ہے تو وہ خبیث ساحر ہے اور کبھی وہ اس کام میں زیادہ غلو کرنے کی وجہ سے اپنے
نفس کی قدر کو اور بھی گھٹا دیتا ہے تو وہ اچھوں کی کسی بات کو نہیں پہنچتا۔

ہم کو اس مقام پر اس بات سے بحث کرنی کہ معجزہ و سحر میں کیا فرق ہے اور نبیاء علیہم
السلام سے جو اثر نفسی ظاہر ہوتے ہیں وہ کس مبدء سے ہوتے ہیں اور اولیاء اللہ سے کس کی
تائید سے اور کفار و مشرکین یا خبیث انسانوں سے کس کی مدد سے کچھ ضرورت نہیں ہے بلکہ
صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اور جس سے ہوتا ہے وہ خود اس کے اثر نفسی

سے ہوتا ہے جو حسب فطرت انسانی خدا نے اس میں اور کسی نہ کسی قدر تمام انسانوں میں رکھا ہے پس اگر یہ سچ ہے تو ہم اس کو نہ معجزہ قرار دے سکتے ہیں نہ سحر نہ کرامت اور نہ استدراج جیسے کہ ہم انسان کے دوسرے قویٰ کے اثروں کو بھی معجزہ یا سحر یا کرامت یا استدراج قرار نہیں دیتے۔

علاوہ اس کے جب کہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اکثر ان اثروں کا ظہور ایسا ہی خیالی و وھمی ہے جیسے کہ خواب میں ان چیزوں کا ظہور جن کو دیکھنے والا صرف خواب ہی میں دیکھتا ہے اور ان کا وجود در حقیقت اور فی الواقع کچھ نہیں ہوتا تو ہم کو جرأت نہیں پڑتی کہ ایسی بے اصل چیزوں کو فخریہ طور پر انبیاء علیہم السلام کے معجزے اور اولیاء اللہ کی کرامتیں اور بے اعتقادی سے کافروں کا سحر اور استدراج قرار دیں۔

ہم کو اور اسلام کو تو فخر اس بات پر ہے کہ ہمارے برحق پیغمبر خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس تو کوئی معجزہ وعجزہ نہیں ہے اگر ہوگا تو خدا کے پاس ہوگا میں تو مثل تمہارے ایک آدمی ہوں خدا نے مجھ کو وحی کی ہے میں تم کو بری باتوں سے ڈراتا ہوں اور اچھی باتوں کی خوش خبری دیتا ہوں۔

ہم کو اور اسلام کو تو اس سچے ھادی پر فخر ہے جس نے نہ لکڑی کو سانپ کر دکھایا اور نہ اپنے دست مبارک کو چمکایا نہ سچی بات پر کچھ پردہ ڈالا نہ خدا کی قدرت کے قانون کو توڑنے کا دعویٰ کیا اور سیدھی طرح لوگوں کو سچا رستہ بتایا اور فخر اولین اور آخرین اور خاتم النبیین ہونے کا درجہ پایا

یا ایھا الذین امنوا صدوا علیه وسلموا تسلیما

☆☆☆☆☆☆☆

سوم: بیان تخیل تحرک حبل وعصائے سحرہ فرعون

چہارم: بیان عصائے موسیٰ علیہ السلام

پنجم: بیان ید بیضاء

یہ تینوں امر ایسے ہیں جن کا یک شامل بیان کرنا مناسب ہے اس مقام پر ہم ان تمام آیتوں سے بحث کریں گے جن میں ان امور سہ گانہ کا ذکر ہے۔

ثعبان

اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ مصر میں جس قدر ان لوگوں کی کثرت تھی جو ساحر کہلاتے تھے اور جو جو کرشمے وہ لوگوں کو دکھاتے تھے اس سے حضرت موسیٰ بخوبی واقف تھے جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کی ہمدردی اور اپنی قوم کو فرعون کے ظلم سے رہائی دینے پر مائل یا مامور ہوئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ان کو اس بات کا خیال ہوا ہوگا کہ وہاں تو بڑے بڑے کرشمے دکھانے والے ہیں میں ان پر کیوں کر غالب

وما تلک بیمینک یا موسیٰ قال هی عصای اتو کو علیها واهش بها علی غفی ولی فیها مارب اخری قال القها یا موسیٰ فالقا ها فا ذاهی حیة تسعی قال خذها ولا تخف سنعیدها سیرتها الا ولی واضم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء آیة اخری (20سورہ طہ آیت 23-18)

آؤں گا ان کو خدا نے بتایا کہ تو بھی ویسے ہی کام کرسکتا ہے

خدا نے پوچھا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰ نے کہا میری لاٹھی
ہے جس کو میں ٹیک لیتا ہوں اور اس سے بھیڑوں کو ھنکاتا ہوں اور
میرے اور کام بھی آتی ہے۔ خدا نے کہا اے موسیٰ اس کو ڈال تو
دے۔ پھر جب موسیٰ نے اس لاٹھی کو ڈال دیا تو وہ یکا یک اژدھا
تھی، چلتی

ہوئی خدا نے کہا اس کو اٹھا لے اور مت ڈر اس کو پہلی ہی سیرت پر پھر کر دیں گے اور
اپنے ہاتھ کو بغل میں رکھ کر نکال، چٹا بے عیب یہ دوسری نشانی ہے
یہی مضمون سورہ نمل میں بھی آیا ہے خدا نے موسیٰ سے

والق عصاک فلما را ھاتھتز کانھا جان ولی مدبرا ولم یعقب یا موسیٰ لا تخف الی لا یخاف لدی المرسلون واد خل یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء فی تسع آیات الی فرعون و قومہ انھم کانوا قوما فسقین (27 سورہ نمل 10,12)

کہا کہ اپنی لاٹھی ڈال دے جب موسیٰ نے دیکھا کہ وہ تو ھلتی
ہے گویا وہ اژدھا ہے تو پیٹھ پھیر کر پیچھے ھٹے اور پھر پلٹ کر رخ نہ کیا
خدا نے کہا اے موسیٰ ڈر مت میرے پاس پیغمبر ڈرا نہیں کرتے اور
اپنے ہاتھ کو اپنی جیب میں ڈال کر چٹا بے عیب (جا) نو نشانیاں لے
کر فرعون اور اس کی قسم کے پاس بے شک وہ قوم ہے نافرمان
سورہ قصص میں یہ فرمایا ہے کہ اپنی لاٹھی ڈال پھر جب

وان الق عصاک فما راھا تھتز کانھا جان ولی مدبرا ولم یعقب یا موسیٰ اقبل ولا تخف انک من الامنین اسلک یدک فی جیبک تخرج

بیضاء من غیر سوء واضمم الیک جناحک من الرحب فذالک برھانان من ربک الی فرعون وملائہ انھم کانوا قوما فاسقین (28 سورہ قصص 31,32)

موسیٰ نے دیکھا کہ وہ ھلتی ہے گویا کہ وہ اژدھا ہے پیٹھ پھیر کر پیچھے ھٹے اور پھر پلٹ کر رخ نہ کیا۔ خدا نے کہا اے موسیٰ آگے آ اور مت ڈر بے شک تو ہے امن والوں میں سے اپنے ہاتھ کو اپنی جیب میں ڈال کر چٹا بے عیب نکال اور اپنے دونوں بازوؤں کو خوف سے ملا پس یہ دونوں دو برھان ہیں تیرے رب کی طرف فرعون کے اور اس کے سرداروں کے بے شک وہ لوگ نافرمان تھے۔

ان آیتوں پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو حضرت موسیٰ پر طاری ہوئی اسی قوت نفس انسان کا ظہور تھا جس کا اثر خود ان پر ہوا تھا یہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت نہ تھا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزہ کے دکھانے کا موقع تھا اور نہ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی تلی کوئی مکتب تھا جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو حضرت موسیٰ میں از روئے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس قسم کے اثر ظاہر ہوتے ہیں انہوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ ان کو سانپ یا اژدھا دکھائی دی یہ خود ان کا تصرف اپنے خیال میں تھا وہ لکڑی لکڑی ہی تھی اس میں فی الواقع کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی خدا تعالیٰ نے کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ

فانقلبت العصا ثعبانا

یعنی وہ لاٹھی بدل کر اژدھا ہوگئی بلکہ سورہ نمل میں فرمایا کانھا جان یعنی گویا وہ اژدھا

ہے اس سے ظاہر ہے کہ درحقیقت وہ اژدھا نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ لاٹھی کی لاٹھی ہی تھی۔

اس کے بعد جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس گئے تو

فالقے عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین(7سورہ اعراف 104) (26 سورہ شعراء31)

فرعون نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی کرشمہ دکھاؤ حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی کو اس کے آگے ڈال دیا پھر وہ یکا یک اژدھا ظاہر ہوئی۔

صاحب تفسیر کبیر نے باوجود کہ نہایت بے سروپا قصے

اعلم ان قوله ولو جئتک بشئی مبین یدل علی ان الله تعالیٰ قبل ان القی العصاعرفه بانه یصیرھا ثعبانا ولو لا ذالک لما قال ما قال فلما القی عصاه ظهر ما وعد الله به فصار ثعبانا مبینا والمراد انه لبین للناظرین انه ثعبان بحر کاته وسائر العلامات (تفسیر کبیر جلد5صفحه52)

ان واقعات کی نسبت لکھے ہیں مگر ان کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ لاٹھی دیکھنے والوں کو اژدھا معلوم ہوئی نہ یہ کہ درحقیقت وہ اژدھا ہوگئی تھی چناں چہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ خدا کا جو یہ قول ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا کہ اگر میں تجھ کو علانیہ کرشمہ دکھاؤں جب بھی تو مجھے قید کرے گا تو یہ کہنا اس بات پر دلیل ہے

کہ لاٹھی کے ڈالنے سے پہلے خدا نے حضرت موسیٰ کو بتلا دیا تھا کہ وہ اژدھا ہو جائے گی کیوں کہ اگر یہ نہ ہوتا تو جو بات حضرت موسیٰ نے کہی وہ نہ کہتے پھر جب حضرت موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو وہ چیز ظاہر ہوئی جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا پھر لاٹھی علانیہ اژدھا ہوگئی اور علانیہ

اژدہ ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ لاٹھی دیکھنے والوں کو ھلنے سے اور اور تمام نشانیوں سے اژدھا معلوم ہوئی۔

اس کے بعد وہ واقعہ ہے جو حضرت موسیٰ اور سحرہ فرعون

فلما جاء السحرة قال لهم موسیٰ القواما انتم ملقون فلما القوا قال موسیٰ ما جئتم بر السحر ان الله سيبطله ان الله لا يصلح عمل المفسدين (سورہ یونس آیت 80,81)

قال لهم موسیٰ القواما انتم ملقون فالقوا حبالهم وعصيهم وقالوا بعزة فرعون انا لنحن الغالبون فالقى موسیٰ عماء فاذا هی تلقف ما يافكون(سورہ شعرا آیت 42,44)

قالوا يا موسیٰ اما ان تلقی واما نكون نحن الملقين قال القوا فلما القوا سحروا اعين الناس واشرهبواهم وجاؤ ابسحر عظيم و اوحينا الیٰ موسیٰ ان الق عصاک فاذا هی تلقف ما يا فكون

(سورہ اعراف آیت 11,114)

قالوا يموسیٰ اما ان تلقی واما ان نكون اول من القی قال بل القوا فاذ احبالهم وعصيهم يخيل اليه من سحرهم انها تسعیٰ فا و حبس فی نفسه خيفة موسیٰ قلنا لا تخف انک انت الا علی والق ما فی يمينک تلقف ما صنعو انما صنعو اكيد ساحر ولا يفلح الساحر حيث اتی (سورہ طه آیت 67-72)

میں واقع ہوا اور جس کا ذکر مندرجہ حاشیہ آیتوں میں ہے ان آیتوں کا مضمون یہ ہے کہ جب فرعون کے ساحر جمع ہو گئے تو انہوں

نے کہا کہ اے موسیٰ یا تو تم ڈالو نہیں تو ہم پہلے ڈالتے ہیں موسیٰ نے کہا
کہ تم ہی ڈالو پھر جب انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں
لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کو ڈرا دیا اور ایک بڑا جادو کیا اور
فرعون کی جے پکاری کہ ہم بے شک موسیٰ پر غالب ہوئے پس
یکا یک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں ان کے جادو
کے سبب سے معلوم ہوئیں کہ وہ چلتی ہیں پھر موسیٰ کے دل میں ڈر سا
پیدا ہوا۔ ہم نے کہا کہ تو مت ڈر تو ہی ان پر غالب ہے موسیٰ، فرعون
کے ساحروں سے کہا کہ جو کرشمہ تم نے کیا وہ جادو ہے اللہ تعالیٰ ابھی
اس کو مٹا دے گا بے شک اللہ مفسدوں کے کام کو نہیں سنوارتا خدا موسیٰ
سے کہا کہ ڈال دے جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے نگل جاوے گا جو
کچھ انہوں نے کیا ہے جو کچھ انہوں نے کیا ہے جادوں گروں کا مکر
ہے اور جادوگر کو جہاں جاوے فلاح نہیں ہے پس موسیٰ نے اپنی لاٹھی
ڈال دی پھر یکا یک وہ سب کو نگلنے لگی۔

سورہ اعراف کی آیت میں جس پر باقی آیتیں محمول ہیں

(لانها يفسر بعضها بعضا)

ایک جملہ آیا ہے کہ

سحروا اعين الناس

یعنی لوگوں کو ڈھٹ بندی کر دی پس یہ جملہ صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ در
حقیقت وہ لاٹھیاں یا رسیاں سانپ اور اژدھے نہیں ہو گئی تھیں بلکہ یہ سب تاثیر قوت نفس
انسانی کے جو ساحروں نے کسب سے حاصل کی تھیں وہ رسیاں اور لاٹھیاں لوگوں کو سانپ اور

اژدھے معلوم ہوتی تھیں۔ حضرت موسیٰ نے جو کچھ کیا وہ بمقتضائے قوت نفس تھا انسانی کو امر مافوق الفطرت نہ تھا مگر وہ قوت حضرت موسیٰ میں اور فطری جبلی تھی۔

اس امر کو علمائے متقدمین نے بھی تسلیم کیا ہے چناں چہ

ثم قال تعالیٰ فلما القوا سحروا اعین الناس واحتج به القائلون بان السحر محض التموية قال القاضی لو کان السحر حقا لکا نوا قد سحروا قلوبهم لا اعینهم فثبت ان المراد انهم تخیلوا احوالا عجیبة مع ان الامر فی الحقیقة ما کان علی و فق ما خیلوه

(تفسیر کبیر جلد3صفحه682سوره اعراف)

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ جب سحرہ فرعون نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا تو جادو کے لفظ پر لوگوں نے دلیل پکڑی ہے کہ سحر صرف دھوکا ہے۔ قاضی کا قول ہے کہ اگر جادو برحق ہوتا تو وہ لوگوں کے دلوں پر جادو کرتے نہ کہ ان کی آنکھوں پر پس ثابت ہوا کہ اس سے

مراد یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کے خیال میں عجیب باتیں ڈالیں تھیں با اینہمہ حقیقت میں وہ باتیں ایسی نہ تھیں جیسی کہ لوگوں کے خیال میں پڑی تھیں۔ یعنی وہ لاٹھیاں اور رسیاں درحقیقت سانپ اور اژدھے نہیں بنی تھیں بلکہ صرف لوگوں کے خیال میں ایسی معلوم ہوتی تھیں اور یہ بات اسی تاثیر قوت نفس انسانی کے سبب تھی جو ساحروں میں بذریعہ کسب اور موسیٰ میں بحسب فطرت تھی مگر حقیقت میں نہ ساحروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ اور اژدھا بنی تھیں اور نہ حضرت موسیٰ کی۔

ید بیضا

جب کہ یہ بات تسلیم کی گئی کہ انسان میں ایک ایسی قوت ہے کہ انسان اس کے ذریعہ سے قوائے متخیلہ کی طرف توجہ کرتا ہے اور پھر اس میں ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے اور ان میں طرح طرح کے خیالات اور گفتگو اور صورتیں جو کچھ اس کو مقصود ہوتی ہیں ڈالتا ہے پھر ان کو اپنے نفس موثرہ کی قوت سے دیکھنے والوں کی حس پر ڈالتا ہے پھر دیکھنے والے ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ گویا وہ خارج میں موجود ہے حالاں کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور قرآن مجید کے الفاظ سے جو آیات مذکورہ بالا میں گذرے ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ لاٹھیاں اور رسیاں اسی قوت متخیلہ کے سبب سانپ یا اژدھے دکھائی دیتی تھیں تو ید بیضا کا مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کا بھی لوگوں کو اس طرح پر دکھائی دینا اسی قوت نفس انسانی اور تصرف قوت متخیلہ کا سبب تھا نہ یہ کہ وہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت تھا اور در حقیقت حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی ماہیت بدل جاتی تھی جہاں قرآن مجید میں ید بیضا کا ذکر آیا ہے وہاں یہ مضمون بھی موجود ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ

ونزع یده فاذا هی بیضاء للناظرین(سوره اعراف وه سوره شعراء (32,105

نکالا تو وہ یکا یک چٹا تھا دیکھنے والوں کے لیے اور یہ مضمون صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہ میں وہ چٹا دکھائی دیتا تھا جو اثر قوت نفس انسانی کا تھا نہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت

اس مقام پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر عصائے موسیٰ کا اژدھا بننا اور ہاتھ کا چٹا ہو جانا اسی قسم کی قوت نفسی سے لوگوں کو دکھائی دیتا تھا جس طرح کی قوت نفسی سے سحرہ فرعون کی

رسیاں و لاٹھیاں سانپ دکھلائی دیتی تھیں اور کوئی معجزہ مافوق الفطرت نہ تھا تو خدا نے عصا و ید بیضا کی نسبت یہ کیوں فرمایا کہ

" فذانک برھان من ربک"

یعنی ان کو خدا کی طرف سے برھان کیوں تعبیر کیا ہے مگر برھان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عصائے موسیٰ کا اژدھا مرئی ہونا یا ہاتھ کا چٹا دکھائی دینا فرعون اور اس کے سرداروں پر بطور حجت الزامی کے تھا وہ اس قسم کے امور کو دلیل اس بات کی سمجھتے تھے کہ جس شخص سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں وہ کامل ہوتا ہے اور اسی لیے انہوں نے حضرت موسیٰ سے بھی کرشمہ دکھلانے کی خواہش کی تھی پس ان دونوں چیزوں پر بمقابلہ فرعون اور اس کے سرداروں کے برہان سے تعبیر کرنا بالکل صحیح تھا اور اسی سبب سے انہوں نے کہا کہ اگر کوئی کرشمہ دکھلایا جاوے گا تو وہ موسیٰ کو سچا جانیں گے خود اسی آیت میں بمقابل فرعون اور اس کے سرداروں کے ان دونوں امر کو برھان قرار دینے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ

" انھم کانوا قوما فاسقین"

فاسق کا لفظ نہایت وسیع معنی رکھتا ہے فرعون اور اس کے سرداروں کا ساحروں پر بہ سبب ان کے کرشموں کے اعتقاد رکھنا بھی فسق میں داخل تھا پس خدا نے فرمایا کہ یہ دونوں امر ایسی قوم کے لیے جو ساحروں کے کرشموں پر یقین رکھتے ہیں خدا کی طرف سے برہان ہیں پس برہان کا لفظ ان بیانات کے منافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔

سورہ نمل میں خدا تعالیٰ نے عصا کے ذکر کے بعد فرمایا کہ

" وادخل یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء فی تسع ایات الی فرعون و قومہ"

لفظ تسع ایات پر مفسرین نے بحث کی ہے کہ نو نشانیاں سے کیا مراد ہے۔

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کی تفسیر میں عصا اور

لقائل ان یقول کانت الایت احدی عشر ثنتان منها الید والعصا و التسع الفلق والطوفان والجرد والقمل والضفادع والدم والمطسة والجذب فی بوادهیم والنقعان فی مزارعهم (تفسیر کبیر، جلد پنجم، صفحہ81)

ید بیضا کے علاوہ یہ نو نشانیاں بیان کی ہیں دریا کا پھٹ جانا، طوفان کا ہونا، ٹڈیوں کا آنا، پسوؤں کا پیدا کرنا، مینڈکوں کا پیدا ہونا، پانی کا خون ہو جانا، مال ودولت مویشی میں کمی کا ہونا، قحط پڑنا، کھیتوں کی پیداوار کا گھٹ جانا۔

اوراسی مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ

"فی تسع ایات"

جملہ مستانفہ ہے یعنی علیحدہ کلام ہے اوراس کی تقریر یوں ہے کہ

"اذهب فی تسع آیات الیٰ فرعون"

یعنی عصا اور ید بیضا کا ذکر علیحدہ ہو چکا اس کے سوا نو نشانیاں اور دیں کہ وہ لے کر فرعون کے پاس جا۔

مگر یہ بیان صحیح نہیں اس لیے کہ وہ نو چیزیں جن کا ذکر کیا ہے بطور نشانی کے نہیں دی گئی تھیں بلکہ فرعون اوراس کی قوم پر بہ سبب نافرمانی کے بطور عذاب کے نازل ہوئی تھیں جن کو قرآن مجید نے بھی ''رجز'' سے تعبیر کیا ہے پس ان واقعات کو تسع آیات قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا۔

سورہ بنی اسرائیل میں بھی تسع آیات کا ذکر ہے اوراس کی

ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات فاسئل بنی اسرائیل اذا جاء ھم فقال لہ فرعون انی لا ظنک یا موسیٰ مسحورا قال لقد علمت ما انزل ھولاء الا رب السموات والارض بصائر وانی لا ظنک یا فرعون مثبورا (سورہ بنی اسرائیل آیت 103)

نسبت مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ اس آیت میں تسع آیات
سے وہ نو احکام مراد ہیں جو حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہے
تھے مفسرین کا ایسا خیال کرنا غالباً اس آیت کے ان الفاظ کی بنا پر ہے

" فاسئل بنی اسرائیل اس جاء ھم "

یعنی خدا نے فرمایا کہ بنی اسرائیل سے

دریافت کر جب موسیٰ ان کے پاس آئے تو وہ نو احکام بتائے تھے اس خیال پر ہمارے راویوں نے ایک حدیث بھی بیان کر دی اور مفسرین نے قبول کر لی اور کہا کہ یہی قول سب سے اچھا ہے۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ تسع آیات کے بیان میں متعدد

فی تفسیر قولہ تعالیٰ آیات بینات اقوال اجودھا ماروی صفوان ابن عسال انہ قال ان یھود یا قال نصاحبہ اذ ھب بنا الی ھذا النبی نسالہ عن تسع آیات فذ ھبا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وسالہ عنھا فقال ھن ان لا تشرکوا باللہ شیئا ولا تسرقوا ولا تنزنو ولا تقدلوا ولا تسحروا ولا تاکلوا الربا ولا تقذ فوالمحصنۃ ولا تولو الفرار یوم الزحف علیکم خاصۃ الیھودان لا تعتدوا فی السبت فقام الیھود یان فقبلا یدیہ و رجلیہ وقالوا اشھد انک فی ولو لا نخاف القتل لا تبعناک (تفسیر کبیر جلد چھارم،

اقوال ہیں سب سے اچھا قول یہ ہے کہ جو صفوان ابن عسال نے کہا ہے کہ ایک یہودی نے اپنے دوست سے کہا کہ پیغمبر کے پاس چلو ان سے پوچھیں کہ وہ نو احکام کیا تھے وہ آئے اور پوچھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ یہ تھے خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو چوری نہ کرو زنا نہ کرو قتل مت کرو سحر مت کرو، سود نہ کھاؤ، عورتوں پر زنا کا اتہام مت کرو، لڑائی میں بھاگو نہیں اور بالتخصیص یہودیوں کے لیے یہ حکم ہیں کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔ یہ سن کر وہ دونوں یہودی کھڑے ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ نبی ہیں اگر ہم کو مارے جانے کا ڈر نہ ہوتا تو ہم آپ کی پیروی کرتے۔

مگر مفسرین کا یہ خیال کہ جن تسع آیات کا ذکر سورہ نمل کی آیت میں ہے وہ تو نو نشانیاں تھیں جو حضرت موسیٰ فرعون کے پاس لے گئے تھے اور جن تسع آیات کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں ہے وہ نو احکام بنی اسرائیل کے لیے تھے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ اسی آیت میں ذکر ہے کہ تسع آیات کے جواب میں فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تجھ کو سحر زدہ سمجھتا ہوں اور اس سے ثابت ہے کہ وہ احکام فرعون اور اس کی قوم کے لیے تھے نہ بنی اسرائیل کے لیے اور

" فاسئل بنی اسرائیل اذ جاء ھم"

بطور جملہ معترضہ کے آیا ہے اس سے یہ استدلال کرنا کہ وہ احکام بنی اسرائیل کے لیے تھے صحیح نہیں ہے۔

غرض کہ ہماری تحقیق میں دونوں آیتوں میں تسع آیات سے وہ احکام مراد ہیں جو حضرت موسیٰ فرعون اوراس کی قوم کے پاس لے گئے تھے۔ یہ بات قابل تسلیم کے ہے کہ قرآن مجید میں ان نو احکام کا ایک جگہ شمار نہیں کیا گیا ہے بلکہ جا بجا متعدد احکام کا ذکر آیا ہے اگران سب پر غور کیا جاوے تو وہ احکام ہماری سمجھ میں مندرجہ ذیل معلوم ہوتے ہیں۔

1 توحید

کمال قال اللہ تعالیٰ انی انا اللہ لا الہ الا انا

2 اقرار بالرسالۃ کما قال انا رسولا ربک

3 منع شرک سے کما قال فا عبدنی

4 اقامت صلوۃ کما قال اقم الصلوۃ لذکری

5 جزا و سزا کما قال تجزی کل نفس بما تسعی

6 اعتقاد آخرت کما قال ان الساعۃ آتیۃ

7 نزول عذاب منکرین پر کمال ان العذاب علی من کذب و تولی

8 منع تعدی سے بنی اسرائیل پر کما قال لا تعذبھم

9 رہا کرنا بنی اسرائیل کا کما قال ارسل معنا بنی اسرائیل

یہ تمام آیتیں جن کا اشارہ ہم نے کیا عام آیتیں نہیں ہیں بلکہ خاص آیتیں ہیں جو حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے قصہ میں وارد ہوئی ہیں اوراسی سبب سے ہم نے خیال کیا ہے کہ یہ وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ خدا کی طرف سے فرعون کے پاس لے گئے تھے۔

ششم: قتل اولاد

بنی اسرائیل کے لڑکوں یا مردوں کا قتل کوئی ایسا امر نہیں

واذ نجينا كم من آل فرعون يسومونكم سوء العذاب بذبحون ابناء كم ويستحيون نساء كم و فی ذالكم بلاء من ربكم عظيم 2سوره بقر46

اذ نجينكم من آل فرعون يسومونكم سوء العذاب يقتلون ابناء كم و يستحيون نساء كم وفی ذالكم بلاء من ربكم عظيم(7سوره عراف 137)

اذ قال موسیٰ لقومه اذ كروا نعمة الله عليكم اذا نجاكم من آل فرعون يسومونكم سوء العذاب و يذبحون ابناء كم و يستحيون نساء كم و فی ذالكم بلاء من ربكم عظيم (14 سوره ابراهيم6)

ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شيعا يستضعف طائفة منهم يذبح ابناء هم ويستحيی نساء هم انه كان من المفسدين وزيدان نمن علی الذين استضعفوا فی الارض و نجعلهم ائمة ونجعلهم الوارثين ونمكن لهم فی الارض و نری فرعون وهامان و جنودهما منهم ما كانوا يحذرون (28سوره قصص3-5)

فلما جاء هم بالحق من عندنا قالوا اقتلوا بناء الذين آمنوا معه و استحيوا نساء هم وما كيد الكافرين الا فی ضلال و قال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ و نيدع ربه انی اخاف ان يبدل دينكم اوان يظهر فی الارض الفسا. (40سوره مومن 27-26)

ہے جس کو کسی کرشمہ کی بنا قرار دیا جاوے اگر چہ مفسرین نے
اس کی بنا بھی ایک کرشمہ پر قائم کی ہے یعنی بعضوں نے تو یہ کہا ہے کہ
کاھنوں نے فرعون سے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا
جو تیری سلطنت کو بر باد کردے گا پس اس تاریخ میں جو کاھنوں نے

مقرر کی تھی جس قدر لڑکے پیدا ہوئے ان کو فرعون نے مروا ڈالا۔اور بعضوں نے یہ کہا کہ یہ قتل صرف اس تاریخ پر منحصر نہیں رہا بلکہ یہ قتل برسوں تک جاری رہا اور نوے ہزار لڑکے قتل ہوئے۔بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ آئی اور اس آگ نے مصر کو گھیر لیا اور تمام قبطیوں کو جلا دیا اور صرف بنی اسرائیل بچ رہے لوگوں نے اس کی تعبیر دی کہ اس شہر سے جہاں سے بنی اسرائے آئے ہیں ایک شخص آوے گا اس کے ہاتھ سے مصر کی سلطنت برباد ہوگی اس پر فرعون نے بنی اسرائیل کے مردوں کے قتل کرنے کا حکم دیا۔

مگر قرآن مجید میں ان دونوں باتوں میں سے کسی کا کچھ اشارہ نہیں ہے اور نہ بنی اسرائیل کے قتل کی بنا کسی اور کرشمہ پر بیان ہوئی ہے قرآن مجید میں جو بات پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ بنی اسرائیل کی کثرت سے فرعون اور اس کے سرداروں کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ فساد کر کے مصر کی سلطنت کو برباد کر دیں گے اور اس کے انسداد کے لیے یہ تدبیر کی تھی کہ جو لڑکے پیدا ہوتے تھے ان کو قتل کروا ڈالتا تھا تا کہ مرد جن سے لڑنے کا اور فساد ہونے کا اندیشہ تھا زیادہ نہ ہونے پاویں۔چناں چہ سورہ قصص میں صاف لکھا ہے کہ فرعون کی سلطنت ملک میں بہت زبردست ہوگئی تھی اور اس کے لوگوں کو گروہ گروہ کر دیا تھا اور ایک گروہ کو یعنی بنی اسرائیل کو ان میں سے ضعیف کر دیا تھا ان کے لڑکوں کو مار ڈالتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا خدا نے چاہا کہ اس ضعیف گروہ پر مہربانی کرے اور انہیں کو سردار بنا دے اور انہیں کو وارث کرے اور ملک میں انہیں کو قدرت دے اور دکھلا دے فرعون اور اس کے لشکر کو اس ضعیف گروہ سے وہ چیز جس سے وہ ڈرتے تھے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے

کہ پہلی دفعہ یعنی قبل از ولادت حضرت موسیٰ جو فرعون نے قتل اولاد بنی اسرائیل کا حکم دیا تھا وہ صرف اس خوف سے تھا کہ وہ بہ سبب کثیر ہونے کے فساد کر کے ملک کو نہ چھین لیں کچھ عجب نہیں کہ یہ قتل کسی مدت تک رہا ہو اور پھر موقوف ہو گیا ہو۔

یہ پہلا حکم قتل اولاد بنی اسرائیل کا تھا مگر جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس آئے اور خدا کے حکم پہنچائے اور کہا کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ دو اس وقت پر فرعون کو بنی اسرائیل کے فساد کرنے کا اور اپنی سلطنت کے زوال کا خوف ہوا اور دوبارہ اس نے تدبیر کی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار ڈالنا چاہیے۔ چناں چہ سورہ مومن میں خدا نے صاف بیان کیا ہے، کہ جب ہمارے پاس سے سچی بات فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس پہنچی تو انہوں نے کہا کہ مار ڈالو ان کے لڑکوں کو جو موسیٰ پر ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو اور فرعون نے کہا کہ ٹھیرو میں موسیٰ کو مار ڈالوں گا مجھ کو خوف ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا اور ملک میں فساد پھیلا دے گا پس صاف ظاہر ہے کہ اسی خوف سے دونوں دفعہ فرعون نے بنی اسرائیل کے لڑکوں یا مردوں کے قتل کا حکم دیا تھا کوئی اور غیبی کرشمہ اس کی بنیاد نہ تھا۔

ہفتم: قحط، ہشتم: طوفان، وجراد، وقمل وصفادع، ودم

یہ تمام امور ایسے ہیں جو ہمیشہ دنیا میں موافق قانون قدرت واقع ہوتے رہتے ہیں حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بھی واقع ہوئے تھے ایسے واقعات کو انسانوں کو کے گناہوں سے منسوب کرنا بھی قانون فطرت کے تابع ہے جس پر انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں اس کی بحث قوم عاد کے قصہ میں بالتفصیل لکھ چکے ہیں اس طرح ان واقعات ارضی وسماوی کو بھی خدا تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے گناہوں سے منسوب کیا ہے۔

قحط کوئی نئی بات نہیں تھی حضرت یوسف کے زمانے میں بھی سخت قحط پڑا تھا حضرت

موسیٰ کے زمانہ میں بھی قحط ہوا جو حضرت موسیٰ کے قصہ میں مذکور ہے۔

طوفان: دریائے نیل کی زیادہ طغیانی سے ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی مینہ اور اولا نکا طوفان بھی آجاتا ہے شام کے پہاڑوں سے اولے برستے ہوئے کبھی کبھی مصر تک پہنچ جاتے ہیں بجلی کی چمک اور گرج بھی ہوتی ہے (دیکھو کیٹو کی بیبکل سیکلو پیڈیا، صفحہ 200) جن ملکوں میں بارش قلیل ہوتی ہے اوراولے اتفاقیہ پڑتے ہیں ان ملکوں میں اس قدر بارش بھی جو اور ملکوں میں معمولی خیال کی جاتی ہے نہایت سخت طوفان کا اثر دکھاتی ہے خصوصاً اس حالت میں جب کہ دریا کی طغیانی بھی اور خصوصاً نیل جیسے دریا کی طغیانی اس کے ساتھ ہوتو پھر قیامت ہی ہوتی ہے اس موسیٰ کے عہد میں طوفان کا واقعہ ایک معمولی واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ جو بزرگی اس میں تھی وہ صرف یہی تھی کہ اس زمانہ میں واقع ہوا جب کہ حضرت موسیٰ وہاں تشریف لے گئے تھے۔

جراد وقمل وصفادع یعنی ٹڈیوں پسوؤں یا اسی قسم کے کسی جانوروں اور مینڈکوں کا کثرت سے پیدا ہو جانا خصوصاً طوفان اور دریائے نیل کے چڑھاؤ کے اترنے کے بعد ایک ایسی بات ہے جو قدرتی طور پر واقع ہوتی ہے حشرات الارض دفعتہ اس کثرت سے پیدا ہوجاتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے پس حضرت موسیٰ کے عہد میں ان حشرات الارض کا پیدا ہو جانا جس قدر کثرت سے وہ پیدا ہو گئے ہوں اور کیسی ہی سخت مصیبت ان کے سبب سے مصریوں پر پڑی ہو کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں ہے جو کو ایک لمحہ کے لیے بھی واقعہ مافوق الفطرت تصور کیا جاوے۔

''دم'' کا لفظ البتہ لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہوگا بعض مفسرین نے اس بات کو کہ تمام دریا اور حوض اور تمام پانی جو برتنوں میں تھا خون ہو گیا غیر قابل یقین خیال کر کے یہ لکھا کہ فرعون اوراس کی تمام قوم کو نکسیر بہنے یعنی ناک سے خون جاری ہونے کی بیماری ہوگئی تھی گو کہ

کسی وباء کا پھیل جانا خصوصاً قحط وطوفان کے بعد کوئی امر بعید از عقل نہیں ہے لیکن اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دریائے نیل کا پانی اگرچہ عموماً نیلے رنگ کا رہتا ہے مگر کبھی طغیانی کے زمانہ میں اس کا رنگ سرخ لال اینٹ کے گہرے رنگ کی مانند ہو جاتا ہے (دیکھو کیٹو ببکل سیکلو پیڈیا صفحہ 599) اور (چیمبرز انسیکلو پیڈیا جلد سوم، صفحہ 786) اور جب کبھی نباتی مادہ کثرت سے آ جاتا ہے تو سبز ہو جاتا ہے (دیکھو انسیکلو پیڈیا برطینیکا، صفحہ 422) پس اسی قسم کے واقعات کے سبب سے اس کا پانی سرخ ہو گیا جس کو دم سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات پانی میں نہایت باریک کیڑے سرخ رنگ کے اس قدر کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ تمام پانی کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے بحر احمر میں بھی اس قسم کی حالت پائی جاتی ہے بحر احمر کے حال میں سالٹ نے لکھا ہے کہ فروری کے مہینہ میں ایک دفعہ جہاز کے گرد کچھ دور تک سمندر نہایت سرخ ہو گیا چوں کہ اس عجیب تبدیلی کا باعث ہم دریافت کرنا چاہتے تھے ہم نے ایک برتن کو پانی میں ڈالا اور اس میں بہت سی وہ چیزیں نکالیں جو پانی میں تیر رہی تھیں وہ جیلی کے مشابہ ایک چیز تھی جس میں بے انتہا چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے اور ہر ایک کے اوپر ایک سرخ دھبہ تھا یہ جانور ایک جگہ جمع ہونے سے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے پانی میں کوئی سرخ چیز گھول دی ہو ارن برگ کو بھی جو ایک بہت بڑا نیچرل فلاسفی کا عالم تھا ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا اور اس نے بھی بحر احمر کی ایسی حالت ہو جانے کی تصدیق کی ہے

پس یہی حالت دریائے نیل کی بھی ہوگی اور جب کہ ثابت ہوا ہے کہ اس کا پانی بھی کبھی سرخ ہو جاتا ہے تو اس کی ایسی حالت ہو جانے پر زیادہ یقین ہوتا ہے ان کیڑوں کا بہت کثرت سے پانی میں جمع ہو جانا بلا شبہ لوگوں کو استعمال سے باز رکھتا ہوگا اور وہ پانی نا قابل استعمال ہو جاتا ہوگا فرعون کے زمانہ میں بھی دریائے نیل سے گھروں میں اور کنوئیں

اور حوضوں میں نلوں کے ذریعہ سے پانی لے گئے تھے پس جہاں جہاں اس کا پانی جاتا ہوگا سب جگہ یہی حال ہو گیا ہوگا اس پانی کو لوگوں نے بلا خیال برتنوں میں بھر لیا ہوگا اور تھوڑی دیر بعد دیکھا ہوگا کہ وہ سرخ مثل خون کے ہے اونچے مقاموں میں جہاں دریائے نیل کا پانی نہ جاتا ہوگا وہاں یہ کیفیت نہ ہوئی ہوگی اور ممکن ہے کہ بنی اسرائیل اونچی زمین پر رہتے ہوں جہاں نیل کا پانی نہ جاتا ہو یا ان کے گھروں میں پانی جانے کے نل نہ ہوں اور ان کے گھروں میں یہ کیفیت نہ ہوئی ہو۔

نہم: غرق فی البحر

فرعون کا بنی اسرائیل کے تعاقب میں جانا اور بنی اسرائیل کا دریا کے پار اتر جانا اور فرعون کا دریا میں ڈوب جانا ایک تاریخی واقعہ ہے اور ہم اس کو نہایت تفصیل سے ایک دوسرے مضمون میں بیان کریں گے۔

دھم: اعتکاف حضرت موسیٰ کا پہاڑ میں

اعتکاف کا واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ حضرت موسیٰ

واوعدنا موسیٰ ثلثین لیلة واتممنها بعشر فتم میقات ربه اربعین لیلة

(7سورہ اعراف138)

بنی اسرائیل کو فرعون کی قید سے چھوڑا کر اور فرعون کو اور اس کے لشکر کو دریا میں ڈبو کر اس جنگل میں نکال لائے جو بحر احمر کی دونوں شاخوں کے درمیان میں ہے اور جس کا نقشہ ہم پہلے ایک مضمون میں دے چکے ہیں۔

یہ کوئی امر زیادہ بحث کے قابل نہیں حضرت موسیٰ تیس دن

واذ وعدنا موسیٰ اربعین لیلة ثم اتخذ ثم العجل من بعده والتم ظالمون (2سورہ بقر 48)

کا اعتکاف کرنے کے لیے پہاڑ گئے تا کہ خدا کی عبادت میں

مصروف ہوں مگر وہاں چالیس دن لگ گئے توریت میں لکھا

ہے کہ چالیس دن اور چالیس رات موسیٰ پہاڑ پر رہے اور نہ روٹی کھائی اور نہ پانی پیا (سفر توریہ ثنی باب 9 ورس 9) زیادہ تر مقصود اس اعتکاف سے یہ تھا کہ خدا کی ہدایت اس بات میں چاہیں کہ اس جم غفیر کی ہدایت وانتظام اور خدا کی عبادت کے لیے کیا قواعد یا احکام قرار دیے جاویں۔

بنی اسرائیل کو چار سو برس سے زیادہ ہو گئے تھے کہ مصر میں رہتے تھے اور گو وہ خدا کو مانتے تھے مگر وہاں کی بت پرستی اور اس کی شان وشوکت کے عادی ہو گئے تھے اور ظاہر میں بھی معبور کے وجود کے موجود ہونے کی خواہش مثل بت پرستوں کے ان کے دل میں سما گئی تھی اس لیے نہایت مشکل بات تھی کہ ان کو ایک ایسے خدائے واحد کی پرستش پر متوجہ کیا جاوے جس کا نہ ظاہر میں کوئی وجود نہ ہے ظاہری وجود میں اور نہ کسی ظاہری شکل میں آ سکتا ہے بلکہ محض بیچون وبچگون وبے رنگ ونمون ہے غالباً یہی بات سب سے زیادہ حضرت موسیٰ کو بھی مشکل تھی اور وہ ضرور اس خیال میں تھے کہ حسید کو ظاہری صورتوں سے اس طرح بنایا جاوے جن کی عبادت تو نہ کی جاوے مگر بنی اسرائیل کی دل بستگی کا ذریعہ ہوں اور اسی وجہ سے انہوں نے بعد میں کروبین کی مجسم شکلیں چاندی وسونے کی بنائیں ہم قبول کرتے ہیں کہ انہوں نے خدا کے حکم سے بنائی ہوں گی، مگر بنائیں جس کا سبب بجز مذکورہ بالا امر کے اور کچھ نہ تھا اور اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو سچی اور ٹھیٹ خدا پرستی اسی طرح بیچون وبچگون وبے رنگ ونمون طریقہ پر جیسا کہ وہ معبور حقیقی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی

موسیٰ سے باوجود اس شان وشوکت کے قائم نہیں ہوسکی! نہ ہم کو کروبین کی حاجت ہے، نہ ہائی پریسٹ کی، نہ کی معبد کی، نہ قربانی سوختنی کی، نہ بخور کی، اور نہ آتش دان کی، نہ خاص پوشاک اور سینہ بند کی، ہم سچے خدا کی پرستش، جنگل میں، دریا میں، پہاڑ میں، گھر میں، بازار میں، اندھیرے میں، اجالے میں، کپڑا پہنے، بن کپڑا پہنے کر سکتے ہیں ہمارا دل ہی خدا کا معبد ہے ہمارا خدا ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور ہم خدا کے ساتھ اور ایسا ساتھ ہے کہ نہ کبھی ہم اس سے چھوٹ سکتے ہیں اور نہ وہ ہم کو چھوڑ سکتا ہے

سبحانہ و تعالیٰ شانہ والحمد للہ رب العالمین

یازدھم: حقیقت کلام خدا با موسیٰ

کلام خدا کا جب تک نہ سنیں یہ تو معلوم نہیں ہوسکتا کہ کیسا ہوتا ہے مگر انسانوں کا کلام جو سننے میں آتا ہے وہ تو یہ ہے کہ زبان اور ہونٹ ہلتے ہیں اس سے بمد دھوائے محیط کے ایک آواز کان تک پہنچتی ہے ہر ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ بلکہ ہر لفظ کے پہلے حرف کے بعد دوسرا حرف نکلتا ہے اور حرفوں سے مل کر لفظ اور لفظوں سے مل کر جملہ ہو جاتا ہے پھر کیا خدا کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟

علمائے اسلام نے کہا ہے کہ تمام انبیائے علیہم السلام خدا کو متکلم کہا ہے اور اس کے کلام کو ثابت کے ہے پس اس کا متکلم ہونا اور خدا کے لیے کلام کا ہونا تو ثابت ہو گیا۔ مگر انہوں نے یہ نہ بتایا کہ ایسا ہی کلام جیسا ہمارا تمہارا ہے یا کسی اور طرح کا لیکن انہوں نے اس پر دوسری بحث قدیم اور حادث ہونے کی چھیڑ دی یعنی اس بات کی کہ خدا کا کلام قدیم ہے یا حادث ہم اس بحث کو اس مقام پر لکھتے ہیں اور امید ہے کہ اسی سے پتہ لگ جاوے گا کہ اس کا کلام کیسا ہوتا ہے۔

قاضی عضد اور علامہ سید شریف شرح مواقف میں تحریر فرماتے ہیں کہ خدا کے کلام کے قدیم و حادث ہونے پر دو متناقض قیاس ہیں ایک قیاس یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام خدا تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور جو صفت خدا کی ہے وہ قدیم ہے پس خدا کا کلام قدیم ہے۔

دوسرا قیاس جو اس کے برخلاف ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا کلام حرفوں ولفظوں کی ترتیب سے مل کر بنا ہے جو ایک بعد دوسرے کے وجود میں آئے ہیں اور جو چیز اس طرح پر بنتی ہے وہ حادث ہوتی ہے پس خدا کا کلام بھی حادث ہے۔

حنبلی پہلے قیاس کو ٹھیک بتاتے ہیں اور اس بات کے قابل ہیں کہ خدا کے کلام میں حرف بھی ہیں اور آواز بھی ہے اور وہ دونوں اپنے آپ قائم ہیں اور قدیم ہیں پس کلام خدا کا بھی قدیم ہے پس گویا حنبلی دوسرے قیاس کے دوسرے جملہ کو کہ ''جو چیز اس طرح پر بنتی ہے وہ حادث ہوتی ہے'' نہیں مانتے۔

قاضی عضد اور علامہ سید شریف دونوں بالاتفاق کہتے ہیں کہ حنبلیوں کا دوسرے قیاس کے دوسرے جملے کو نہ ماننا قطعاً غلط ہے کیوں کہ ہر ایک حرف ان حرفوں میں سے جن سے ان کے نزدیک کلام خدا کا مرکب ہے ایک حرف کے ختم ہونے پر دوسرے حرف کا شروع ہونا موقوف ہے تو وہ دوسرا حرف قدیم نہ ہوا اور جو کہ پہلے حرف کے لیے بھی ختم ہونا ہے تو وہ بھی قدیم نہ رہا اور جو کلام کہ ان سے مرکب ہو کر بنا ہے وہ بھی قدیم نہ رہا۔

کرامیہ فرقہ اس بات میں کہ خدا کے کلام میں حرف اور آواز ہے حنبلیوں کے ساتھ متفق ہیں مگر وہ اس کو حادث مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ خدا کی ذات میں قائم ہے کیوں کہ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ خدا کی ذات میں حوادث کا قائم ہونا جائز ہے۔ پس گویا کرامیہ دوسرے قیاس کو تو صحیح مانتے ہیں اور پہلے قیاس کے دوسرے جملہ کو کہ ''جو صفت خدا کی ہے وہ قدیم ہے'' نہیں مانتے۔

معتزلے خدا کے کلام میں آواز اور حرف کو اسی طرح پر مانتے ہیں جس طرح کہ حنبلی اور کرامیہ مانتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ آواز اور حرف خدا کی ذات میں قائم نہیں ہے بلکہ خدا اس کو دوسری چیز میں پیدا کر دیتا ہے مثلاً لوح محفوظ میں یا جبرئیل میں یا نبی میں اس لیے خدا کا کلام حادث ہے پس معتزلے دوسرے قیاس کو صحیح سمجھتے ہیں اور پہلے قیاس کے پہلے جلمہ کو کہ ''خدا تعالیٰ کا کلام خدا تعالیٰ کی ایک صفت ہے'' نہیں مانتے۔

اس پر قاضی عضد اور علامہ سید شریف فرماتے ہیں کہ جو کچھ معتزلے کہتے ہیں ہم اس سے انکار نہیں کرتے بلکہ ہم بھی وہی کہتے ہیں مگر اس کا نام کلام لفظی رکھتے ہیں اور اس کو حادث مانتے ہیں اور ذات خدا تعالیٰ سے قائم نہیں کہتے اس کے سوا ہم ایک اور امر ثابت کرتے ہیں اور وہ معنی ہیں قائم بالنفس جس کو کہ لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہی حقیقت میں کلام ہے اور وہی قدیم ہے اور وہی خدا تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے اور وہی قدیم ہے اور وہی خدا تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے۔ پس دوسرے قیاس کا جو دوسرا جملہ ہے ''خدا کا کلام حرفوں ولفظوں کی ترتیب سے مل کر بنا ہے'' اس کو نہیں مانتے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ معنی اور عبارت ایک نہیں ہیں کیوں کہ عبارت تو زمانہ میں اور ملک میں اور قوموں میں مختلف ہو جاتی ہے اور معنی جو قائم بالنفس ہیں وہ مختلف نہیں ہوتے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان معنوں پر دلالت کرنا بھی لفظوں ہی میں منحصر نہیں ہے کیوں کہ ان معنوں پر کبھی اشارہ سے اور کبھی کنایہ سے اسی طرح پر دلالت کی جاتی ہے جیسے کہ عبارت سے اور مطلب جو کہ ایک معنی ہے قائم بالنفس وہ ایک ہی ہوتا ہے اور کچھ متغیر نہیں ہوتا باوجودیکہ عبارتیں بدل جاتی ہیں اور دلالتیں مختلف ہو جاتی ہیں اور جو چیز متغیر نہیں ہوتی وہ اس چیز کے سوا ہے جو متغیر ہو جاتی ہے۔ یعنی جو چیز کہ متغیر نہیں ہوتی وہ تو معنی قائم بالنفس ہیں اور وہ چیز سے جو متغیر ہو جاتی ہے یعنی عبارت سے علیحدہ ہیں۔ (انتہیٰ ملخصاً(

جو کچھ کہ قاضی عضد اور علامہ سید شریف نے فرمایا ہے مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی تحقیق بیان کریں مناسب ہے کہ جو باتیں ان بزرگوں نے چھپا رکھی ہیں ان کو کھول دیں تا کہ لوگوں کو صاف معلوم ہو جاوے کہ ان اصول کے ماننے سے جو ان بزرگوں نے قرار دیے ہیں کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

معتزلیوں نے کہا تھا کہ آواز اور حرف دونوں خدا کی ذات میں قائم ہیں بلکہ وہ ان کو دوسری چیز میں پیدا کر دیتا ہے، قاضی صاحب اور علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہاں یہ صحیح ہے مگر ہم اس کا نام کلام لفظی رکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں فرماتے کہ کس کا کلام لفظی۔ خدا کا یا اس کا جس میں خدا نے اس کو پیدا کر دیا تھا۔

پھر اس پر زیادہ تحقیق یہ کرتے ہیں کہ صرف معانی قائم بالنفس اور غیر متغیر ہیں اور در حقیقت وہی کلام ہے اور وہی قدیم ہے اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ خدا کا کلام حرفوں اور لفظوں کی ترکیب سے بنا ہے۔

اس بیان میں صریح نقص یہ ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جاوے تو جو الفاظ قرآن مجید کے ہیں وہ خدا کے لفظ نہیں رہتے بلکہ اس کا لفظ ہوتے ہیں جس میں وہ پیدا کیے ہیں خواہ وہ جبرئیل ہوں یا نبی اور جو کہ وہ کلام انہی لفظوں سے مرکب ہوا ہے تو وہ کلام بھی اسی شخص کا ہوا نہ خدا کا۔

میری تحقیق میں پہلا قیاس صحیح ہے اور میں خدا کے کلام کو اس کی صفت سمجھتا ہوں اور تمام صفات خدا کو قدیم مانتا ہوں اور اسی لیے خدا کے کلام کو بھی قدیم یقین کرتا ہوں۔ مگر حنبلیوں اور کرامیوں سے اس بات میں مختلف ہوں کہ خدا کے کلام میں آواز ہے اور اہل سنت و جماعت کے اس مسئلہ سے مختلف ہوں کہ صرف معانی قائم بالنفس ہیں اور وہی در حقیقت کلام ہے اور وہی غیر متغیر ہے بلکہ میرے نزدیک معانی اور لفظ دونوں قائم بالنفس

ہیں اور دونوں قدیم وجدید متغیر ہیں۔

لفظ بھی حقیقت میں ایک مفید یا مختص معانی ہیں جن پر بولے جانے کے بعد ہم لفظ کا اطلاق کرتے ہیں۔ انسان جو گفتگو کرتا ہے اس وقت بھی الفاظ کا اطلاق کرتے ہیں۔ انسان جو گفتگو کرتا ہے اس وقت بھی الفاظ اس کے نفس میں ان کے بولے جانے کے قبل موجود ہوتے ہیں۔ مگر صرف معانی کو قائم فی الذات ماننے اور معانی اور الفاظ دونوں کو قائم فی الذات مانتے ہیں یہ فرق ہے کہ پہلی صورت میں ان معانی کو الفاظ مختصہ میں تعبیر کرنا لازم نہیں آتا اور دوسری صورت میں بجز الفاظ معینہ مختصہ کے اور کسی الفاظ سے تعبیر نہیں ہو سکتے ۔مثلا

الحمد الله

کلام خدا ہے یہ ذات باری میں مع معانی والفاظ کے اس طرح پر قائم ہے کہ جب تلفظ میں آوے گا تو

الحمد الله

ہی اس کا تلفظ ہوگا

لله الحمد

اس کا تلفظ نہیں ہونے کا۔ نہ ثناء اللہ اس کا تلفظ ہوگا اور ہم قرآن مجید کو اسی معنی کر مع معانی اور الفاظ کلام خدا کہتے ہیں اور قدیم تسلیم کرتے ہیں۔

لفظوں کے قایم بالنفس ہونے میں تقدیم وتاخر نہیں ہوتا۔ اس کو مثال دے کر سمجھانا بلاشبہ مشکل ہے مگر اس طرح پر سمجھ میں یا خیال میں آ سکتا ہے کہ اگر جس طرح ان الفاظ کے نقوش کو آئینہ کے سامنے رکھنے سے وہ سب معا بلا تقدم وتاخر آئینہ میں منقش معلوم ہوتے ہیں تقدم وتاخر لازم نہیں آتا۔ ذات باری کی نسبت ہم ثابت کر چکے ہیں کہ وہ علۃ العلل

تمام چیزوں کی ہے جو ہو چکیں اور باقی ہیں اور ہونے والی ہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ وہ تمام چیزیں ذات باری میں قائم ہوں ان کے ظہور کے زمانہ کے مختلف ہونے اور تبدیل کیفیت و کمیت سے اس چیز میں جو قائم فی الذات ہے حدوث لازم نہیں آتا۔

اس صورت میں قاضی عضد اور علامہ سید شریف کا یہ کہنا کہ ہر ایک حرف ان حرفوں میں سے جن سے کلام خدا مرکب ہوا ایک حرف کے ختم ہونے پر دوسرے حرف کا شروع ہونا موقوف ہے تو وہ دوسرا حرف قدیم نہ ہوا (الیٰ آخرہ) صحیح نہیں رہتا اس لیے کہ اس امر کا وقوع اس وقت ہوتا جب کہ ہم کلام خدا میں حرف اور آواز دونوں مانتے مگر جب ہم کلام خدا میں آواز کو تسلیم نہیں کرتے تو نقص مذکورہ لازم نہیں آتا۔

آواز کی کوئی دوسری حقیقت بجز اس کے کہ ہوا کی مدد اور زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے ہم نہیں جانتے۔ پس اس کو بجنسہ خدا کی صفت قرار دینا اور یہ خیال کرنا کہ خدا کے منہ بھی مثل ہمارے منہ کے ایک حرف دوسرے حرف کے بعد نکلتا ہے بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ پہلے ایک غلط امر کو تسلیم کیا ہے پھر اسکی بنا پر دوسری غلطی قائم کی ہے۔

جب کہ ہم کسی پر خواہ وہ جبرئیل ہو جو حسب اعتقاد جمہور مسلمین خدا اور انبیاء میں مثل ایلچی کے واسطہ ہے۔ اور خواہ وہ خود نبی مبعوث ہو جیسا کہ میرا خاص اعتقاد ہے خدا کے کلام کا نازل ہونا کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ خدا نے اس کے دل میں بجنسہ وہ الفاظ جن کو بعد اس کے وہ تلفظ کرے گا مع ان کے معنی کے جو مقصود ہیں پیدا کیا ہے یا القا کیا ہے اور وہی لفظ بجنسہ بنی نے تلفظ کیے ہیں پس گو اس نبی کا ان لفظوں کو تلفظ کرنا حادث ہو مگر وہ الفاظ مع ان کے معنی کے یا وہ معنی مقید جن کا تلفظ بجز انہی الفاظ کے نہیں ہو سکتا تھا قدیم اور کلام خدا ہیں اور یہی میرا اعتقاد قرآن مجید کی نسبت ہے کہ وہ بلفظہ مع معانیہا قدیم و کلام خدا ہے اور خود خدا نے اپنا کلام پیغمبر خدا میں بلا واسطہ پیدا کیا ہے جیسا کہ میں نے کسی مقام پر

کہا ہے:

ز جبرئیل آمین قرآن بہ پیغامے نمے خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من درام

مگر پیغمبر خدا کا یا ہمارا ان لفظوں کو تلفظ کرنا حادث ہے۔

اس مضمون کو بذریعہ کسی مثال کے سمجھانا بلاشبہ نہایت مشکل ہے مگر ہم ایک قریب ترین مثال سے اس کو سمجھاتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی سبب سے بول نہیں سکتا مگر ایک اپنی تحریر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں پس گو اس تحریر میں آواز نہیں ہے مگر جو لفظ مطابق اس تحریر کے ہماری زبان سے نکلتے ہیں وہ لفظ بلاشبہ اسی کے ہیں جس نے اس کو لکھا ہے اور ہم صرف ان لفظوں کا تلفظ کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ ہمارے لفظ نہیں ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے کہ وہ لفظ بروقت ہمارے تلفظ کے پیدا ہوئے ہیں۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ انبیاء اور اولیاء کوئی غیبی آواز نہیں سنتے۔ سنتے ہوں گے مگر وہ خدا کی آواز نہیں ہے بلکہ وہ اس القا کا اثر ہے جو ان پر ہوا ہے اور وہ انہی کے نفس کی آواز ہے جو ان کے کان میں آئی ہے۔ وہ بیداری میں اسی طرح آواز کو سنتے ہیں جیسے کہ سوتے میں خواب دیکھنے والا سنتا ہے۔ یا جیسے کہ بعضی دفعہ لوگوں کو جو کسی خیال میں مستغرق ہیں بغیر کسی بولنے والے کے کان میں آواز آتی ہے۔

کلام الٰہی کی نسبت جو کچھ خدا نے ہمارے دل میں ڈالا ہے بعینہ وہ وہی ہے جو حضرت مولانا و مرشدنا حضرت شیخ احمد سرہندی نقشبندی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کو القا ہوا تھا چناں چہ اس باب میں جو حضرت ممدوح نے لکھا ہے۔ ذیل میں مندرج ہے۔

حضرت ممدوح نے مکتوب نود و دوم جلد سوم میں جو بنام فقیر ہاشم کشمی تحریر فرمایا ہے اس طرح پر لکھا ہے۔

”پر سیده بودند آں که بعض فرموده اندکه ماکلام حق را مے
شریم دیا ما را با اوتعالیٰ مکالمه مے شود چناں چه ازامام همام جعفر
صادقؓ عنه منقول است که گفت ما زلت اردو الایة حتی سمعتها من
المتکلم بها. و نیز از رساله غوثیه که منسوب بحضرت شیخ عبدالقادر
جیلی است قدس سره مفهوم مے گردد چه معنی است و تحقیق آں نزد
تو چیست؟ بداں ارشدک الله تعالیٰ که کلام حق جل و علا در رنگ
ذات وسائر صفات حق جل شانه، پیچون پیچگوں است و سما ع آں
کلام پیچون نیز بیچون است زیرا که چوں را به بیچوں راه نیست پس
ایں سما ع مربو ط بحاسمه سمع نه باشد که سراسر چون دارد و بے
واسطه حروف و کلمات است و نیز اگر ازبنده کلام است هم بالقاے
روحانی است بے حروف و کلمه و ایں کلام نصیبے ا زبیچونی دارد که
مسمو ع بیچون مے گردد یا آں که گوئم که کلام لفظی که از بنده صادر
مے شود حضرت حق سبحان تعالیٰ آں را نیز به سما ع بیچونی استما ع
مے فر ماید و بے توسط حروف و کلمات و بے تقدیم و تاخیر آں را
میشنود از یجری علیه تعالیٰ زمان یسع فیه التقدیم و التا خیر و ا دراں
موطن که ازبنده سما ع است بکلیت سامع و اگر کلام است هم بکلیة،
متکلم تما م گوش و تمام زبان است روز میثاق ذرات مخرجه قول
الست بر بکم را بے واسطه بکلیت خود شنیدند و بکلیت خود جواب
بلے گفتند تمام گوش بو دند و تمام زبان زیرا که اگر گوش از زبان
متمیز بودے سما ع کلا م بیچون حاصل نیامدے و شایان ارتباط مرتبه

بیچون نہ گشتے لا یحمل عطا یا الملک الا مطایاہ غایة مافی الباب آن
معنی متلقی از راہ روحانیت اخذ نمو دہ بود ثانیا در عالم خیال کہ آن در
انسان تمثال عالم مثال است بصورت حروف و کلمات مرتبہ متمثل مے
گردد و آن تلقی و القا بصورت سماع و کلام لفظی مرتسم مے شود چہ
ہر معنی را دراں عالم صورتے است اگرچہ آن معنی بیچون بود اما
ارتسام بیچون ہم آنجا بصورت چون است کہ فہم و افہام باں مربوط
است کہ مقصود ازاں ارتسام است و چوں سالک متوسط در خود
حروف و کلمات مرتبہ مے یا بد و سماع و کلام لفظی احساس مے نماید
خیال میکنند کہ ایں حروف و کلمات را از اصل شنیدہ است و بے
تفاوت از انجا اخذ کردہ نمے داند کہ ایں حروف و کلمات صور خیالیہ
آن معنی متلقی است و ایں سماع و کلام لفظی تمثال سماع و کلام
بیچونی ، عارف تام المعرفت را باید کہ حکم ہر مرتبہ را جدا مازد
ویکے را بدیگرے ملتبس نہ گرداند پس سماع و کلام ایں اکابر کہ بہ
مرتبہ بیچونی مر بوط است از قبیل تلقی و القاے روحانی است و ایں
کلمات و حروف کہ تعبیر ازاں معنی متلقی باں مے نماید از عالم صور
مثالیہ ، و گروہے کہ گمان بردہ اند کہ ما حروف و کلمات را ازاں
حضرت جل سلطانہ استماع مے نمایم دو فریق اند یکے ازاں دو فریق کہ
احسن ہال اند مے گو بند کہ ایں حروف و کلمات حادثہ مسموعہ دال
اند براں کلام نفسے قدیم و فریق دیگر اطلاق قول بسماع کلام حق جل
شانہ مے نماید وہمیں حروف و کلمات مرتبہ را کلام حق مید انند جل و

علا و فرق نمے کنند درمیان آن که لایق بشان اوتعالیٰ کدام است ، و کدام است که شایان جناب قدس اور نیست

سبحان وهم الجهال البطال لم یعرفوا ما یجوز علی الله سبحانه عما لا یجوز علیه تعالیٰ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت السمیع العلیم الحکیم والصلوة والسلام علیٰ خیر البشرو اله واصحا به الا طهر۔"

حضرت موسی اپنے مقام سے مع اپنے گھر والوں کے مصر کو روانہ ہوئے۔ جو جو خیالات حضرت موسیٰ کونسبت ان مشکلات کے ہوں گے جو مصر میں پیش آنے والی تھیں اور اپنی قوم کوفرعون کے ظلم سے نجات دینے کی مشکلات نے ان کے دل کوکس قدر غمگین اور متفکر کیا ہوگا اوران تمام حالتوں کے سبب ان کوذات باری میں کس قدر استغراق رہا ہوگا۔ کیوں کہ ایسی مشکلات لاینحل کے حل کرنے میں بجز ذات باری پر بھروسہ کے دوسرا کوئی بھروسہ نہ تھا۔ یہ تمام اسباب تھے حضرت موسیٰ کو ذات باری میں کامل طور پر مستغرق ہوجانے کے اورفطرت نبوت جوخدا نے ان میں پیدا کی تھی سب سے زیادہ اس استغراق کا باعث تھی۔

اتفاق سے وہ رستہ بھولے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے ایک طرف آگ دیکھی تو اس طرف گئے۔ جب اس کے قریب پہنچے تو انہوں نے اس جنگل کو پہچانا کہ وہ وادی ایمن یا طویٰ ہے جو پہلے سے نہایت مقدس اور متبرک اور خدا کی جگہ سمجھا جاتا تھا۔ دفعتہً اس بات کے معلوم ہونے سے خدا کی طرف طبیعت کا ذوق اور خدا کا شوق بھڑک اٹھا اوران کے کان میں آواز آئی۔ یا موسیٰ

انی انا ربک. انه انا الله العزیز الحکیم . انی انا الله رب العالمین.

فاخلع نعليک انک بالوادی المقدس طویٰ.

یہ آواز کسی بولنے والے کی نہ تھی نہ خدا کی آواز تھی کیوں کہ جیسا ہم نے ابھی بیان کیا خدا کے کلام میں آواز نہیں ہوتی ۔ بے شک خدا نے یہ الفاظ جو کلام خدا تھے موسیٰ کے دل میں ڈالے اور خود موسیٰ کے دل کی آواز اس کے کان میں آئی جو خدا کے پکارنے سے تعبیر کی گئی۔

اسی جوش دلی اور استغراق قلبی کا سبب تھا جس سے حضرت موسیٰ کو اپنی حیثیت کا ذہول ہوا اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر کہنے گلے۔

رب ارنی انظر الیک.

خدا نے جواب دیا نہ اپنی آواز سے اور نہ کسی فانی جسم میں آواز ڈالنے سے بلکہ خود موسیٰ کے دل میں اپنا کلام ڈالنے سے کہ۔

لن ترانی

جہاں جہاں خدا اور موسیٰ کلام ہونے کا ذکر ہے اس کی یہی ماہیت ہے اور

و کلم الله موسیٰ تکلیما.

کی یہی حقیقت ہے

ھذا ما افھمنی الله حقیقة کلامه العظیم وھو الھادی الی الصراط المستقیم

دوازدھم: حقیقت تجلی للجبل

وھل اتک حدیث موسیٰ. اذرای نا رافقال لا ھلة امکثوا انی انست لا ھلہ امکثو انی انست نارا لعلی آتیکم منھا بقبس ا واجد علی النار ھدیٰ. فلما اتا ھا نودی یاموسیٰ. انی انا ربک فاخلع نعلیلک انک بالوادی المقدس طویٰ.) ۳۰ طه. ۸. ۱۲)

پہاڑ پر خدا کی تجلی ہونے اور آگ کی صور میں نزول فرمانے کی نسبت تفسیروں میں بہت کچھ بھرا ہوا ہے مگر قرآن مجید میں یہ واقعہ نہایت صاف صاف اور سیدھے لفظوں میں بیا نہوا ہے جس میں کچھ بھی پیچیدہ بات نہیں ہے چناں چہ سورۃ طہ میں خدا نے فرمایا کہ کیا تجھ تک موسیٰ کا قصہ پہنچا ہے، جب کہ اس نے آگ کو دیکھا، پھر اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہر جاؤ مجھ کو آگ دکھائی دی ہے، شاید میں تمہارے لیے اس میں سے جلتی ہوئی لکڑی لے آؤں یا اس آگ پر کسی راہ بتانے والے کو پاؤں۔ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچے اس کو پکارا گیا یعنی آواز آئی کہ اے موسیٰ بے شک میں تیرا خدا ہوں اپنی جوتی پاؤں سے اتار بے شک تو پاک میدان میں ہے۔

اذ قال موسیٰ لا ھلہ انی آنست نار اساتیکم منھا بخبرا وا تیکم بشھا ب قبس لعلکم تصطلون . فلما جاء ھا نودی ان بورک من فی النار ومن حولھا و سبحان اللہ رب العالمین . یا موسیٰ انه انا اللہ العزیز الحکیم (۲۷ . نمل. ۷. ۹)

یہی مضمون کسی قدر الفاظ کی تبدیل سے سورہ نمل میں آیا ہے کہ جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھ کو آگ دکھائی دی ہے میں اب وہاں سے تمہارے لیے کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے لیے جلتی لکڑی لاتا ہوں تا کہ تم تاپو۔ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آیا تو آواز دی گئی کہ برکت دی گئی اس کو جو آگ کے قریب ہے (یعنی موسیٰ کو) اور اس کو جو اس کے گرد ہے (یعنی ہارون کو جو موسیٰ کے لوگوں کے ساتھ تھے) اور پاک ہے اللہ پروردگار عالموں کا اے موسیٰ ٹھیک بات یہ ہے کہ میں ہوں خدا زبردست حکمت والا۔

فلما قضی موسیٰ الا جل و سار باهله انس من جانب الطور نارا قال لا هله امكثوا انی انست نارالعلی آتیكم منها یخبروا جزوة من النار ولعلكم تصطلون . فلما اتا هانو دی من شاطئی الواد الا یمن فی البقعة المبار كه من الشجرة ان یا موسیٰ انی انا الله رب العالمین.(۲۷ . قصص . ۲۹ و . ۳۰)

اور سورۃ قصص میں اس طرح فرمایا ہے کہ جب موسیٰ مدین سے اپنے گھر والوں کو لے کر غالباً مصر کے روانہ ہوا تو اس نے طور کی جانب آگ دیکھی اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہرو میں نے آگ کو دیکھا ہے شاید میں وہاں سے تمہاری کوئی خبر یا کچھ تھوڑی سی آگ لاؤں تا کہ تم تاپو۔ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آئے تو مبارک میدان کے کنارہ سے مبارک جگہ میں درخت کی طرف سے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ بے شک میں اللہ ہوں پروردگار عالموں کا۔

اور سورۃ اعراف میں یوں آیا ہے کہ۔

ولما جاء موسیٰ لمیقا تنا و كلمه ربه قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی ولا كن انظر الی الجبل فان استقر مكانه قسوف ترانی فلما

تجلی ربه للجبل جعله دکا وخر موسیٰ صعقا . فلما افاق قال سبحانک تبت الیک وانا اول المومنون. (۷. سورہ اعراف . ۱۳۹ و ۱۴۰)

جب موسیٰ ہماری مقرر کی ہوئی جگہ میں آیا اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا تو موسیٰ نے کہا اے پروردگار اپنے تئیں مجھے دکھلا دے۔ خدا نے کہا کہ تو مجھے نہ دیکھے گا مگر اس پہاڑ کی طرف دیکھ پھر اگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہے تو مجھ کو بھی دیکھ لے گا۔ پھر جب اس کے پروردگار نے پہاڑ کے لیے تجلی کی تو اس کو ٹکڑے ٹکرے کر دیا اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر۔ پھر جب ہوش آیا تو کہا کہ پاک ہے تو معافی مانگتا ہوں تجھ سے اور میں پہلا ایمان والوں میں ہوں۔

اگر ان قصوں اور کہانیوں سے قطع نظر کی جاوے جو یہودیوں نے اس کی نسبت بنالی ہیں اور انکی کتابوں میں مندرج ہیں اور جن کی پیروی کر کے ہمارے ہاں کے مفسروں نے انہی قصوں کو مختلف طرح پر اپنی تفسیروں میں بھر دیا ہے اور صرف قرآن مجید کی آیتوں پر غور کیا جاوے تو ان آیتوں سے مندرجہ ذیل امور پائے جاتے ہیں۔

ا۔ موسیٰ نے جو آگ دیکھی تھی حقیقت میں وہ آگ ہی تھی نہ خدا تھا اور نہ خدا کا نور اور نہ ہرے سبز درخت میں سے وہ آگ روشن ہوئی تھی اور درخت نہیں جلتا تھا جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ صرف بات اس قدر تھی کہ درحقیقت حضرت موسیٰ نے پہاڑ کی جانب آگ جلتی ہوئی دیکھی رستہ پر آگ جلانا پرانی قوموں کا دستور تھا۔ رات کا وقت اور موسم سردی کا تھا اور جنگل میں حضرت موسیٰ رستہ بھی بھول گئے تھے انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ٹھیرو میں وہاں جاتا ہوں یا وہاں کوئی شخص رستہ بتانے والا مل جاوے گا۔ یا میں تمہارے لیے وہاں سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی لے آؤں گا جس سے تم تاپنا تاکہ سردی سے بچو۔

یہ واقعہ کوہ سینا یا کوہ طور کے قریب موسیٰ پر گزرا تھا جب کہ وہ مدین سے اپنے گھر کے لوگوں کو لیکر مصر کو جاتے تھے۔ ہم نے سورۃ بقر کی تفسیر میں اس بات کو کامل تحقیقات سے ثابت کر دیا ہے کہ طور سینا آتشیں پہاڑ تھا اس میں سے جو لو نکلی ہو گئی اسکو حضرت موسیٰ نے دیکھ کر یہ بات کہی کہ میں نے آگ دیکھی ہے وہاں سے کوئی خبر یا تھوڑی سی آگ لے کر آتا ہوں۔

۲۔ ان آیتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو آواز موسیٰ کو وہاں آئی یا جو کلام خدا نے موسیٰ سے کیا اس کو اس آگ سے کچھ تعلق نہ تھا۔ سورۃ طہٰ اور سورہ نمل میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت موسیٰ آگ کے پاس آئے تو ان کو آواز دی گئی۔ نہ وہاں یہ بیان ہوا ہے کہ آگ نے آواز دی نہ یہ بیان ہوا ہے کہ آگ میں سے آواز آئی بلکہ باوجودیکہ آگ کا ذکر وہاں موجود ہے اور پھر نودی صیغہ مجہول کا آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آواز یا کلام کو آگ سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ مثلاً ایک شخص دریا میں سے پانی بھرنے جاوے اور وہ کہے کہ جب میں دریا کے قریب پہنچا تو میں نے پکارنے کی آواز سنی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خواہ مخواہ دریا میں سے وہ آواز آئی۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ آگ کے قریب پہنچے تو ان کے کان میں آواز آئی۔ پس اس بات کا قرار دیانکہ وہ آواز آگ میں سے آئی تھی کہ کسی طرح قرآن مجید سے نہیں پایا جاتا۔

علاوہ اس کے سورۃ قصص میں بیان ہوا ہے کہ مبارک جنگل کے کنارے سے ایک درخت کی طرف سے وہ آواز آئی تھی اور یہ آیت نص صریح اس بات کی ہے کہ آگ میں سے آواز نہیں آئی تھی۔

سورہ قصص کی آیت میں آواز کا آنا سن الشجر ہ بیان ہوا ہے لفظ من سے خاص درخت میں سے آواز کا آنا نہیں ثابت ہوتا کیوں کہ اس آیت میں خود خدا نے جانب کے

معنی کی تصریح کر دی ہے جہاں فرمایا ہے من جانب الطّور اور اسی تصریح پر

مـن شـاطئی الوا دیٰ لا یمن. ای من جانب الشاطیٰ الوادی لا یمن.

من الشجرۃ ای من جانب الشجرۃ محمول

کیا جاتا ہے اور یہ خیال کرنا کہ یہ شجر وہ شجر تھا جس میں آگ روشن ہوئی تھی اور درخت سبز کا سبز تھا اور نہیں جلتا تھا اور حضرت موسیٰ نے اس سبز درخت میں آگ دیکھی تھی یہودیوں کی کتابوں کی کہانیاں اور بے ثبوت قصے ہیں۔ قرآن مجید سے مطلق ثابت نہیں ہے۔ سورۃ یاسین میں جو آیا کہ

من الشجر الاخضر نارا.

اس کو حضرت موسیٰ کے قصہ سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

۳. تجلی اللجبل

کی نسبت بہت تھوڑی گفتگو کرنی ہے۔ حضرت موسیٰ نے یہ کہا۔

رب ارنی انظر الیک.

اس کی تفصیل سورۃ بقر میں بیان ہو چکی ہے کہ کسی حالت ذہول میں حضرت موسیٰ نے یہ ناممکن خواہش خدا سے کی تھی اس کا جواب خدا کی طرف سے بجز۔

لن ترانی.

کے اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا مگر جو کے خدا کا وجود اس کی تمام مخلوقات سے اور خصوصا ایسی مخلوق سے جو لوگوں کی آنکھ میں زیادہ تر عجیب ہیں ثابت ہوتا ہے اس لیے خدا نے حضرت موسیٰ کو اس عجیب مخلوق کی طرف متوجہ کیا جو ان کے قریب موجود تھی اور جس سے خدا کی شان وقدرت ظاہر ہوتی تھی۔ یعنی اس آتشیں پہاڑ کی طرف جو روشن ہونا شروع ہوا تھا اور جس کی لو کو حضرت موسیٰ دیکھ کر آگ لینے دوڑے تھے مگر جب وہ پہاڑ بھڑ کا اور گر جا

اوراس کے پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہوکراڑے تو حضرت موسیٰ غش کھا کر گرے۔ پھر جب ہوش آیا تو اس سوال سے توبہ کی اور کہا

انا اول المومنون

تجلی خدا کی اس کی تمام مخلوق میں موجود ہے۔ جیسا کہ ہم نے سورۃ بقر میں بیان کیا ہے پس

فلما تجلی ربه للجبل

کے معنی یہ ہیں کہ۔

فلما ظهر شان ربه و كمال قدرتة على الجبل استرهب موسیٰ و خر صعقا.

سبزدھم: بیان کتابت فی الالواح

قال یاموسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالانی وبکالمی فخذ ما اتیتک و کن من الشاکرین و کتبنالہ فی الا لواحمن کل شی موعظۃ و تفصیلا لکل شئی فخذھا بقوۃ وامر قومک یا خذوا با حسنھا ساوریکم دارالفاسقین. سورۃ اعراف. ۱۴۱ و ۱۴۲.

یہ لوحیں پتھر کی تختیاں تھیں جن پر وہ احکام کھدے ہوئے تھے جو بنی اسرائیل کے لیے خدا نے دئے تھے۔ توریت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جب خدا نے موسیٰ نے ان تمام حکموں کو جو خدا نے دئے تھے لکھ لیا۔ (سفر خروج باب ۲۴ ورس ۴) اس سے ثابت قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو لکھنا آتا تو دوسری جگہ ہے کہ۔ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ میرے پاس پہاڑ پر آ تا کہ پتھر کی لوحیں اور توریت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں تجھ کو دوں تا کہ بنی اسرائیل کو تعلیم کرے (سفر خروج باب ۲۴ ورس ۱۲) اور ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ۔ جب خدا موسیٰ سے بات چیت کر چکا تو لوحیں شہادت کی یعنی پتھر کی لوحیں جو خدا کی انگلی سے لکھی ہوئی تھیں موسیٰ کے سپر کیں۔ (سفر خروج باب ۳۱ ورس ۱۸) اور ایک جگہ پھر لکھا ہے کہ چالیس دن رات پہاڑ پر رہنے کے بعد خدا نے دو پتھر کی لوحیں جو خدا کی انگلی سے لکھی گئی تھیں موسیٰ کو دیں اور جو کچھ خدا نے پہاڑ میں بنی اسرائیل کے سرداروں سے آگ کے بیچ میں کہا تھا لکھا گیا تھا (سفر توریہ مثنیٰ باب نہم ورس ۱۰ و ۱۱) بعد اس کے جب حضرت موسیٰ ان لوحوں کو لیکر آئے اور ہارون پر خفگی ہونے کی حالت میں ان کو پھینک دیا اور وہ ٹوٹ گئیں تو خدا نے موسیٰ

کو حکم دیا کہ۔ اپنے لیے پتھر کی دو لوحیں پہلی لوحوں کے برابر بنا دے اور میرے پاس پہاڑ میں لے آ اور ان کے لیے لکڑی کا ایک صندوق بنا۔ جو کلمات کہ پہلی لوحوں پر لکھے ہوئے تھے۔ وہ میں پتھر ان لوحوں پر لکھ دوں گا۔ موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور خدا نے پہلی تحریر کے موافق ان دس کلموں کو جو خدا نے بنی اسرائیل پر پہاڑ پر آگ کے بیچ میں سے کہے تھے لکھ دئے اور لوحیں موسیٰ کو دے دیں موسیٰ نے احتیاط سے ان کو صندوق میں رکھ چھوڑا (سفر توریہ مثنیٰ باب ۲۰ ورس الغایت ۵) یہ بات ہر کوئی تسلیم کرسکتا ہے کہ خدا کی شان اور اس کے تنزہ سے بعید ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ یا اپنی انگلی سے مثل ایک سنگ تراش کے پتھر پر عبارت کندہ کرے۔ یہودی اور عیسائی اور وہ تمام لوگ بھی جو ایسے واقعات کو ہمیشہ ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں ان لفظوں کے جو توریت میں ہیں ظاہری معنی نہیں لیتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان لفظوں سے یہ مراد ہے کہ خدا کی قدرت سے وہ کلمات اس پر کھد گئے تھے۔ تمام حالات سے اور اس طرز بیان سے جو توریت میں آیا ہے بخوبی پایا جاتا ہے کہ وہ لوحیں خود حضرت موسیٰ نے بنائی تھیں اور جو احکام خدا نے ان کو دئے تھے وہ خود حضرت موسیٰ نے ان پر کندہ کیے تھے۔

وقال وهب کانت من صخرة صمالينها الله موسیٰ عليه السلام (تفسير كبير)

ہمارے علمائے مفسرین نے اس بات پر بحث کی ہے کہ وہ لوحیں کس چیز کی تھیں اور کے تھیں بعصوں نے کہا دس تھین بعضوں نے کہا سات تھیں کسی نے کہا زمرد کی تھیں کسی نے کہا سبز زبرجد کی تھیں اور سرخ یاقوت کی تھیں۔ حسن نے کہا کہ لکڑی کی تھیں جو آسمان سے اتری تھیں اور وہب کا قول ہے کہ وہ سخت پتھر کی تھیں ان کو خدا نے موسیٰ کے لیے نرم کر دیا تھا۔

واما کیفیة الکتا بة فقال ابن جریح کتبها جبرئیل بالقلم الذی کتب به الذکر و استمد من نهر النور واعلم انه لیس فی لفظ الایه مایدل علیٰ کیفیة ت لک الالواح و علیٰ کیفیة تلک الکتابة فان ثبت ذلک التفصیل بدلیل منفصل قوی و جب القول به والا و جب السکوت عنه (تفسیر کبیر)

بہرحال وہ لوحیں کسی چیز کی ہوں وہ چنداں کے قابل نہیں ہیں جو امر بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ ان پر لکھا کس نے تھا ہمارے علما نے درحقیقت اس میں سکوت اختیار کیا ہے اگرچہ بعضوں کا قول ہے کہ جبرائیل نے لکھا تھا مگر تفسیر کبیر میں قول فیصل یہ لکھا ہے کہ آیت کے لفظوں سے کتابت فی الالواح کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی پس اگر اور کسی قوی دلیل سے اس کو کیفیت معلوم نہ ہو تو سکت کرنا چاہیے۔

میں یہ بات کہنی چاہتا ہوں کہ آیت کے لفظوں سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ ان لوحوں کا کاتب نہ تھا کیوں کہ تمام قرآن مجید میں لفظ ''کتبنا'' کا جہاں آیا ہے اس سے خدا کی نسبت فعل کتابت کی مراد نہیں لی گئی بلکہ مقرر کرنے فرض کرنے کے معنی لیے گئے ہیں چناں چہ ''کتبنا'' کے ہر جگہ سب علماء نے یہی معنی قرار دئے ہیں ''علی'' اور ''لہ'' جو کتابت کے صلہ میں آتا ہے اس سے کچھ تغیر معنی میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ''فی'' کے صلہ میں آنے سے بھی کچھ تغیر واقع نہیں ہوتا چناں چہ سورۃ انبیاء کی ایک سو پانچویں آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں ''ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون'' یہ بات ظاہر ہے کہ زبور کا لکھنا یعنی فعل کتابت کسی نے بھی خدا کی طرف منسوب نہیں کیا پس اس کے معنی یہی ہیں کہ ''فرضنا فی الزبور'' پس قرآن مجید کی کوئی آیت اس بات پر اشارہ بھی نہیں کرتی کہ ان لوحوں کا کاتب خدا تھا۔ بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ کبھی بندوں کے اور اشیاء کے بعض

افعال کو اپنی طرف نسبت کرتا ہے اس طرح بھی فعل کتابت الواح کا خدا نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔

اب رہی یہ بات کہ پھران پر کس نے لکھا تھا حضرت موسیٰ کے سوا وہاں اور کوئی لکھنے والا نہ تھا۔ وھب نے جو یہ کہا ہے کہ وہ سخت پتھر کی لوحیں تھیں خدا نے موسیٰ کے لیے ان کو نرم کر دیا تھا۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وھب کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ ہی ان کے لکھنے والے تھے۔

حضرت موسیٰ ایک مہینہ میں واپس آنے کا اقرار کر کے پہاڑ پر گئے تھے ان کو جو مہینہ بھر عبادت میں مشغول رہنے کا حکم ہوا وہ اسی کو میعاد عطائے احکام سمجھے حالاں کے احکام اس کے بعد ملنے کو تھے چناں چہ دس روز میں وہ احکام ملے یا ان کے کھودنے میں دس دن لگ گئے۔ غرض کہ چالیس دن رات ہو گئے خدا نے جو احکام ان کو وحی سے بتائے تھے انہوں نے چاہا کہ انکو پتھر کی لوحوں میں کندہ کرلیں اور بنی اسرائیل کو جا کر دکھائیں۔ وعدہ سے دس دن زیادہ لگ جانے سے بنی اسرائیل کو ان کو واپس آنے کی توقع جاتی رہی اور انہوں نے اپنے لیے بطور دیوتا کے بچھڑا بنالیا اور اس کی پوجا کرنے لگے۔

چہاردھم۔ اتخاذ عجل

واتخذ قوم موسیٰ من بعده من حلیهم عجلا جسدا له خوار الم یروانه لا یکلمهم ولا یهدیهم سبیلا. ۷. سوره اعراف . ۱۴۶ .

وما اعجلک عن قومک یاموسیٰ قال هم اولاء علی اثری و عجلت الیک رب الترضی قال فانا قد فتنا قومک من بعدک واضلهم السامری فرجع موسیٰ الی قومه عضبان اسفا قال یقوم الم بعدکم ربکم وعدا حسنا افطال علیکم العهد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتهم موعدی بملکنا ولکنا حملنا اوزارا من زینة القوم فقذ فنا ها فذلک القی السامری فاخرج لهم عجلا جسدا له خوار فقالوا هذا الهکم واله موسیٰ فنسی افلا یرون الا یرجع الیهم قولا ولا یملک لهم ضرا ولا نفعا ولقد قال لهم هارون من قبل یاقوم انما فتنتم به وان ربکم الرحمن فاتبعونی واطیغوا امری قالو الن نبرح علیه عاکفین حتی یرجع الینا موسیٰ قال یا هرون ما منعک اذ رایتم ضلوا الا تتبعن افعصنیت امری قال یا بنوم لا تاخذ بلحیتی ولا براسی انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی قال فما خطبک یا سامری قال بصرت بمال لم تبصروابه فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وکذلک سولت لی نفسی. ۲۰ . سورة طه ۸۵ لغایت ۹۶ .

بچھڑا بنانے کا کچھ مختصر سا ذکر ہم نے سورہ بقر کی تفسیر میں لکھا ہے مگر اس مقام پر اس کے متعلق خاص باتوں سے بحث کرنی چاہتے ہیں اور اول ان آیتوں کو لکھتے ہیں جنسے وہ بحث متعلق ہے۔

خدا نے سورہ اعراف میں فرمایا ہے اور بنایا موسیٰ کی قوم کی موسیٰ کے پہاڑ پر جانے کے بعد ان کے گہنوں سے بچھڑا مجسم کہ اسکے لیے آواز تھی یعنی اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی ۔

اور سورۃ طٰہٰ میں فرمایا ہے کہ اے موسیٰ کیا چیز مجھ کو تیری قوم سے چھوڑا کر ایسی جلدی لے آئی۔ موسیٰ نے کہا کہ وہ لوگ میری پیروی پر ہیں اور میں جلد چلا آیا تیرے پاس تا کہ تو راضی ہو۔

خدا نے کہا کہ بے شک میں نے تیری قوم کو تیرے پیچھے آفت میں ڈالا ہے اور سامری نے اس کو گمراہ کیا ہے۔ پھر لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم کے پاس غصہ میں بھرا ہوا غمگین۔ کہا اے میری قوم کے لوگو کیا تمہارے پروردگار نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا۔ کیا تم پر لمبی مدت گزر گئی یا تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے غضب نازل ہو پھر تم نے میرے وعدہ کے برخلاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اختیار سے تیرے وعدہ سے برخلاف نہیں کیا ولیکن ہم سے فرعون کی قوم کے گہنوں کا بوجھ اٹھوایا گیا پھر ہم نے اس کو پھینک دیا اور اسی طرح سامری نے ڈال دیا (آگ میں) پھر اس نے ان کے لیے ایک بچھڑا نکالا مجسم کہ اس کے لیے آواز تھی یعنی اس میں سے آواز تھی یعنی اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔ پھر ان لوگوں نے کہا کہ یہ تمہارا پروردگار اور موسیٰ کا پروردگار ہے پھر موسیٰ بھول گیا ہے۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ وہ پھر کر ان کی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ اس کے اختیار میں ان کے لیے ضرور پہنچانا ہے نہ فائدہ۔ بے شک اس سے پہلے ہارون نے ان

سے کہا تھا کہ اے میری قوم تم اس کے سبب سے آفت میں پڑے ہو اور بے شک تمہارا پروردگار خدائے مہربان ہے پھر تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کو بجالاؤ انہوں نے کہا کہ ہم تو اسی کے گرد بیٹھے رہیں گے جب تک پھر ہمارے پاس موسیٰ آوے۔ جب موسیٰ آئے تو انہوں نے کہا اے ہارون کس چیز نے تجھ کو اس بات سے روکا کہ جب تو نے ان کو گمراہی میں دیکھا تو میری پیروی کرے کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ ہارون نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (بھائی) تم میری ڈاڑھی اور میرے سر کے بال مت پکڑو بے شک میں اس بات سے ڈرا کہ تم یہ نہ کہو تو نے تفرقہ ڈال دیا بنی اسرائیل میں اور میری بات کو نگاہ نہ رکھا ۔موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے اس نے کہا مجھے ایسی بات سوجھی جو کسی کو وہ نہ سوجھی تھی پھر میں۔ رسول کے نقش قدم سے (یعنی حضرت موسیٰ کے نقش قدم سے جب کہ وہ پہاڑ کو جاتے تھے) مٹی کی مٹھی بھر لی پھر اسکو بچھڑے میں میں نے ڈال دیا اور اس طرح میرے نفس نے مجھ کو دھوکا دیا۔

قرآن کے لفظ ہم نے اس مقام پر لکھے ہیں اور ان کا مطلب بھی جو صاف صاف قرآن کے لفظوں سے نکلتا ہے لکھ دیا یا اب ہمارے عجائب پرست مفسروں نے اس پر لغو و بے ہودہ قصوں پر قصے باندھ دئے ہیں۔ پہلے تو یہ قرار دیا کہ اس بچھڑے میں اسی طرح کی آواز تھی جس طرح کہ سچ مچ کی اور خدا کی پیدا کی ہوئی بچھڑے میں آواز ہوتی ہے پھر ضرور ہوا کہ اس کا کوئی سبب بھی قرار دیں اس لیے ''الرسل'' کے لفظ س تو جبرئیل مراد لیے۔ ''بصرت'' سے یہ معنی لیے کہ سامری نے جبرئیل کو دیکھا تھا اور کسی نے نہیں دیکھا تھا اور وہ کہاں عین اس وقت جب کہ بحر احمر سے بنی اسرائیل گذر رہے تھے اور فرعون تعاقب میں تھا اور فرعون کے لشکر اور بنی اسرائیل کے لشکر کے درمیان میں جبرئیل آ گئے تھے اس وقت سامری نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا اور نہایت دور اندیشی سے ان کی یا ان کے گھوڑے کے

(کیوں کہ بعض مفسرین کے نزدیک اس وقت گھوڑے پر چڑھے ہوئے تھے) پاؤں تلے کی مٹی اٹھالی کہ کسی وقت کام آوے گی اور یہاں اس کو کام میں لایا اور بچھڑے کے منہ میں ڈال دی وہ سچ مچ کے خدا کے پیدا کئے ہوئے بچھڑے کی مانند بولنے لگا۔

ان خرافات ولغویات کا کچھ ٹھکانا ہے؟ کیسے جبرئیل؟ وہ کہاں تھے؟ کجا سمندر کہاں کی بات کہاں لے دوڑے سمندر میں جبرئیل کا آنا کیسا انکا گھوڑے پر سوار ہونا کیسا اللہ کے رسول یعنی موسیٰ وہاں موجود تھے جن کی طرف صاف اشارہ ہے ہمارے مسفرین خدا کو بخشے ان کو چھوڑ کر سمندر میں جاڈوبے۔

ایک لفظ بھی قرآن مجید کا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اس بچھڑے میں سچ مچ کی اور خدا کے پیدا کیے ہوئے بچھڑے کی مانند آواز تھی بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامری نے اس بچھڑے کو اس طرح بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی ہزاروں جانور اب بھی کاریگر اس طرح سے بناتے ہیں کہ وہ اڑتے ہیں ہلتے ہیں حرکت کرتے ہیں بولتے ہیں۔ سامری نے بھی اس بچھڑے کو ایسی کاریگری سے بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی سیدھے مطلب کو ٹیڑھا کرنا ہمارے مفسروں کی عجائب پرستی اور یہودیوں کی تقلید کے سوا کچھ نہیں ہے مذہب اسلام اور خدا کا کلام یعنی قرآن مجید ان سب لغویات سے پاک ہے۔

وقال اکثر المفسرین من المعتز له انه کان قد جعل ذلک العجل مجوفا و وضع فی جونه الا نا بیب ویظهر منه صوت مخصوص یشبه خوار العجل وقال آخرون انه جعل ذلک التمثال اجوف وجعل تحته فی الموضع الذی نصب فیه العجل من ینفخ فیه من حیث لا یشعر یه الناس فسمعوا الصوت من جوفه کالخوار . قال صاحب هذا القول والناس قد یفعلون الان فی هذه التصاویر التی یجرون فیه الماء علی سبیل الفوارات

وما یشبه ذلک فبهذا الطریق وغیره اظهر الصوت من ذلک التمثال ثم القی لی الناس ان ھذه العجل الھھم والہ موسیٰ. (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحه ۱۰۳)

تاول الخوارعلی ان السامری صاغ عجلا وجعل فیه خروقا یدخله الریح فیخرج منھا صوت الخوار ودعا ھم الی عبادتة فاجا بوه وعبدوه . عن الجبائی.

قبل انه اختال با دخال الریح کما یعمل ھذه الالات التی تصوف یا لجبل عن الزجا ج والجبائی والبلخی (تفسیر مجمع البیان)

یہی قول معتزلی عالموں کا بھی ہے چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ۔ اکثر متعزلی مفسروں کا یہ قول ہے کہ سامری نے وہ بچھڑا اندر سے کھوکھلا بنایا تھا اوراس نے اندر نلیاں لگائی تھیں ان سے آواز بچھڑے کی آواز کے مشابہ نکلتی تھی اوراور مفسروں نے یہ کہا کہ وہ مورت کھوکھلی تھی اور جہان وہ بچھڑا کھڑا کیا گیا تھا اس کے نیچے ایک ایسا مقام تھا جہاں ایک شخص کھڑا ہوکر اس میں پھونکتا تھا اورلوگ اس کونہیں جانتے تھے اس کے پیٹ میں سے بچھڑے کی مانند آواز سنتے تھے۔ اس قول کے قائل نے کہا کہ اب بھی لوگ ان مورتوں میں جن میں پانی کے فوارے چھوٹتے معلوم ہوتے ہیں اوراسی قسم کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں ایسا ہی کرتے ہیں۔ پس اسی طرح اس بچھڑے کی مورت سے آواز نکالی تھی پھرلوگوں کو بتایا کہ یہ بچھڑا ان کا خدا اور موسیٰ کا خدا ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں لکھا ہے کہ جبائی نے بچھڑے کی آواز کی نسبت بیان کیا ہے کہ سامری نے بچھڑا بنایا اس کو اندر سے خالی رکھا اس میں ہوا جاتی تھی پھر اس سے بچھڑے کی آواز کی مانند آواز نکلتی تھی اوراس نے لوگوں سے اس کی پوجا کرنے کو کہا ان لوگوں نے مان

لیا اور اس کی پوجا کی۔

اور اسی تفسیر میں زجاج اور جبائی اور بلخی کا قول ہے کہ سامری نے بچھڑے میں ہوا کے بھر دینے سے فریب کیا تھا جس طرح اس قسم کی چیزیں دھوکا دینے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔

بات صرف اس قدر ہے کہ مصر میں رہنے سے بنی اسرائیل کے دل میں بت پرستی کا خیال جما ہوا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کے لیے کوئی دیوتا بنایا جاوے حضرت موسیٰ سے بھی انہوں نے چاہا تھا کہ ان کے لیے ایک دیوتا بناویں انہوں نے ان کو دھمکا دیا۔ جب وہ پہاڑ پر چلے گئے تو حضرت ہارون کا اتنا خوف ان کو نہ تھا ان کے منع کرنے سے انہوں نے نہ مانا۔ مصر میں ایک دیوتا تھا جس کا نام ''نیوس'' تھا اور اس کی صورت بچھڑے جیسی تھی اسی صورت کا انہوں نے بچھڑا بنایا اور بنانے والے نے اس میں ایسی ترکیب رکھی۔ کہ اس ترکیب سے بچھڑے میں آواز نکلتی تھی اور لوگوں کو دھوکا و فریب دینے کے لیے حضرت موسیٰ کے پاؤں تلے کی مٹی حقیقتہ یا صرف دھوکا دینے کو اس مٹی کو حضرت موسیٰ کے پاؤں تلے مٹی کی بیان کر کے بچھڑے میں ڈال دی۔ خود قرآن مجید میں سامری کا قول منقول ہے کہ۔

کذلک سولت لی نفسی.

یعنی اس طرح اس کے نفس نے دھوکا دیا۔

اس مقام پر قابل غور یہ بحث ہے کہ بچھڑا بنانے والا کون تھا توریت میں لکھا ہے کہ خود حضرت ہارون بچھڑا بنانے والے تھے اور خود انہوں نے ہی بچھڑے کی پرستش کروائی۔ مگر جب ہم خود توریت کے مضامین پر خیال کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہارون کو بھی برکت دی تھی اور تمام احکام جو خدا نے موسیٰ کو دئے تھے ان کی حضرت ہاروں ہی تعمیل کرتے تھے بلکہ حضرت موسیٰ تو صرف نام ہی کے تھے خدا کے تمام احکام بذریعہ

حضرت ہارون پورے ہوتے تھے تو ہم اس بات کو کہ حضرت ہارون اس بچھڑے کے بنانے والے اور بت پرستی کی اجازت دینے والے تھے جیسا کہ توریت میں لکھا ہے صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہ بات ممکن ہے کہ یہ بچھڑا اس زمانہ میں بنایا گیا جبکہ حضرت موسیٰ پہاڑ پر تھے اور حضرت ہارون کو تمام بنی اسرائیل پر سردار کر گئے تھے اور ان کے عہد سرداری میں یہ بچھڑا بنا اس لیے حضرت ہارون اسکے بنانے والے تھے یہ بات کسی طرح صحیح متصور نہیں ہوسکت۔

قرآن مجید نے صاف صاف بتا دیا کہ حضرت ہارون نہیں بلکہ سامری اس کا بنانے والا تھا۔ ہمارے مفسرین کی جیسی عادت ہے کہ تفسیروں میں رطب و یابس صحیح و غلط روایتیں بھر دیتے ہیں اسی طرح سامری کی نسبت بھی روایتیں بھر دی ہیں جن میں سے بعض کی کچھ اصلیت بھی ہے مگر ٹھیک طور پر بیان نہیں کیں اور بعضوں نے نہایت غلطی سے سامری خاص نام بنانے والے کا سمجھا ہے جو صریح غلط ہے۔

عیسائی علماء نے یہ بات چاہی ہے کہ قرآن مجید کی غلطی ثابت کریں مسٹر سلیڈن نے کہا کہ دراصل ہارون اور سامری ایک ہی شخص ہے نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ نے غلطی سے ان کو دو سمجھا ہے۔ سمر یا شامر عبری لفظ ہے اور اس کے معنی محافظ کے ہیں اور جب کہ موسیٰ پہاڑ پر گئے تھے تو ہارون بنی اسرائیل کے محافظ ہوئے تھے اور اس لیے وہی شامر تھے۔

مگر مسٹر سلیڈن کا یہ قیاس محض غلط ہے اس لیے کہ اگر یہ لفظ قرآن مجید میں اخذ کیا جاتا تو اس کے ساتھ یائے نسبت کسی طرح نہیں آسکتی تھی اور اگر وہ علم یعنی خاص شخص کا نام متصور ہوتا تو اس پر الف لام لازم دونوں موجود ہیں یعنی ''السامری'' آیا ہے پس یہ دونوں خیال محض غلط ہیں۔

صحیح امر جس کو ہمارے مفسرین نے بھی بیان کیا ہے یہ ہے کہ بچھڑے کا بنانے والا سمارتن والوں کا ایک شخص تھا جس کا نام بیان نہیں ہوا پس ''السامری'' کے معنی یہ ہیں کہ

''رجل الذین هم السامرة''

مسٹر سیل نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس زمانہ میں سمارتن قوم موجود نہ تھی بلکہ اس کے بہت زمانہ بعد وہ قوم بنی تھی۔

مگر اس اعتراض میں غلطی ہے قرآن مجید کے الفاظ سے اس وقت یہی نام ہونا لازم نہیں آتا۔ بنی اسرائیل کے بارہ سبط تھے اور سب ایک سلطنت کے ماتحت تھے۔ مگر جب ''رجعام'' حضرت سلیمان کا بادشاہ ہوا تو بنی اسرائیل کے دس سبط نے اس سے بغاوت کی۔ ''یاربعام'' پسر نباط کو اپنا بادشاہ بنایا اس نے اپنے ملک میں بمقام بیت ایل اور دان کے سونے کے بچھڑے بنائے (دیکھو اول سلاطین باب ۱۲ ورس ۲۸ و ۲۹) اور ان کی پرستش شروع کیا۔ جب کہ ''عمری'' ان لوگوں پر بادشاہ ہوا تو اس نے کوہ شومون کو اس کے مالک سے جس کا نام ''شمر'' تھا خرید لیا اور وہاں شہر بنایا جو دارالخلافت ہو گیا (دیکھو اول سلاطین باب ۱۶ ورس ۲۳ لغایت ۲۵) اور اسی سبب سے وہ لوگ سمارتن یا شامری یا سامری مشہور ہوئے۔ اور وہ قوم جس میں کے شخص نے بنی اسرائیل کے لیے بچھڑا بنایا تھا قرآن مجید کے بہت پہلے سے سامری کے نام سے کہلاتی تھی۔ قرآن مجید میں السامری کہنے سے صرف یہ اشارہ ہے کہ اس کا بنانے والا اس قوم میں سے تھا جنہوں نے آخر کار یاربعام کی اطاعت کر کے سونے کے بچھڑوں کی پرستش کی تھی اور جو لوگ سامری یعنی سمارتن کے لقب سے مشہور ہیں۔

جو لوگ کہ توریت کے ان مقامات کو جو قرآن مجید کے بیان کے مخالف ہیں قرآن مجید کی غلطی ثابت کرنے کو پیش کرتے ہیں ان کو ایسی جرات کرنے سے پہلے توریت کے تمام مضامین مندرجہ کی صحت ثابت کرنی چاہیے اور ان کو اس بات کا بھولنا نہیں چاہیے کہ اب تک یہ بھی تحقیق نہیں ہوا ہے کہ موجودہ توریت کس نے لکھی اور کب لکھی گئی خود توریت سے

ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مضامین یاد سے اور کچھ تحریروں سے اخذ کیے گئے ہیں اور بہت سی باتیں جو اس زمانہ میں جب کہ ولکھی گئی یہودیوں میں مشہور یا مروج تھیں وہ بھی اس میں داخل کی گئی ہیں اور جو مضامین اس میں داخل ہیں وہ ایسے افسانہ آمیز ہیں کہ جب تک ان افسانوں کو علیحدہ نہ کیا جاوے اصل واقعہ پر کسی طرح یقین نہیں ہوسکتا۔ بشپ نیٹال نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے اس کو بھی بھولنا نہیں چاہیے پس یہ امر کہ کوئی واقعہ جو توریت کے برخلاف ہو وہ صحیح نہیں ہے اس کو کوئی ذی عقل تسلیم نہیں کرسکتا۔ بلاشبہ توریت میں احکام الہی بھی مندرج ہیں اور وہ

"فیھا ھدی و نور"

کہنے کے مستحق ہیں اور تاریخی واقعات بھی ہیں جو غلطی سے پاک نہیں۔

پانزدھم۔ ستر آدمیوں کا منتخب کرنا

و از قلتم یا موسیٰ لن نومن لک حتیی نری الله جهرة فاخذتکم الصاعة وانتم تنظرون (سورة بقر آیت ۵۲)

واختار موسیٰ قومه سبعین رجلا لمیقاتنا (سورة اعراف آیت ۱۵۴)

قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ موسیٰ کی قوم نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے جب تک کہ ہم کھلم کھلا خدا کو نہ دیکھ لیں اور سورۃ اعراف میں فرمایا ہے کہ موسیٰ نے ستر آدمیوں کو خدا کے وعدہ کی جگہ لیجانے کے لیے منتخب کیا۔

حضرت موسیٰ نے بھی بحالت ذھول خدا سے کہا تھا کہ

"رب ارنی انظر الیک"

خدا نے جواب دیا

"لن ترانی ولکن انظر الی الجبل"

بنی اسرائیل نے بھی حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہمیں خدا دکھلا دو حضرت موسیٰ پر یہ واقعہ خود گذر چکا تھا اور وہ جان چکے تھے کہ خدا کا دیکھنا محال ہے بلکہ صرف خدا کے وجود پر ایقان ہی خدا کا دیدار ہے اور خدا کے وجود پر ایقان اسکی عجائب مخلوقات پر غور و فکر کرنے اس کے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ خدا نے حضرت موسیٰ کو بھی اس عجیب ہیبت ناک آتشین پہاڑ کی طرف خدا پر ایقان لانے کے لیے متوجہ کیا تھا اس طرح حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل

میں سے ستر آدمیوں کو خدا کی اس قدرت کاملہ اور تجلی شان دکھانے کو منتخب کیا تا کہ ان کو بھی ایقان وجود باری عزاسمہ پر حاصل ہو۔

خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہوسکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے وہ بیچون وبیچگون ہے کسی چیز وصورت میں آنے کے قابل ہی نہیں ہے پھر وہ کیوں کر دنیا میں یا عقبیٰ میں دکھائی دے سکتا ہے۔ بہت سے عابد وزاہد دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں سے دنیا ہی میں خدا کو دیکھا ہے۔ بہت سے کہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ انہوں نے دیکھا دکھایا کچھ نہیں بلکہ خود انہی کا خیال یا ایقان ہے جو انہوں نے دیکھا ہوگا عقبیٰ میں اگر خدا کا دیکھنا تسلیم کیا جاوے تو وہ بھی خدا کا دیکھنا نہ ہوگا بلکہ خود انہی کا ایقان انکو دکھائی دے گا نہ خدائے بیچون وبیچگون وبے مثل وبے نمون۔

علمائے ظاہر جو اس مسئلہ کی حقیقت نہیں سمجھتے صرف لفظوں پر بحث کیا کرتے ہیں وہ اس مسئلہ کی حقیقت کے سمجھنے کے لائق ہی نہیں ہیں۔ ہاں علمائے ربانی جنہوں نے اپنے نفس پر اور انسان کے نیچر پر غور کی ہے ان کی سمجھ اس مسئلہ کی نسبت علمائے ظاہری کی سمجھ سے زیادہ اعتبار کے قابل ہے اور ان میں سے بھی بالتخصیص ان کے جو باوجود علم باطنی کے علم ظاہری میں بھی بہت بڑا درجہ کمال کا رکھتے تھے۔ اس مسئلہ کی تحقیق میں مرشدنا ومولانا عالم ربانی حضرت شیخ احمد سرہندی نقش بندی مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا ہے بجنسہ اس مقام پر لکھا جاتا ہے۔

حضرت ممدوح قدس سرہ نے جلد سوم مکتوب نوزدھم جو بنام فقرے ہاشم کشمی لکھا ہے اور جس میں درباب کیفیت مشاہدہ قلب عرفہ حق جل وعلا کو سوال کیا گیا تھا اس طرح ارقام فرمایا ہے۔

”پر سیدہ بودن کہ بعضے ازمحققان صوفیہ اثبات رویۃ و مشاہدہ او تعالیٰ بدیدہ دل دردنیا مے فرمایند کما قال الشیخ العارف فی کتابہ العوارف. موضع المشاھد بصر القلب الخ و شیخ ابو اسحاق کلا بادی قدس سرہ کہ از قدمائے ایں طائفہ علیہ است و از رو سائے ایشاں درکتاب تعرف آرومے اجمعوا علی انہ تعالیٰ لا یری فی الدنیا بالا بصار ولا بالقلوب الا من جھۃ الایقان توفیق میان ایں دو تحقیق چیست ورائے تو برکدام وما جماع باوجود اختلاف بچہ معنی است. بداں ارشدک اللہ تعالیٰ کہ مختار ایں فقیر دریں مسئلہ قول صاحب تعرف است قدس سرہ و میداند کہ قلوب را دریں نشا ازاں حضرت جل سلطانہ غیر از ایقان نصیبے راچہ بود کہ او دریں نشا درایں معاملہ بیکار و معطل است غایۃ ما فی الباب معنی ایقان کہ قلب را حاصل شدہ است در عالم مثال بصورت رویۃ ظاھر مے شود و موقن بہ صورت مرئی چہ در عالم مثال ھر معنی را صورتیست مناسب و چوں در عالم شھادت کمال یقین در رویۃ است آں ایقان نیز بصورت رویۃ در مثال ظاھر مے گر دد وچوں ایقان بصورت رویۃ ظاھر شود متعلق آنکہ موقن بہ است ناچار بسورت مرئی آنجا ظاھر گردد و چوں سالک آں را در مرات مثال مشاھدہ مے نما ید از توسط مرات ذاھل گشتہ و صورت راحقیقت دانستہ مے انگارد کہ حقیقت رویتے اور را حاصل گشتہ است و مرئی پیدا آمدہ نمے داند کہ آں رویت صورت ایقان اوست و آں مرئی صورت موقن بہ او. ایں از اغلاط صوفیہ است واز تلبسات صور بحقائق . وھمیں دید چوں غالب

مـی آیـد و از بـاطـن بظاهر مے تراود سالک را درهم مے اندازد که روية بـصـری نیز حاصل گشت و مطلوب از گوش به آغوش آمد نمید اند که حـصـول ایـں مـعـنـی چوں دراصل که بصیرت است نیز مبنی بر تو هم و تـلـبـس است به بصر که دریں نشا فرع او است چه رسد و روایت اورا از کـجـا حـاصل شود ر رویت قلبی جم غفیر از صوفیه در تو هم افتاد افتاده انـد و حـکم بو قوع آں کرده و در رویت بصری مگر نا قصے ازیں طائفه در تـو هـم وقوع آں افتاده باشد که مخالف اجماع اهل سنت و جماعت است شکر الله سعیهم.

سوال موقن یه را چوں درمثال پیدا شد لازم آمد که حق را سبحا نه آنجا صورت بود.

جـواب تـجویز نموده اند که حق را سبحانه هر چند مثل نیست اما مثال اسـت روا داشـتـه انـد کـه د مثـال بـصـورتـے ظهور فرماید چناں چه صـاحـب فـصـوص قدس سره رویت اخروی را نیز بصورت جامعه لطیفه مثـالیـه مقرر ساخته است و تحقیق ایں جواب آنست که آں صورت موقن یه صورت حق نیست سبحانه درمثال بلکه صورت مکشوف بعض وجود و اعتبـارات ذات هـق اسـت سبـحـانــه نـه ذات حق جل و علا لهذا چوں مـعامله عارف بذات میر سد جل سلطانه ایں قسم تخیلات پیدا نمے شود و هیـچ رویـت و مـرئی متخیل نمے گردد وچه ذآت اقد س سبحانه رادر مثـال صـورتـے کـائـن نیسـت تـا آنرا بصورت مرئی وانماید و ایقان آنرا بـصورت وانماید یا آنکه گوئیم در عالم مثال صورمعانی است نه صورت

ذات وچون عالم بتمامه مظاهر اسماء و صفات است و از ذآتیته بهره
ندارد و چنان چه تحقیق آں را در مواضع متعدد نموده ایم پس ناچار
بتمامه از قسم معانی باشد و درمثال آنرا صورتے کائن بود و در کمالات
و جوبی هر جا صفت و شان است که قیام بذات وارد از قبیل معانی است
که اگر آں‌را در مثالل صورتے بود و او بالنقص گنجائش دارد اما ذات او
را سبحانه حاشا که در مرتبه از مراتب صور ت بو د چه صورت مستلزم
تهدید و تقئید است در هر مرتبه که باشدمجوز نیست مراتب همه که
مخلوق اویند سبحانه کجا گنجائش دارند که خالق را محدود و مقید
سازند هر که تجویز مثال درآں حضرت جل شانه نموده است باعتبار
وجوه و اعتبارات است نه باعتبار عین ذات تعالیٰ وهر چند تجویز مثل در
وجوه و اعتبارات حضرت ذات تعالیٰ هم بریں فقیر گراں است مگر
آنکه در ظلے از اظلال بعیده آں تجویز نموده آید ازیں بیان واضح
گشت که در عالم مثال ارتسام صور معانی و صفات را کائن است نه
ذات تعالیٰ را پس آں چه صاحب فصوص تجویز رویت اخروی بصورت
مثالیه نموده است چنان چه گذشت آں‌رویت حق نیست تعالیٰ بلکه
رویت صورت حق هم نیست سبحانه چه اور را سبحانه صورتے نیست تا
رویت باں تعلق پیدا کند و اگر در مثال صورتے هست ظلے از اظلال
بعیده اور را کائن است پس رویت آں رویت حا چرا باشد سبحانه شیخ
قدس سره در نفی رویت حق جل و علا از متعزله و فلاسفه هیچ کم پائی
نمی کند بلکه اثبات ویت بر نهجے مے نماید که مستلزم نفی رویت

است و ان ابلغ در نفی است از صریح نفی لان الکنا یة ابلغ من التصریح
قضیه مقرره است این قدر فرق است که مقتدائے آں جماعت عقل شاں
است و مقتدائے شیخ کشف بعید از صحت مانا که اوله غیر تا مه
مخالفان که در متخیله شیخ نشسته بود کشف اور را نیز دریں مسئله از
صواب منحرف گردانید است و مائل بمذهب شاں ساخته چوں از اهل
سنت بود صورت اثبات نموده است و باں اکتفا کرده و آں را رویت
انکاشته ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا و تحقیق ایں مسئله دقیقه که
در حل بعض از مواضع کتاب عوارف نوشته است نیز تحریر یافته است
وآں چه از اجماع پرسیده بودند تواند بود که تاآں وقت خلافے که
شایان اعتداد باشد بظهور نیامده باشد یا اجماع مشائخ عصر خود
خواسته باشد والله سبحانه اعلم بحقیقه الحال . انتهیٰ.

شانزدھم ذکر استسقائے قوم موسیٰ۔ ھفدھم

سایہ کرنا ابر کا۔ ھیژدھم۔ من وسلویٰ کا اترنا نوزدھم۔

دخول باب

یہ چاروں موضوع سر سید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے ایک دوسرے مضمون میں جو اس کے بعد نقل کیا جا رہا ہے۔ درج کر دیے ہیں۔ لہذا یہ آخر کی چاروں بحثیں اگلے مضمون میں ملاحظہ فرمائیں۔ اختصار کے لحاظ سے یہ چاروں باتیں یہاں چھوڑ دی گئی ہیں۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

....

اختتام-------------------- The End

اردو کا کلاسیکی ادب

مقالات سرسید

قرآنی قصص

جلد چہاردھم حصہ دوئم

مرتبہ

مولانا محمد اسماعیل، پانی پتی

قصہ موسیٰ علیہ السلام کا

حضرت موسیٰ کے جو واقعات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ سورہ بقر، نسا، مائدہ، انعام، اعراف، یونس، ھود، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، مومنین، شعرا، نمل، قصص، صافات، مومن، زخرف، دخان، نازعات، بیس سورتوں میں آئے ہیں۔ ان میں مکرر بھی مضامین بیان ہوئے ہیں اور کسی میں کسی جگہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کسی میں کسی جگہ کا۔ ہم ان تمام آیات اور الفاظ کو منتخب کر کر بہ ترتیب موسیٰ کے قصہ کو مع ترجمہ حاشیہ ا میں لکھ دیتے ہیں تا کہ تمام قصہ جس قدر قرآن مجید میں ہے بلفظہ بہ ترتیب معلوم ہو جاوے اور پھر ایک آیت کے مطلب کو اس کے مناسب مقام پر بیان کریں گے۔

سورۃ بقر میں جو واقعات حضرت موسیٰ کے بیان ہوئے ہیں ان میں سے واقعہ عبور بحر اور غرق فرعون قابل غور کے ہے اول تو بہت لوگوں نے غلطی کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے دریائے نیل سے عبور کیا تھا یہ بالکل غلط ہے بلکہ انہوں نے بحر احمر کی ایک سے عبور کیا تھا۔ تمام مفسرین حضرت موسیٰ کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے کے قرار دیتے جو خلاف قدرت واقع ہوا ہو جس کو انگریزی میں سپر نیچرل کہتے ہیں کہہ اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری وہ پھٹ گئی اور پانی مثل دیوار کے یا پہاڑ کے ادھر ادھر کھڑا ہو گیا اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا اور حضرت موسیٰ اور تمام بنی اسرائیل اس رستہ سے پار اتر گئے۔ فرعون بھی اسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر مل گیا اور سب ڈوب گئے۔ اگر درحقیقت یہ واقعہ خلاف قانون قدرت واقع ہوا تھا تو

خدا تعالیٰ نے سمندر کے پانی ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ مثل زمین کے اس پر سے چلے جاتے۔ خشک رستہ نکالنے ہی سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ واقعہ یا معجزہ جو اس کو تعبیر کرو مطابق قانون قدرت کے واقع ہوا تھا جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے بھی نہیں نکلتا۔ سمندر میں راستہ ہو جانے کی نسبت قرآن مجید میں تین جگہ زکر آیا ہے اول سورۃ بقرۃ میں جہاں فرمایا ہے کہ

"اذ فرقنا بکم البحر"

دوم سورہ الشعر میں فرمایا کہ

" او حینا الیٰ موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم

تیسرے سورۃ طہٰ میں جہاں فرمایا ہے کہ

فاوحینا الی موسیٰ ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا الا تخاف ورکاء لاتخشی فاتبعھم فرعون بجنودہ نغشیم من الیم ماغشیھم"

پہلی آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے سمندر کے جدا ہو جانے یا پھٹ جانے کو خلاف قانون قدرت قرار دیا جا سکے۔ دوسری آیت میں جو الفاظ ہیں انہی پر تمام مفسرین کا دارو مدار ہے۔ وہ

ان اضرب بعصاک البحر

کے یہ معنی لیتے ہیں کہ خدا نے موسیٰ سے کہا ک سمندر کو اپنی لاٹھی سے مار سے مار چنانچہ حضرت موسیٰ نے لاٹھی ماری اور سمندر ہٹ گیا یا پھٹ گے یا سمندر کی تہ زمین کھل گئی وہ اس جملہ کو اس طرح پر بطور شرط و جزا کے قرار دیتے ہیں کہ شرط گویا علت ہے اور جزا اس کا

محلول یعنی لاٹھی مارنے کے سبب سے سمندر پھٹ گیا اور زمین نکل آئی مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے

"الفلق"

ماضی کا صیغہ ہے اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ماضی جزاء میں واقع ہوتی ہے تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہتی بلکہ شرط کی معلول ہوتی ہے تو اس وقت اس پر 'ف' نہیں لاتے اور جب کہ وہ اپنے معنوں پر باقی رہتی ہے اور جزا کی معلول نہیں تب اس پر 'ف' لاتے ہیں جیسے کہ اس مثال میں ہے۔

"ان اکرمتنی فاکرمتک امس"

اس مثال میں جزاء (یعنی کل میں تعظیم کرنا اور شرط کی مغلول نہیں ہے کیوں کہ داس سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس طرح اس آیت میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا حزب کا معلوم نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی اور لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ علمائے اسلام سے تفسیروں میں اور خصوصا بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی پیروی کرنے کے عادی تھے اور قرآن مجید کے مطالب خواہ مخواہ کھینچ تان کر یہودیوں کی روائتوں کے موافق کرتے تھے اس نے انہوں نے اس جگہ بھی اور وہاں بھی جہاں قرآن میں آیا ہے

فاضرب بعصاک الحجر فانفجرت منه اثنا عشرۃعینا ضرب کے منعی زدن کے لیے اور سیدھے سادے معجزہ کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا۔

اس مقام پر حزب کے معنی زدن کے نہیں ہیں بلکہ چلنے کے یا جلد چلنے کے ہیں جیسے

کہ عرب بولتے ہیں

''حزب فی الارض''

چلایا دوڑا زمین پر خود قرآن مجید میں آیا ہے۔

واذا آخر یتھم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصرو من الصلوۃ (نساء)

یعنی جب تم چلو زمین پر یعنی سفر کرو تو کچھ حرج نہیں ہے۔ کہ نماز میں کمی کرو۔ پس صاف معنی یہ ہیں کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو کہا کہ ''اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے۔

سورۃ طہ میں جو آیت ہے اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو رات کو سمندر میں سوکھے رستے سے لے کر نکل چل پس جو معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسے مشکل کے وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالیٰ نے موسیٰ کو اور تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا تھا وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا۔

اس مقام پر یہ بحث پیش آوے گی کہ جب ''حزب'' کے معنی چلنے کے آتے ہیں اس کے صلہ میں ''فی'' کا لفظ آتا ہے جیسے کہ

''از اضربتم فی الارض''

میں ہے حالانکہ

''فاضرب بعصاک البحر''

اور

''فاضرب بعصاک الحجر''

میں ''فی'' نہیں ہے مگر ''فی'' کے نہ ہونے سے کچھ حرج نہیں ہے اس لیے کہ جب ''ضرب'' کے معنی چلنے کے لیے جاتے ہیں تو بواسطہ حرف جر یعنی ''فی'' کے متعدی کیا جاتا ہے اور جو افعال کہ بواسطہ جر کے متعدی ہوتے ہیں ان میں حرف جر کو محذوف کرنا اور فعل کو بلا واسطہ مفعول کی طرف متعدی کرنا جائز ہے اور اس مفعول کو منصوب علی نزع الخافض کہتے ہیں۔

اس مقام پر ''اضرب'' کے ''عصا'' کے ساتھ ربط دینے کو ایک حرف جر یعنی ''ب'' 'عصا' پر آ چکی تھی پھر اس فعل کو مفعول کی جانب متعدی کرنے کے لیے دوسرے حرف جر یعنی ''فی'' کا لانا کسی قدر فصاحت کلام کے مناسب نہ تھا اور اس لیے اس کا حذف اولیٰ تھا۔ پس تقدیر کلام کی یہ ہے کہ

''فاضرب بعصاک البحر ''

اور قرینہ حذف ''فی'' کا خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیوں کہ یہی قصہ انہی الفاظ سے سورۃ طہ میں بھی آیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ

''فاضرب لهم طريقاً فى البحر''

پس ایک جگہ لفظ ''فی'' مذکور ہے تو یہی قرینہ باقی مقامات میں اس کے محذوف ہونے کا ہے۔اسی آیت میں فعل ''اضرب'' کے بلا واسطہ حرف جر متعدی الی الفعول ہونے کی مثال بھی موجود ہے۔شاہ ولی اللہ صاحب

---

(۱)نتلو ا علیک من نباء موسیٰ و فرعون بالحق لقوم یومنون ان فرعون علی فی الارض وجعل اهلهاشیعا یستضعف طافعة منهم یذبح ابناء هم ویستحیی نساء هم انه کان من المفسدین (قصص) یسومونکم (آل فرعون) سوء العداب (بقر) یقتلون (اعراف) یذ

بـحـون ابـنـاء كـم و يستـحـيـون نساء كم وفى ذالكم بلاء من ربكم
عظيم (بقر(نريدان تمن على الذين استضعفو ا فى الارض و نجعلهم
ائـمة و نـجـعـلهـم الـوارئيـن ونمكن لهم فى الارض ونرى فرعون و
هامان و جنودها منهم ماكانو يحذرون (قصص).

واو حيـنـا الـى ام مـوسىٰ ان ارضعيه فاذا خفت عليه (قصص)
اقـذ فيـه فى التابوت (طه) فالقيه (قصص) فاقذفيه فى اليم فليلقه اليم
بـالسـاحـل يـا خـذه عدولى و عدوله (طه) ولا تخافى و لا تحزنى انا
رادوه اليک و جـاعـلـوه من المرسلين فالتقطه آل فرعون (قصص)
فبـصـرت (اى اخـت مـوسىٰ) يه عن جنب وهم لا يشعرون (قصص)
قالت امراة فرعون قرة عين لى ولک

لا تقتلوه عسىٰ ان ينفعنا او نتخذه ولدا (قصص) و حرمنا عليه
المراضع من قبل فقالت هل ادلكم على اهل بيت يكفلونه لكم و هم
له ناصحون فرددنه الى امه لى تقر علينها ولا تحزن .(قصص)

ولما بلغ اشده واستوى (قصص)دخل المدينة على حين غفلة
مـن اهـلهـا فـوجد فيها رجلين يقتتلان هذا من شيعته وهذا من عدوه
فـاستـغـاثه الذى من شيعته على الذى من عدوه فوكره موسىٰ فقضى
عليه (قصص) فاصبح فى المدينة خائفا يترقب فاذلذى استنصره بالا
مس يستصرخه قال له موسىٰ انک لغوى مبين فلما ان ارادان يبطش
بـالـذى هـوعـدولهـما قال يا موسىٰ اتريد ان تقتلنى كما قتلت نفسا
بالامس. (قصص)

وجا ء رجل من اقصیٰ المدینۃ یسعی قال یا موسیٰ ان الملاء یا
تـمرون بک لیقتلوک ماخرج انی لک من الناصحین فخرج ،منھا
خائفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین (قصص).

قـال مـوسـیٰ. لفتاہ لا ابرح حتیٰ ابلغ مجمع البحرین او امضی
حـقبـا فـلـمـا بـلغ مجمع بینھما نسیا حوتھما فاتخذ سبیلہ فی البحر
سـربـا فلما جاوزا قال لفتاہ اتیناہ غذائنا لقد لقینا من سفرنا ھذا نصبا
قـال ارایـت اذا وینا الی الصخرۃ فانی نسیت الحوت وما انسا نیہ الا
الشیـطـن ان اذکـرہ واتـخذ سبیلہ فی البحر عجبا قال ذالک ما کنا
نبـغ فـارتـد عـلیٰ آثآر ھما قصصا فوجدا عبدا من عبادنا اتیناہ رحمۃ
مـن عـنـدنـا وعلمناہ من لدنا علما قال لہ موسیٰ ھل اتبعک علیٰ ان
تـعـلـمـن مـما علمت رشدا قال انک لن تستطیع معی صبرا وکیف
تـصبـر عـلـی مالم تحط بہ خبرا قال ستجدنی ان شاء اللہ صابرا ولا
اعـصـی لک امـر قـال فـان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شی حتی احدث
لک مـنہ ذکرا فانطلقا حتی اذا رکبا فی السفینۃ خرقھا قال اخرقتھا
لتغـرق اھلھا لقد جئت شیئا امرا قال الم اقل انک لن تستطیع معی
صبرا قال لا تو اخذنی بما نسیت ولا ترھقنی من امری عمرا فانطلقا
حتیٰ اذ لـقیـا غـلاما فقتلہ قال اقلت نفسا زکیۃ بغیر نفس لقد جئت
شیـئـا نـکـرا قـال الـم اقـل لک انک لن تستطیع معی صبرا قال ان
سـالتک عـن شـئـی بـعدھا فلا تصاجننی قد بلغت من لدنی عذرا فا
نـطـلـقـا حتیٰ اذا اتیـا اھـل قـریۃ استطعما اھلھا فابو ان یضیفو لھما

فوجدا فيها جدار يريدان ينقض فاقامه قال لو شئت لتخذت عليه
اجرا قال هذا فراق بينى و بينک سانئبک بتاويل مالم تستطع
عليه صبرا اما السفينة فكانت لمساكين يعمون فى البحر فاردت ان
اعيبها و كان راء هم ملک ياخذ كل سفينة غصبا واما الغلام فكان
ابواه مومنين فخشينا ان يرهقهما طغيانا وكفرا فاردنا ان يبدلهما
ربهما خيرا منه ذكوة واقرب رحما واما الجداد فكان لغلامين يتمين
فى المدينة وكان تحته كنزلهما وكان ابوهما صالحا فاراد ربک ان
يبلغا اشد ها ويستخر جا كنزلهما رحمة من ربک وما فعلته عن
امرى ذالک تاويل مالم تستطع عليه صبرا (كهف).

ولما توجة تلقاء مدين قال عسى ربى ان يهدنى سواء السبيل
ولماورد ماء مدين وجد عليه آمة من الناس يسقون و وجد من
دونهم امراتين تذ ودان قال ما خطبكما قالتا لا نسقى حتى يصدر
الرعاء وابوان شيخ كبير فسقى لهما ثم تولىٰ الى الظل قال رب انى
لما انزلت الى من خير فقير فجاء تة احدا هما تمشى عى استخياء
قالت ان ابى يدعوک ليجزيک اجر ماسقيت لنا فلما جاء ہ وقص
عليه القصص قال لا تخف نجوت من القوم الظلمين قالت احدا هما
يابت استاجره ان خير من اسا جرت القوى الامين قال انى اريد ان
انكحک احدى ابنتى ها تين على ان تاجرنى ثمنى جحج فان
اتممت عشرا فمن عندک ما اريدان اشق عليک ستجدنى انشاء
الله من الصالحين قال ذالک بينى وبينک اى الاجلين قضيت فلا

عدوان علی والله علی مانقول وکیل (قصص)

فلبثت سنین فی اهل مدین ثم جئت علیٰ قدر یا موسیٰ . (طه)

فـلما قضیٰ موسیٰالا جل وسار باھله انس من جانب الطور نارا قـال لا ھلة امکثوا انی انست نار العلیٰ آیتکم منھا بخیر (قصص) او آتیـکـم بشاب قبس (نمل) جذوة من النار لعلکم تصطلون (قصص) اواجـد عـلـی الـنار ھدی (طه) فلما اتا ھانودی من شاطی الوادی الا یـمن (قصص) من جانب الطور الا یمن(مریم) فی البقعه المبارکة من الشـجـرـة (قصص) ان بورک من فی النار ومن حولھا و سبحان الله اب العالمین یاموسیٰ انه انا الله العزیز الحکیم (نمل) انی انا الله رب الـعـالـمیـن (قـصـص) انـی انـا ربـک فـاخلع نعلیک انـک بـالواد الـمـقدس طویٰ (طه) ماتلک بیمینک یا موسیٰ قال ھی عصای اتو کـاء عـلیھـا و اھـش بھـا علی غنمی ولی فیھا مارب اخری (طه) الق عـصـاک فـلـمـا راھا تھتنر کانھا جان ولی مدبر ولم یعقب یاموسیٰ اقبـل (قـصـص) خـذھـا ولا نـخف سـنـعید ھا سیرتھا الاولی. (طـه) اسـلک یـدک فـی جیبک (قـصص) واضعم یدک الیٰ جنا حک تـخرج بیضاء من غیر سوء آیة آخری (طه) واضعم الیک جناحک مـن الـذھـب فـذلک بـرھـانـن من ربک (قصص) فی تسع آیات (نـمـل) الـی فرعون و ملائه انھم کانو قوما فاسقین (قصص) و قربناء نجیا . (مریم)

ثـم ارسـلنا موسیٰ واخاه ھارون یاتنا وسلطان مبین الی فرعون

وملا ئه (هود) هامان و قارون (مومن) ان اخرج قومک من
الظلمات الی النور (هود) ان ایت القوم الظمین قوم فرعون (شعراء)
اذهب الی فرعون انه طغیٰ (نازعات) قال رب انی اخاف ان یکذبون
(شعرا) رب انی ققلت منهم نفسا (قصص) ولهم علی ذنب فاخاف
ان یقتلون (شعرا) ویضیق صدری ولا تنطلق لسانی (شعرا) رب
الشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدة من لسانی یفقهوا
قولی (طه) واخی هارون هوا فصح منی لسا نا (قصص) اجعل لی
وزیرا من اهلی هارون اخی (طه) فارسل الی هارون (شعرا)فارسله
معی رداء (قصص) قال متشد عضدک یا خیک ونجعل لکم
سلطانا (قصص) قال قد اوتیت سولک یاموسیٰ (طه) اذهب انت
واخوک بایاتی لا وتنیا فی ذکری اذهبا الی فرعون انه طغی (طه)
قال کلا فاذهبا یاتینا انا معکم مستمعون فائتیا فرعون فقولا انا
رسول رب العالمین ان ارسل معنا بنی اسرائیل (شعرا) فقولا له قولا
لینا لعله یتذکر او یخشی قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان
یطغی قال لا نخافا اننی معکما اسمع واری فاتیاه (طه) فقل هل لک
الی ان تزکی اوهدیک الی ربک فتخشی (نازعات)فقولا انا
رسول ربک فارسل معنا بنی اسرائیل ولا تعذبهم قد جئناک بایة
من ربک (طه) قال فمن ربکما یا موسیٰ قال ربنا یا موسیٰ قال ربنا
الذی اعطی کل شی خلقه ثم هدی قال فما بال القرون الاولیٰ قال
علمها عند ربی (طه) قال وما رب العالمین قال رب السموات

والارض وما بينهما ان كنتم موقنين قال لمن حوله الا تستمعون قال ربكم ورب ابائكم الاولين.

قال ان رسولكم الذی ارسل علیکم لمجنون قال رب المشرق والمغرب و ما بينهما ان كنتم تعقلون قال لئن اتخذت الها غیری لا جعلنک من المسجونين (شعرا) قال الم نربک فينا وليد او لبثت فينا من عمرک سنين وفعلت فعلتک التی فعلت و انت من الکافرين قا ل فعلتها اذا و انامن الضالين ففررت منكم لما خفتكم فوهب لی ربی حکما و جعلنی من المرسلين وتلک نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل (شعرا) فقال له فرعون انی لا ظنک یموسیٰ مسحورا (بنی اسرائیل) قال اولو جئتک بشئی مبین (شعرا) قال ان کنت جئت باية فات بها (اعراف) ان کنت من الصادقين فالقی عصاء فاذا هی ثعبان مبين ونزع يده فاذا هی بيضاء للناظرين (شعرا) قال موسیٰ یافرعون انی رسول من رب العا لمین حقیق علی ان لا اقول علی الله الا الحق قد جئتكم بينة من ربكم فارسل معی بنی اسرائیل (اعراف) واستکبر هو و جنودة فی الارض بغير الحق وظنو انهم اليه لا تر جعون (هو د) فاستكبرو و كانو قوما عالين (مومنون) مجرمين (یونس) قالو انو من لبشرين مثلنا وقو مهما لنا عابدون (مومن) فطلموا (اعراف) فکذبو اهما (مومن) فقالو ساحر كذاب (مومن) قال للملاء حوله ان هذا لساحر عليم بريدان يخرجكم من ارضكم بسحره فماذا تامرون قالوا ارجه و اخاه وبعث

(شعـرا) وارسـل فـی الـمـدائـن حـاشرین یا توک بکل ساحر علیم
(اعـراف) قـال اجـئتـنـا التـخرجنا من ارضنا بسحرک یاموسیٰ فلنا
نیتک بسـحـر مثلـه فـاجعل بیننا وبینک موعد الا نخلفه نحن ولا
انـت مـکـانـا سوی قال موعدکم یوم الزنیة وان بحشر الناس ضحی
فتولـیٰ فـرعـون فـجـمـع کیده ثم اتی (طه) قال فرعون انتونی بکل
سـاحر علیم (یونس) فجمع السحرة لمیقات یوم معلوم و قیل للناس
هـل انتـم مـجتمعون لعلنا تتبع السحرة ان کانو هم الغالبین (شعراء)
فـلما جاء السحرة فرعون قالو ائن لنا لاجرا ان کنا نحن الغالبین قال
نـعـم وانـکـم اذا لمن المقربین (شعرا) فتناعوا امر هم بینهم و اسرو
الـنـجـویٰ قـالـو ان یـخـرجـا کم من ارضکم بسحر هما و یذهبابطر
یـقتـکـم الـمثـلـی فاجمعوا کیدکم ثمرائتو ا صفا وقد افلح الیوم من
استـعـلـیٰ (طه) قالوا یا موسیٰ اما ان تلقی واما ان اکون اول من القیٰ
(طـه) واما ان لکون نحن الملقین فلما القوا سحروا عین الناس استر
هبـوهـم وجـاؤا بسـحـر عـظیـم (اعـراف) فـالقوا حبـالهم وعصیهم
وقـالـوابـعـزـة فرعون انا لنحن الغلبون (شعرا) فاذا حبالهم وعصیهم
یخبل الیه من سحرهم انها تسعی (طه) فلما القوا قال موسیٰ ما جئتم
به السحران الله سیبطله (یونس) فا وجس فی نفسه خیفة موسیٰ قلنا
لا تخف انک انت الاعلیٰ (طه) و اوحینا الی موسیٰ ان القا عصاک
فـاذا هـی تـلـقف مـا یا فکون(اعراف) فالقیٰ عصاه فاذا هی تلقف ما
یـافـکون (شعرا) ماصنعوا انما صنعوا کید لساحرو لا یفلح السا جر

حیث اتیٰ (طه) فوقع الحق وبطل ماکانو ا یعملون فغلبوا ھنالک
وانقلبوا ساغرین والقی السحرة ساجدین (اعراف) سجدا (طه) قالو
امنا برب العالمین رب موسیٰ و ھرون قال فرعون آمنتم به قبل ان
اذن لکم ھذا لمکر مکر تموہ فی المدینة لتخرجوا منھا اھلھا
فسوف تعلمون (اعراف) انه لکبیر کم الذی علمکم السحر فلا
قطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولا صلبنکم فی جذوع النخل
ولتعلمن اینا اشد وعذابا وابقی قالوا لن نوثرک علیٰ ما جائنا من
البینات والذی فطرنا فا قض ماانت قاض (طه) وما تنقم منا الا ان آمنا
بایات ربنا لما جاء تنا ربنا افرغ علینا صبرا وتوفنا مسلمین (اعراف)

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم
یذکرون فاذا جا ئتھم الحسنه قالوالنا ھذا وان تصبھم سیئه یطیروا
موسیٰ ومن معه الا انما طائرھم عندالله ولکن اکثرھم لایعلمون
وقالوا مھما تاتنا به من آیة تسحرنا بھا فما نحن لک بمومنین
فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم آیات
مفصلات فاستکبروا کانوا قوما مجرمین (اعراف) فلما جاء تھم
بایتنا مبصرة قالو ھذا سحر مبین وحجد وا بھا (نمل) ولقد اربناہ
آیاتنا کلھا فکذب وابیٰ (طه) فلما جائھم موسیٰ بایا تناقالوا ماھذا الا
سحر مفتری وما سمعنا بھذافی آبا ئنا الاولین قال موسیٰ ربی اعلم
بمن جاء بالھدی من عندہ ومن تکون له عاقبة الدار (قصص)
قالوا اجئتنا لتا فکنا عما وجدنا علیه آبا ئنا و تکون لکما الکبریا ء فی

الارض وما نحن لکما بمومنین (یونس) قال فرعون یا ایها لملاء
ماعلمت لکم من اله غیری فا وقدلی یا هامان علی الطین فاجعل لی
(قصص) ابن لی (مومن) صرحا لعلی الطلع الی اله موسیٰ
(قصص)لعلی ابلغ الاسباب باب السموات (مومن) وانی لاظنه
منالکذبین (قصص) وجاء هم (ای قوم فرعون) رسول کریم ان ادو
الیٰ عباد الله انی لکم رسول آمین وان لا تعلوا علی الله انی آتیکم
بسلطان مبین وانی عذت بربی وربکم ان ترجمون و ان لم تومنو ا
لی فاعتنز لون (دخان) فلما جاء هم الحق من عندنا قالوا اقتلوا بناء
الذین امنو معه واستحیوا نساء هم وما کید الکافرین الا فی ضلل
وقال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ ولیدع ربه انی اخاف ان یبدل
دینکم او ان یظهر فی الارض الفساد (مومن) وقال رجل مومن من
آل فرعون یکتم ایمانه اتقتلو ن رجل ان یقول ربی الله وقد جاء کم
بالبینات من ربکم وان یک کاذبا فعلیه کذبه و ان یک صادقا
یصبکم بعض الذی یعدکم ان الله لا یهدی هو مسرف کذاب یقوم
لکم الملک الیوم ظاهرین فی الارض فمن ینصرنا من باس الله ان
جائنا قال فرعون ماار یکم الا ماری وما اهدیکم الا سبیل الرشاد
(مومن) وقال الذی امن یاقوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب
مثل داب قوم نوح و عاد وثمود الین من بعدهم وما الله یرید ظلما
للعباد یا قوم انی اخاف علیکم یوم التناد یوم تولون مدبرین مالکم من
الله من عاصم ومن یضلل الله فماله من هاد (مومن) ولقد جاء کم

یوسف من قبل بالبینات فما زلتم ی ک مما جاء کم به حتی اذا
اهلک قلتم من یبعث الله من بعده رسولا . (مومن)

وقال فرعون یا هامان ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب اسباب
السموات فاطلع الی اله موسیٰ وانی لاظنه کاذبا وکذالک زین
لفرعو ن سوء عمله وصد عن السبیل وما کید فرعون الا فی تباب .
(مومن)

ان قارون وکان من قوم موسیٰ فبغی علیهم و آیتناه من الکنوز
ما ان مفا تحه لتنئو بالعصبة اولی القوة از قال له قوملا تفرح ان الله
لا یحب الغرحین واتبع فیما اتا ک الله الدار الاخره ولا تنس
نصیبک من الدنیا واحسن کم احسن الله الیک ولا تبیغ الفساد
فی الارض ان الله کا یحب المفسدین قال انما اوتینه علی علم
عندی اولم یعلم ان الله قد اهلک من قبله من القرون من هو اشدمنه
قوة واکثر جمعا ولا یسل عن ذنوبهم المجرمون فخرج علی قومه
فی زینة قال الذین یریدون الحیوة الدنیا یا لیت لنا مثل ما اوتی
قارون انه. لذواحظ عظیم وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب الله
خیر لمن آمن وعمل صالحا ولا بلقاها الا الصابرون فخسفنا به
وبداره الارض فما کان له فمن فئة ینصرونه من دون الله وما کان
من المنتصرین واصبح الذین تمنوا بامکانه باالامس یقولون ویکان
الله یبیسط الرزق لمن یشاء من عباده ویقدر له لولا ان من الله علینا
لخشف بنا ویکانه لا یلفح الکافرون (قصص)

ونـادیٰ فـرعـون فی قومه قال یقوم الیس لی ملک مصر وهذا الانهـار وتـجـری من تـحتی افلا تبصرون ام ان خیر من هذا الذی هو مهـمیـن ولا یـکـاد یبیـن فلولا القی علیه اسورة من ذهب اوجا ء معه الـمـلائـکة مفترلین (زحرف) ولما وقع علیهم الرجز قا لوا یا موسیٰ ادع لـنـا ربک بـمـا عهـد عـندک لئن کشفت عنا الرجز المومنین ولـنـرسـلن معک بنی اسرائیل فلما کشفنا عنهم الرجز الی اجل هم بـالـغـوه اداهـم یـنـکثـون (اعرا) واخذنا هم بالعذاب لعلهم یرجعون وقـالـو یـا یها الساحر ادع لنا ربک بما عهد عندک اننا لمهتدون. (زحرف)

قـال مـوسـیٰ ربـنـا انک آتیت فرعون وملائه زینة واموالا فی لـحیـوـة الـدنیـا ربـنـا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علی اموالهم واشـدوا عـلـی قـلـوبهـم فـلا یـومنوا حتی یرو العذاب الالیم قال قد اجبت دعو تکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون (یونس) قـال مـوسـیٰ لقومه استعبنوا باللله واصبرو ان الارض الله یورثها من یشاء من عباده والعا قبة المتقین قالوا و ذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد نـمـاجـئـنـا قـال عیسیٰ ربـکـم ان یهلک عدوکم و یستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعلمون (اعراف)

ولـقد اوحینا الیٰ موسیٰ ان اسر بعبادی فاضرب لهم طریقا فی البحر یبسا لا نخاف درکا ولا تخشیٰ (طه(

فـاسـربـعـبـادی لیلا انکم متبعون واترک البحر وهوانهم جند

مغرقون (دخان(ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم (شعرا) واذ فرقنا بکم البحر فانجینکم واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون (بقر) فاتبعو هم مشرقین فلما تراء الجمعان قال اصحاب موسیٰ ان امدرکون قال کلا ان معی ربی سیبدین (شعرا) فاتبعهم من الیم ماغشیهم واضل فرعون قومه وما هدی (طه) واز لفنا ثم الاخرین وانجینا موسیٰ ومن معه اجمعین ثم اغرقنا الاخرین (شعرا) فانتقمنا منهم فاغرقنا هم فی الیم نانهم کذبوا یا یاتنا وکانوا عنها غافلین فاخذناه وجنوده فنبذناهم فی الیم (قصص) فاراداں یستفرهم من الارض فاغرقنا ہ ومن معبه جمیعا وقلنا من بعده لبنی اسرائیل اسکنو الارض فاذاجاء وعد الاخرة جئنا بکم لفینا. (بنی اسرائیل)

وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلوی کلو من طیبات ما رزقنا کم وما ظلمونا ولکن کانو انفسهم یظلمون (بقر) ونزلنا علیکم المن والسلوی کلوا من طیبات ما رزقنکم ولا تطغو فیه فیحل علیکم غضبی ومن یحلل علیه غضبی فقد هویٰ (طه) قطعنا هم اثنتی عشرة اسباط امما و اوحینا الی موسیٰ اذا استسقاء قومه ان اضرب بعصاک الحجر فانجست (اعراف) فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا قد علم کل اناس مشربهم کلوا واشربو ا من رزق الله ولا تعصوا فی الارض مفسدین (بقر) واذ قتلتم یاموسیٰ لن نصبیرعلی طعام واحد فادع لنا ربک یخرج لنا مماتنبت الارض من

بـقـلـهـا وقثـاء هـا وفومها و عدسها وبصلها قال اتستبدلون الذى هو
ادنى بالذى هو خيرا هبطوا مصر افان لكم ما سالتم.

وجـا وزنـا يبـنـى اسـرائيـل البحر فاتو على قوم يعكفون على
اصـنـام لهـم قـالو ا ياموسىٰ اجعل لنا الها كما لهم الهة قال انكم قوم
تجهلون ان هولاء متبر ماهم فيه و باطل ماكانوا يعملون (اعراف) او
اذ قـلنا ادخلو هذهالقريه فكلو منها هيث ششتم رغدا وادخلو الباب
سـجـدو قـولـو حـطة نـغـفرلكم خطابا كم وسنزيد المحسنين فبدل
الذين ظلموا قولا غير الذى قبل لهم فارسلنا عليهم رجزا من السماء
بما كانوا يفسقون (بقر) يظلمون (اعراف) ولما جاء موسىٰ لميقا تنا
وكـلـمـه ربه قال رب ارنى انظر اليک قال لن ترانى ولكن انظر الى
الـجبـل فـان استقر مكا نه فسوف ترانى فلما تجلى ربه اللجبل جعله
دكا وخر موسىٰ صعقا فلما افاق قال سبحانک تبت اليک وانا اول
الـمـومنين قال يموسىٰ انى اصطفيتک على الناس برسا لاتى وبكلا
مـى فـخذ ما اتيتک وكن من الشاكرين (اعراف) واز قلتم يا موسىٰ
لـن نـو من لک حتىٰ نرى الله جرة(بقر) واختا ر موسى قومه سبعين
رجـلا لـميـقاتنا (اعراف) فاخذتكم الصعقة وانتم تنظرون ثم بعثنكم
مـن بـعـد موتكم لعللم تشكرون (بقر) فلما اخذتهم الرجفه قال رب
لو شئت اهلكتهم من قبل واياى (اعراف) وان اخذنا ميثاقكم ورفعنا
فوقكم الطور خذ واما اتينكم بقوه واذكروا مافيه لعلكم تتقون (بقر)
وازنتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة وظنوا انه واقع بهم خذوا وما اتينا كم

بقوة (اعراف) وما اعجلک عن قومک یاموسیٰ قال هم اولاء علی
اثری و عجلت الیک رب لترضی (طه) و واعدنا موسیٰ ثلثین لیله
واتممنها بعشرفتم میقات ربه اربعین لیلة وقال موسیٰ لاخیه هارون
اخلفنیفی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین (اعراف) واتخذ
قوم موسیٰ من بعده من حلبهم عجلا جسد اله خوار (اعراف) قال
فانا قد فتنا قومک من بعدک واضلهم السامری (طه)فاخرج لهم
عجلا جسداله خوار فقالو هذا الهکم واله موسیٰ فنسی افلا یرون ان
لا یرجع الیهم قولاولا یملک لهم ضروا ولا نفعا ولقد قا لهم هارون
من قبل یاقوم انما فتنتم به وان ربکم الرحمان فاتبونی واطیعو امری
قالو الن نبرح علیة عاکفین حتیٰ یرجع الینا موسیٰ(طه) فرجع موسیٰ
الی قومه غضبان اسقا (طه) قال موسیٰ لقومه یا قوم انکم ظلمتم
انفسکم باتخاذکم العجل فتو بوا الیٰ با رئکم فاقتلوا انفسکم ذالکم
خیر لکم عند با ربکم (بقر) ان الذین اتخذو العجل سینالهم غضب
من ربهم وذلة فی الحیوة الدنیا (اعراف)

قال یاقوم الم بعد کم ربکم وعد احسنا افطال علیکم العهد ام
اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی (طه) قال
بئسما خلفتمو نی من بعدی اعجلتم امر ربکم ، والفی الا الواح
واخذ براس اخیه بحره الیه قال ابن ام القوم استضعفونی وکادوا
یقتلوننی فلا تشمت بی الاعداء ولا تجعلنی مع القوم الظالمین
(اعراف) انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب

قولی (طه) قالو ما اخلفنا موعدک بملکنا ولکنا حملنا اوزار امن زینة القوم فقذ فناها فکذالک القی السامری (طه) قال فما خطبک یا سامری قال بصرت بمالم یبصروا به فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وکذالک سعلت فی نفسی قال فاذهب فان لک فی الحیواة ان تقول لا مساس. (طه)

فلما سکت عن موسیٰ الغضب اخذ الالواح وفی نسختها هدی ورحمة للذین هم یرهبون (اعراف) ثم آتینا موسی الکتاب تماما علی الذی احسن و تفصیلا لکل شئی وهدی ورحمة لعلهم بلقاء ربهم یومنون (انعام)

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منهم اثنا عشر نقیبا وقال الله انی معکم لان اقمتم الصلوة واتیتم الزکوة و آمنتم برسولی وعزرتموهم واقرضتمالله قرضا حسنا. (مائده)

اذ قال موسیٰ لقومه ان الله یامرکم ان تذ بحوا بقرة قالوا تتخذنا هزوا قال اعوذ بالله ان اکون من الجاهلین قالو ادع لنا ربک یبین لنا ماهی قال انه یقول انها بقرة لا فارض ولا بکر عوان بین ذالک فافعلو ما تو مرون قالوا ادع لنا ربک یبین لنا مالونها قال انه یقول انها بقره صفرا فا قع لونها تسر الناظرین قالوا ادع لنا ربک یبین لناماهی ان البقر تشابه علینا وانا ان شاء الله لمهتدون قال انه یقول انها بقرة لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی فیها قالوا الان جئت بالحق فذبحو ها وما کادوا یفعلون (بقر) یا قوم ادخلو الارض

المقدسة التی کتب الله لکم ولاترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا

خسرین قالوا یا موسیٰ ان فیها قوما جبارین وانا لن تدخلها حتی یخر

جوا منهافان یخرجوا منها فانا داخلون قال رجلان من الذین یخافون

انعم الله علیها ادخلو علیهم الباب فاذا دخلتموه فانکم غالبون

وعلی الله فتوکلوا ان کنتم مومنین قالوا یاموسیٰ انا لن ندخلها ابدا ما

داموا فیها فاذهب انت وربک فقاتلا ان ههناقاعدون قال رب انی لا

املک الا نفسی واخی فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین قال فانها

محرمة علیهم اربعین سنة یتیهون فی الارض فلا تاس علی القوم الفا

سقین(مائدہ)

ہم ٹھیک تجھ کو سنا دیں ایمان والوں کے لیے موسیٰ وفرعون کی کچھ خبریں فرعون

دنیا میں بہت بڑھ گیا تھا اور مصر کے رہنے والوں کو گروہ گروہ بتا دینا تھا اوران میں

سے ایک گروہ کو زبون حالت میں پہنچا دیا تھا۔ ذبح کرڈالتا تھاان کے بیٹوں کو اور جیتا

رہنے دیتا تھا انکی بیٹیوں کو اور وہ مفسدوں میں سے تھا۔ فرعون والے نبی اسرائیل کو

بری طرح کے عذاب پہنچاتے تھے۔ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو مارڈالتے تھے ذبح کر

ڈالتے تھے اوران کی بیٹیوں کو جیتا رہنے دیتے تھے اوراس میں بنی اسرائیل پران کے

پروردگار کی طرف سے بڑی بلا تھی۔ ہم نے ان پر جو دنیا میں کمزور ہو گئے تھے مہربانی

کرنی چاہی اور انکو سردار بنانا اوران کو وارث بنانا اور زمین پر قدرت والا ٹھہرانا اور

فرعون اور ہامان اوران کے لشکروں کو جس بات سے وہ ڈرتے تھے ان کے ہاتھ سے

دکھلانا چاہا۔

ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ کو دودھ پلا وے جب

اس کو موسیٰ کے مارے جانے کا خوف ہو تو اسکو ایک صندوق میں رکھ دے پھر اس کو ڈال دے پھینک دے دریا میں پھر دریا میں اس کو کنارہ پر ڈال دے گا۔ اس کو اٹھا لے گا میرا دشمن اور اس کا دشمن اور تو مت ڈر اور نہ غمگین ہو ہم اس کو پھر تیرے پا لوٹا دیں گے اور اس کو رسولوں میں سے کریں گے۔ (جب موسیٰ کی ماں نے ان کو دریا میں ڈال دیا اور وہ صندوق کنارہ پر آ لگا) تو فرعون کے لوگوں میں سے کسی نے اس کو اٹھالیا۔ موسیٰ کی بہن نے دور سے اس کو دیکھا اور فرعون والے نہیں جانتے تھے۔

فرعون کی عورت بولی کہ یہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس کو مت مارو شاید اس سے ہم کو نفع ہو اور ہم اسکو بیٹا بنالیں ہم نے پہلے ہی پلائیوں کا دودھ اس پر حرام کر دیا تھا۔ موسیٰ کی بہن بولی کہ کیا میں تم کو ایسی گھر والی بتادوں جو تمہارے لئے اس کو پالے اور اس کو اچھی طرح رکھیں (اس نے موسیٰ کی ماں ہی کو بتایا) پھر ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس ہی لوٹا دیا تا کہ اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک رہے اور غمگین نہ ہو۔ جب موسیٰ چاق و چوبند ہوا تو شہر والوں کی بے خبری میں شہر میں گیا وہاں اس نے دو آدمیوں کو ماتے مرتے پایا۔ ایک تو موسیٰ کی قوم کا تھا اور ایک اس کے دشمنوں میں سے تھا موسی کی قوم والے نے اس کے دشمنوں کی فریاد کی موسیٰ نے اس کو گھونسا مارا کہ وہ مر گیا۔ پھر شہر ہی میں ڈرتے ہوئے اور کسی خرابی کے آنے کی توقع میں صبح کی جس مدد موسیٰ نے کل کی تھی اور اس نے موسیٰ کو پکارا موسیٰ نے اسے کہا تو ہی علانیہ جھگڑالو ہے پھر موسیٰ نے اس کے جو اس کا اور موسیٰ کا بھی دشمن تھا پکڑنے کا ارادہ کیا (جو چلایا تھا وہ یہ سمجھا کہ موسیٰ مجھی کو پکڑے گا) کہا اے موسیٰ کیا تو میرے مار ڈالنے کا بھی ارادہ کرتا ہے جس طرح کہ کل تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ اتنے میں ایک آدمی شہر کے پرلے کنارے سے دوڑتا آیا کہا اے موسیٰ فرعون کے درباری تیری

نسبت مشورہ کرتے ہیں کہ تجھ کو مار ڈالیں پس یہاں سے نکل جا میں تیرا خیر خواہ ہوں۔ پھر موسیٰ ڈرتا ہوا اور کسی آفت کی توقع کرتا ہوا وہاں سے نکلا اور کہا اے پروردگار اس ظالم قوم سے مجھے بچا۔ موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے (غالباً اسی شخص سے جس نے آ کر قتل کے مشورہ کی خبر دی تھی) کہا کہ میں ٹھہرنے کا ہی نہیں جب تک دو دریاؤں کے ملنے کے مقام تک نہ پہنچ جاؤں یا چلا جاؤں گا بہت دنوں تک (یعنی اس سے بھی پرے) پھر وہ جب دونوں دریاؤں کے ملنے کے مقام تک پہنچے تو اپنی مچھلی وہاں رکھ کر بھول گئے پھر مچھلی نے خشک جگہ میں سے دریا کا رستہ لیا پھر جب وہ اس سے آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ ہمارا صبح کا کھانا لاؤ ہم نے تو اس سفر میں بڑی مصیبت اٹھائی اس جوان نے کہا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم اس پتھر سے تکیہ لگا کر بیٹھے تو میں اس مچھلی کو بھول گیا (یعنی اس کا خیال نہ رہا) اور اس قصہ کا ذکر کرنا (یعنی موسیٰ سے) بجز شیطان کے کسی نے مجھ کو نہیں بھلایا اور مچھلی نے عجب طرح سے دریا میں اپنا رستہ لیا موسیٰ نے کہا یہی ہے جو ہم چاہتے تھے (یعنی دونوں دریاؤں کے ملنے ہی تک ہم آنا چاہتے تھے اب آگے کیوں جاویں) پھر وہ دونوں بندوں کو میرے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس پر میں نے اپنی مہربانی کی تھی اور اس کو میں نے دانش مندی سکھا دی تھی موسیٰ نے اس سے کہا کہ کیا میں تمہارے ساتھ ہو لوں اگر مجھ کو بھی ان دانشمندیوں میں سے جو تم نے سیکھی ہیں سکھلا دو اس بندے نے کہا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور تم کس طرح پر اس بات پر صبر کرو گے جو تمہارے دانش کے احاطہ میں نہیں ہے۔ موسیٰ نے کہا انشاء اللہ تم مجھ کو صبر کرنے والا پاؤ گے اور میں تمہارے کسی کام میں برخلافی نہ کروں گا اس بندے نے کاہ کہ اگر تم میری تابعداری کرنا چاہتے ہو تو جب تک میں خود ہی نہ کہہ دوں مجھ

سے کسی بات کو مت پوچھنا پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک کشتی پر سوار ہوئے
تو اس بندے نے کشتی میں سوراخ کر دیا موسیٰ نے کہا کہ کیا تم نے کشتی کے لوگوں کے
ڈبونے کے لیے اس میں شگاف کیا ہے اس بندے نے کہا کہ دیکھو تم نے یہ بری بات
کی اس بندے نے کہا کہ میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے
موسیٰ نے کہا کہ جو بات میں نے بھول کر کہی اس پر مواخذہ مت کرو اور میرے ساتھ
کام میں سختی مت ڈالو پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک نوجوان سے ملے تو اس
بندے نے اس نوجوان کو مار ڈالا موسیٰ نے کہا کہ تم نے ایک شخص بے گناہ کو بغیر جان
کے بدلے مار ڈالا۔ دیکھو تم نے برا کام کیا اس بندے نے کہا میں نے تم سے نہ کہا تھا
کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا کہ اگر اس کے بعد میں تم سے کوئی بات
پوچھوں تو پھر مجھ کو اپنے ساتھ مت رکھنا میں اپنا عذر تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں پھر
وہ دونوں چلے یہاں تک کہ ایک گاؤں کے لوگوں کے پاس پونچے تو ان سے کھانا مانگا
انہوں نے ان کو کھانا کھلانے سے انکار کیا وہاں ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی کہ گر
پڑنا چاہتی ہے ان دونوں نے اس کو سیدھا بنا دیا حضرت موسیٰ کو بھوک لگی ہوئی تھی کسی
نے کھانے کو دیا نہ تھا ٹکا پیسہ پاس نہ تھا انہوں نے اس بندے سے کہا کہ اگر تم چاہتے
تو اس پر مزدوری لے لیتے اس بندے نے کہا کہ بس اب مجھ میں اور تجھ میں جدائی
ہے میں ان باتوں کی تاویل جن پر تم صبر نہ کر سکے بتا دیتا ہوں وہ کشتی تو غریب
آدمیوں کی تھی جو دریا میں کھیوا کھیا کرتے تھے۔ میں نے اس کو عیب دار کر دینا چاہا ان
کے پرے ایک بادشاہ ہے جو زبردستی سے ہر ایک کشتی کو پکڑ لیتا ہے اور وہ نوجوان اس
کے ماں باپ ایمان والے ہیں مجھ کو خوف ہوا کہ یہ ان کو سرکشی و کفر میں تنگ کرے گا
پس میں نے چاہا کہ جب وہ دونوں جوانی میں بھرپور ہوں وہ اپنا خزانہ نکال لیں تیر

ے پروردگار کی مہربانی سے اور میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیے یہ بیان ان باتوں کا ہے جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

اور جب موسیٰ شہر مدین کی طرف چلے تو کہا کہ امید ہے کہ میرا پروردگار مجھ کو سیدھا رستہ بتا دے اور جبکہ شہر مدین کے پانی کے پاس پہنچے تو وہاں لوگوں کے گروہ کو (مویشی کو) پانی پلاتے پایا اور اس کے پرے دو عورتوں کو پایا کہ اپنے مویشی روکے کھڑی ہیں موسیٰ نے کہا کہ تمہارا کیا حال ہے انہوں نے کہا کہ جب تک چرواہے پانی پلا کر نہ لے جاویں ہم نہیں پلا سکتیں اور ہمارا باپ بڈھا ہے پھر موسیٰ نے ان دونوں کے مویشی کو پانی پلا دیا پھ چھاؤں میں جا کھڑے ہوئے پھر کہا کہ اے میرے پروردگار تو نے میری ایسی حالت کر دی ہے کہ تھوڑی سی بھلائی کا بھی محتاج ہوں پھر ان دونوں میں سے ایک شرمیلی چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی کہا میرے باپ نے تجھ کو بلایا ہے تا کہ ہمارے (مویشی کو) جو پانی تو نے پلایا ہے اس کی اجرت دے پھر جب موسیٰ اس کے پاس (یعنی اس عورت کے باپ کے پاس) آئے اور اپنا قصہ اس سے کہا تو اس نے کہا کہ مت ڈرو تم نے ظالم قوم سے نجات پائی اس کی بیٹیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ اس کو مزدوری پر رکھ لے۔ اچھا مزدور جسں کو مزدوری پر لگا دے طاقت ور اور دیانت دار ہونا چاہیے اس شخص نے موسیٰ سے کہا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں اس بات پر کہ تو آٹھ برس تک میرے ہاں مزدوری کرے پھر اگر تو دس برس پورے کرے دے تو تیری طرف سے ہوگا میں تجھ پر مشقت ڈالنا نہیں چاہتا تو مجھ کو انشاء اللہ اقرار پورا کرنے والوں میں پاوے گا موسیٰ نے کہا کہ مجھ میں اور تجھ میں یہ اقرار ہو چکا ان دونوں میں سے جونسی میں پوری کر دوں تو پھر مجھ پر زیادتی نہ ہو اور جو میں

کہتا ہوں۔

خدا اس مددگار ہے۔ پھر موسیٰ اہل مدین میں چند سال رہا پھر تو اے موسیٰ وقت پر آ گیا۔

پھر جب موسیٰ نے میعاد مقررہ پوری کی اور اپنی بی بی کو لے کر چلا تو اس کو پہاڑ کی جانب سے آگ معلوم ہوئی موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا کہ ٹھہرو مجھے آگ معلوم ہوئی شاید میں وہاں سے کچھ خبر لے آؤں یا ایک بھڑکتی ہوئی لکڑی اٹھالاؤں یا آگ کا انگارہ لے آوں تا کہ تم تاپو یا آگ کے پاس کوئی راہ بتانے والا پاؤ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آیا تو جنگل کے دائیں کنارے سے پہاڑ کی دائیں طرف سے اس مبارک جگہ میں درخت میں سے کسی نے اس کو آواز دی کہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے گرد ہے اس کو برکت دی گئی ہے اور اللہ پاک ہے اور تمام عالموں کا پالنے والا ہے اے موسیٰ بے شک میں ہی خدا ہوں سب پر غالب اور بڑی حکمت والا بے شک میں ہی خدا ہوں تمام عالموں کا پالنے والا بیشک میں تیرا خدا ہوں پھر جوتیاں اتار ڈال بے شک تو پاک جنگل میں پھرتا ہے ۔ اے موسیٰ یہ کیا تیرے دائیں ہاتھ میں ہے موسیٰ نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے اس کو میں ٹیک لیتا ہوں اور اس سے اپنے ریوڑ پر پتے جھاڑ لیتا ہوں اور وہ میرے کام میں بھی آتی ہے خدا نے کہا کہ اپنی لاٹھی ڈال دے (جب ڈال دی) تو لاٹھی کو ہلتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ سانپ ہے تو موسیٰ پیٹھ پھیر کر پلٹا اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا خدا نے کہا اے موسیٰ آگے بڑھ اس کو پکڑ لے اور مت ڈر وہ جیسی پہلی تھی ویسے ہی ہو جاوے گی ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریباں میں اور اپنے ہاتھ کو اپنے بازو سے ملا دے تیرا ہاتھ بے عیب سفید نکلے گا بطور ایک دوسری نشانی کے جو ڈر تجھ کو ہوا ہے اس سے اپنے کو دونوں نشانیاں ہیں تیرے پروردگار کی نو

نشانیاں میں سے فرعون اوراس کے درباریوں کے لیے بیشک وہ بدکار قوم ہے اور ہم نے موسیٰ کو باتیں کرنے سے مقرب کیا۔

پھر ہم نے موسیٰ کو اوراس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور علانیہ غلبہ کے ساتھ فرعون اور اس کے دربایوں ہامان اور قارون کے پاس بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی میں نکال لاوے۔ جاؤ ظالم قوم کے پاس جو فرعون کی قوم ہے جا فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہے موسیٰ نے ک ہا کہ اے پروردگار میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دینگے اے پروردگار میں نے ان میں کا ایک آدمی مار ڈالا ہے۔ میں ان کا قصور کیا ہے پھر میں ڈرتا ہوں کہ وہ مار ڈالیں گے۔ میرے سینے میں دم گھٹ جاتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ اے پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور میرا کام مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھیں اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے میرے کنبہ میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر کر پھر ہارون کو میرے پاس بھیج پھر اس کو میرے ساتھ بطور مددگار کے بھیج خدا نے کہا میں تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط کر دوں گا اور تم دونوں کو وہ غلبہ دوں گا۔ خدا نے کہا اے موسیٰ جو تو نے مانگا تجھ کو دیا گیا جا تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں سمیت اور سستی نہ کرو میرے نصیحت میں تم دونوں فرعون پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہے خدا نے کہا کہ وہ ہرگز تم کو نہ مار سکیں گے پھر تم دونوں میری نشانیوں سمیت جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں تمہاری بات سنوں گا پھر فرعون کے پاس جاؤ اور پھر اس سے کہو کہ ہم دونوں تمام عالموں کے پروردگار کے رسول ہیں۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے اور اس سے نرم بات کہو شاید کہ نصیحت مانے اور خوف کرے انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار بے شک ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر زیادتی

کرے یا ہم سے سرکشی کرے خدا نے کہا کہ ہم تم مت ڈرو میں تمہاری ساتھ ہوں تمہاری بات سنوں گا اور تم کو دیکھتا رہوں گا پھر اس کے پاس جاؤ موسیٰ گئے اور کہا کہ تجھ کو پاک ہونے کی کچھ خواہش ہے اور میں تجھ کو تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں تا کہ تو خوف کرے خدا نے کہا کہ تم دونوں فرعون سے کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے رسول ہیں پھر ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو اور ان کو عذاب مت دے ہم تیرے پروردگار کی نشانی لائے ہیں فرعون بولا اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے تمام چیزوں کی خلقت ان کو عطا کی ہے پھر سیدھی راہ بتائی ہے فرعون نے کہا کہ پھر اگلے زمانے کے لوگوں کا کیا حال ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ اس کی خبر خدا کو ہے۔ فرعون نے کہا کہ تمام عالموں کا خدا کون ہے موسیٰ نے کہا جو آسمانو کا اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے اس سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین لاؤ۔ فرعون نے ان لوگوں سے جو اس کے اردگرد تھے کہا کہ کیا تم نہیں سنتے ہو موسیٰ نے کہا کہ تمہارا پروردگار اور ہم سب کے باپ دادا کا۔

فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا کہ تمہارے پاس جو رسول آیا ہے البتہ دیوانہ ہے موسیٰ نے کہا (کہ تمام عالموں کا خدا وہی ہے) جو مشرق و مغرب کا اور جو اس میں ہے اس سب کا پروردگار ہے اگر تم سمجھتے ہو فرعون نے کہا کہ اگر تو نے میرے سوا اور کسی کو خدا اٹھہرایا تو میں ضرور تجھ کو قید میں داخل کروں گا۔ فرعون نے کہا کہ کیا ہم نے تجھ کو نہیں پالا جب کہ تو ہم میں بچہ تھا اور کیا تو نے بسر نہیں کیے ہم میں اپنی عمر کے چند سال اور تو نے وہ کام کیا جو کیا اور تو ناشکروں میں ہے موسیٰ نے کہا کہ میں نے کیا تھا جب کہ وہ گمراہوں میں تھا۔ پھر میں تم سے ڈرا اور تم میں سے بھاگ گیا پھر خدا نے مجھ کو حکم دیا اور مجھ کو پیغمبروں میں سے کیا اور یہ بھلائی جس کا احسان تو مجھ پر رکھتا

ہے اس بناء پر ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ میں تجھ کو سحر زدہ سمجھتا ہوں ۔ موسیٰ نے کہا کہ جب بھی اگر میں کوئی بڑی نشانی لاؤں ۔ فرعون نے کہا کہ اگر تو کوئی نشانی لا سکتا ہے تو اس نشانی کو لا اگر تو سچا ہے ۔ پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی پھر یکا یک ہو بہو سانپ تھی اور اپنا ہاتھ نکالا پھر یکا یک دیکھنے والوں کو چمکتا معلوم ہوتا تھا ۔ موسیٰ نے کہا اے فرعون میں پروردگار عالموں کا رسول ہوں مجھ کو لائق ہے کہ میں خدا پر سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہوں میں لایا ہوں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی پھر میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے پھر فرعون اور اس کے لشکروں نے بغیر کسی حق کے دنیا میں تکبر کیا اور گمان کیا کہ وہ ہمارے پاس نہ پھریں گے پھر انہوں نے تکبر کیا اور وہ ایک قوم بڑھی ہوئی تھی ۔ گنہ گار تھی ۔ بولی کہ کیا ہم ایسے دو شخصوں پر ایمان لاویں جو ہمارے سے ہیں اور ان کی قوم ہماری غلام ہے پھر انہوں نے ظلم کیا ۔ اور ان دونوں کو جھٹلایا اور کہا کہ جھوٹے جادوگر ہیں ۔ فرعون نے اپنے اردگرد کے درباریوں سے کہا کہ یہ جادوگر بڑا جاننے والا ہے چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو سے نکال دے پھر تم کیا کہتے ہو ۔ وہ بولے کہ اس کو اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور شہروں میں (جادوگروں کے) اکٹھا لے آویں ہر ایک بڑے علم والے جادوگر کو ۔ فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ کیا تو ہمارے پاس ہم کو ہمارے ملک سے اپنے جادو سے نکالنے کو آیا ہے پھر بے شبہ ہم بھی تیرے پاس ویسا ہی جادو لاویں گے پس کسی چوپٹ میدان میں ہم میں اور اپنے میں (مقابلہ کے لیے) کوئی وقت مقرر کر ۔ نہ ہم اسکے برخلاف کریں اور نہ تو ۔ موسیٰ نے کہا کہ جشن کا دن تمہارے وعدے کا سہی اور تھوڑے دن چڑھے سب آدمی وہاں اکٹھے ہو جاویں پھر فرعون (اپنے محل میں) اور اپنے جادوگروں کو جمع کیا ۔ فرعون نے

کہا کہ ہر ایک بڑے جادوگر کو بلاؤ پھر تمام جادوگر وقت معین پر جمع ہو گئے اور لوگوں سے کہا کہ کیا تم بھی اکٹھے ہو گے تا کہ اگر جادوگر غالب آویں تو ہم ان کا ساتھ دیں جب فرعون کے جادوگر فرعون کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ اگر ہم غالب ہوں تو ہمارے لیے کچھ انعام ہے فرعون نے کہا کہ ہاں تب تو تم مقربوں میں سے ہو گے پھر ان کے باہم ان کے کام میں کچھ جھگڑا ہوا اور انہوں نے اپنے مشورہ کو چھپایا انہوں نے کہا کہ بے شبہ یہ دونوں جادوگر ہیں اور اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک نکالنا اور تمہارے عمدہ مذہب کو کھو دینا چاہتے ہیں پس اپنے جادوگروں کو جمع کر کے کہا کہ پھر اکٹھے ہو کر چلو اور آج کے دن جو غالب ہوگا وہی کامیاب ہوگا چنانچہ (یوم موعود کو سب جمع ہوئے) فرعون کے جادوگروں نے موسیٰ سے کہا کہ یا تو تو پہلے ڈال یا ہم پہلے ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو پھر جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر ڈھٹ بند کر دی اور ان کو ڈرایا دیا اور بہت بڑا جادوگر لائے۔ جب انہوں نے اپنی رسیاں ک اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا کہ فرعون کی عزت کی قسم ہم ہی غالب ہیں تب تو موسیٰ کے خیال میں انکی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو سے چلتی ہوئی لگنے لگیں موسیٰ نے کہا کہ یہ جو تم نے کیا یہ جادو ہے اس کو خدا باطل کر گیا مگر موسیٰ دل میں ڈر گیا خدا نے کہا مت ڈر تو ہی جیتے گا اور خدا نے موسیٰ کے دل میں ڈالا کہ اپنی لاٹھی ڈال کہ وہ اس سب بناوٹ کو نگل جاوے گی۔ پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی پھر س سب بناوٹ کو جو انہوں نے تو جادوگروں کا سامکر کیا تھا اور حق کے سامنے جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتا پس حق ثابت ہو گیا اور جو انہوں نے کیا تھا وہ باطل ہو گیا پھر وہاں ہار کر ذلت سے لوٹ گئے اور فرعون کے جادوگروں نے سجدہ کیا بولے ہم پروردگار عالموں پر ایمان لائے جو موسیٰ و ہارون کا پروردگار ہے۔ فرعون نے کہا کہ تم

میرے اجازت سے پہلے موسیٰ پر ایمان لے آئے بے شبہ یہ مکر ہے جو تم نے اس شہر میں شہر والوں کے نکالنے کو کیا پھر تم جلد اس کا انجام جانو گے۔ موسیٰ ہی تمہارا گرو ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے ضرور میں تمہارے ہاتھ ایک طرف کے اور تمہارے پاؤں دوسری طرف کے کاٹوں گا اور تم کو کھجوروں کے درختوں کے تنوں کی سولی پر چڑھادوں گا اور بلاشبہ تم جانو گے کہ کون سب سے زیادہ عذاب دینے میں سخت ہے اور کس کا عذاب زیادہ پائیدار ہے۔ وہ بولے کہ جو چیزیں علانیہ ہمارے سامنے ہوئی ہیں ان پر اور اس پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھ کو ہم پر بجز اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں پر ایمان لائے ہیں اور کوئی گناہ نہیں ٹھرانا۔ اے ہمارے پروردگار جب (یہ مصیبتیں) ہم پر آویں تو ہمارے (دل میں) صبر ڈال دے اور ہم کو مسلمان مار۔

اور بلاشبہ ہم نے فرعون والوں کو قحطوں میں اور پھلوں کی کم پیداوار میں گرفتار کیا شاید کہ وہ نصیحت پکڑیں اور پھر جب ان کو فراخی ہوتی تھی کو کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے لیے ہے۔ جب ان پر سختی پڑتی تھی تو موسیٰ کی اور اس کے ساتھ کے لوگوں کی نحوست بتلاتے تھے۔ سمجھو کہ اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ جو نحوست اس کے لیے تھی وہ خدا کے پاس سے تھی مگر ان میں بہت سے لوگ نہیں جانتے فرعون والوں نے موسیٰ سے کہا کہ جو نشانیاں تم لاؤ گے تا کہ ہم پر ان سے جادو کرو تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے پھر ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی دل اور جوئیں اور مینڈک اور خون کا (مینہہ) نازل کیا جدا جدا نشانیاں۔ پھر انھوں نے تکبر کیا اور وہ گنہگار قوم تھی۔ جب ان کے پاس دکھائی دیتی ہوئی ہماری نشانیاں آئیں تو بولے کہ یہ تو کھلا ہوا۔ جادو ہے اور ان نشانیوں کا انکار کیا اور البتہ ہم نے فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھلائیں پھر

اس نے جھٹلایا اور انکار کیا اور جب موسیٰ ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آیا تو بولے کہ یہ تو بجز بتنگڑ بنائے ہوئے جادو کے اور کچھ نہیں ہے اور ہم نے اپنے اگلے پر کھاؤں سے ایسی بات نہیں سنی، موسیٰ نے کہا کہ میرا پروردگار جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور کس کے لیے پیچھے کو اس گھر (یعنی عاقبت) کی بھلائی ہوگی۔ فرعون والے بولے کہ کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم کو اس بات سے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے ہٹا دے اور تم دونوں کو دنیا میں بڑائی ہو اور ہم تم دونوں کو نہیں مانتے ہیں۔ فرعون نے کہ کہ اے درباریو میں تمہارے لیے اپنے سوا کوئی خدا نہیں جانتا پھر اے ہاماں میرے لیے مٹی کی اینٹیں آگ میں پکا اور میرے لیے اونچا محل بنا تا کہ میں موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اس کو جھوٹوں میں سمجھتا ہوں اور آیا فرعون کی قوم کے پاس ایک بزرگ پیغمبر (یعنی موسیٰ) یہ کہتا ہوا کہ میرے حوالے کر دو خدا کے بندوں کو بے شک میں تمہارے لیے خدا کا بھیجا ہوا امانت دار پیغمبر ہوں اور تم خدا پر سرکشی مت کرو۔ میں ضرور تمہارے سامنے کھلی دلیلیں لاتا ہوں بے شبہ میں نے اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو پناہ مانگی ہے اور اگر تم مجھ کو نہیں مانتے تو مجھ سے جدا ہو جاؤ۔ پھر جب موسیٰ ان کے پاس ہمارے پاس سے حق بات لے کر آیا تو بولے کہ ان لوگوں کے بیٹوں کو مار ڈالو جو اس پر ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو حالانکہ کافروں کی مکاری بہ جز گمراہی کے اور کچھ نہیں اور فرعون نے کہا کہ مجھ کو چھوڑ دو (یعنی اجازت دو) کہ میں موسیٰ کو مار ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو پکارا ہی کرے بلا شبہ مجھے خوف ہے کہ تمہارا دین بدل دے اور ملک میں فساد برپا کرے اور فرعون والوں میں سے ایک مسلمان شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہا کہ کیا

تم ایسے شخص کو مار ڈالو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے پروردگار سے نشانیاں لایا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہو تو اسکا جھوٹ اس پر ہے اور اگر وہ سچا ہے تو تم کو بعضی وہ مصیبتیں پہونچیں گی جن کا وہ وعدہ کرتا ہے ہرگز خدا اس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنے والا دروغ گو ہو ہدایت نہیں کرتا۔ اے میری قوم آج کے دن تمہارے لیے بادشاہت ہے دنیا پر غالب ہو پھر وہ خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جاوے کون ہم کو مدد دے گا۔ فرعون نے کہا کہ میں تم کو بہ جز اس کے جو میں دیکھتا یا سمجھتا ہوں اور کچھ نہیں سمجھاتا اور میں تم کو بہ جز راہ راست کے اور کچھ نہیں بتاتا اس شخص نے جو ایمان لے آیا تھا کہا کہ اے میری قوم بے شک میں تم پر ایسے دن کا جو اگلے گروہوں پر گذرا ہے خوف کرتا ہوں جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کی جو اس کے بعد ہوئیں حالت ہوئی اور خدا بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا اے میری قوم بے شک میں تم پر چل چلاہٹ پڑنے کے دن کا خوف کرتا ہوں اس دن کہ تم اوندھے منہ پیٹھ پھیر کر پھرو گے کوئی تم کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا اور جس کو خدا گمراہ کرتا اس کو کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا۔ البتہ تمہارے پاس اس سے پہلے کھلی ہوئی نشانیاں لیکر یوسف آیا تھا پھر تم ہمیشہ اس بات میں جو وہ تمہارے پاس لایا تھا شبہ میں رہے یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم نے کہا کہ ہرگز نہیں بھیجنے کا اللہ اس کے بعد کسی پیغمبر کو۔

فرعون نے کہا کہ اے ہامان میرے لیے ایک محل بنا تاکہ میں رستوں تک آسمانوں کے رستوں تک پہنچ جاؤں پھر موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں اور اسی طرح فرعون کے لیے اس کے بدعمل بھڑک دار کیے گئے اور سیدھے راستے سے روک دیا گیا تھا اور فرعون کے مکر بجز تباہی کے اور کچھ نہ تھے۔

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پھر ان سے پھر گیا اور ہم نے اسکو اتنے خزانے دیے تھے کہ اس کی کنجیاں ایک قوی گروہ پر بھاری تھیں۔ جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ مت اترا کہ خدا اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو کچھ خدا نے تجھ کو دیا ہے اس میں آخرت کو ڈھونڈ اور اپنے حصہ کو دنیا میں سے مت بھول اور احسان کو جس طرح کہ خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے اور دنیا میں فساد مت مچا کہ اللہ تعالیٰ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اس نے کہا کہ مجھ کو یہ دولت صرف میری دانائی کے سبب دی گئی ہے۔ کیا وہ یہ نہ سمجھا کہ بے شبہ خدا نے کسی زمانہ میں اس سے پہلے ان کو ہلاک کر دیا جو اس سے بھی زیادہ قوی اور زیادہ دولت والے تھے اور کیا گنہگار اپنے گناہوں پر پوچھے نہ جاویں گے پھر قارون اپنی قوم کے سامنے تجمل سے نکلا جو لوگ دنیا ہی کی زندگی چاہتے تھے انہوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی وہ کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ بے شک وہی بڑا صاحب نصیب ہے اور جن لوگوں کو دانش دی گئی تھی انہوں نے کہا کہ افسوس تم پر، خدا کا ثواب ان کے لیے جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کیے ہیں بہت اچھا ہے اور وہ بجز صبر کرنے والوں کے اور کسی کو نہیں ملتا۔ پھر ہم نے قارون کو اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی گروہ خدا کے سوا نہ اس کے لیے تھے نہ جو اس کی مدد کرے اور نہ وہ اپنے آپ مدد کر سکتا تھا اور جن لوگوں نے کل اسکے مرتبہ کی تمنا کی تھی انہوں نے یہ کہتے ہوئے صبح کی اوھو، اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو فراخ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہم کو بھی دھنسا دیتا۔ اوہو وہ نہیں فلاح پہونچاتا کافروں کو۔

اور فرعون نے اپنے لوگوں میں پکار کر کہا کہ اے لوگو کیا میرے پاس مصر کا

ملک نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے ملک کے نیچے بہتی ہیں پھر کیا تم نہیں دیکھتے ہو آیا میں اچھا ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور نہیں بیان کر سکتا کہ کیوں نہ اس پر ڈالے گئے سونے کے کنگن اور کیوں نہ اس کے ساتھ فرشتے رہنے کو آئے اور جب فرعون والوں کو آفت پڑی تو بولے اے موسیٰ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے جس طرح اس نے تجھ کو بتایا ہے دعا مانگ اگر ہم پر سے آفت جاتی رہے تو تجھ پر ضرور ایمان لاویں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے پھر جب ہم نے ان پر سے ایک مدت تک آفت کو دور کر دیا جس آفت تک وہ پہنچنے کو تھے تو وہ پھر گئے اور ہم نے ان کو عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ (بدراہ سے) پھر جاویں۔ فرعون والوں نے کہا کہ اے جادوگر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے جس طرح کہ اس نے تجھ کو بتایا ہے دعا مانگ بے شک ہم ہدایت پا گئے ہیں۔

موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار تو نے فرعون کو اور اس کے درباریوں کو تجمل اور دولت دنیا کی زندگی میں دی ہے اور ہمارے پروردگار کیا اس نے کہ تیرے رستہ سے گمراہ کریں۔ اے پروردگار ہمارے ستیاناسی ڈال ان کے مالوں پر اور سختی ڈال ان کے دلوں پر بھر وہ نہیں ایمان لانے کے جب تک کہ دکھ دینے والا عذاب نہ دیکھیں گے خدا نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول کی گئی پھر مستقل رہو اور ان کی راہ مت چلو جو نہیں جانتے۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا خدا سے مدد مانگو اور صبر کرو بے شک یہ زمین خدا کی ہے اس کو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور آخر کو بھلائی پرہیزگاروں کے لیے ہے انہوں نے کہا کہ ہمیں تو تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد اذیت ہی دی گئی ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے تمہارے دشمن کو خدا ہلاک کرے گا اور عنقریب تم کو زمین پر خلیفہ کر دے گا پھر دیکھے گا کہ تم کسی طرح کرو

گے۔

ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ رات کو لے چل میرے بندوں کو ان کے لیے سمندر کے سوکھے رستہ میں مت خوف کر پکڑ لیے جانے سے اور نہ کسی طرح کا، ڈر کر لے چل میرے بندوں کو رات کو تم (دشمن) تعاقب کیے جاؤ گے اور چھوڑ چل سمندر کو ایسے حالت میں کہ اترا ا ہوا ہے بے شک فرعون کے لوگ ایک لشکر ہے کہ ڈبویا جاوے گا چل اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں کہ وہ پھٹا ہوا ہے پھر تھا ہر ایک ٹکڑا بڑے پہار کی مانند اور جب کہ ہم نے تمہارے سبب سے سمندر کو جدا کر دیا پھر ہم نے تم کو بچایا اور ہم نے فرعون والوں کو ڈبو دیا اور تم دیکھتے تھے۔ پھر سورج کے نکلتے ہی فرعون والوں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا پھر جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے لوگوں نے کہا کہ اب ہم پکڑے گئے موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں بے شک میرے ساتھ خدا ہے جو ٹھیک رستہ بتا دے گا پھر فرعون نے اپنے لشکر سمیت ان کا پیچھا کیا پھر ڈھانک دیا ان کو سمندر میں سے

۱۔ ''رھوا'' کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ''تھم '' کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے ''خشک'' کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ''ارمیدہ'' اور قاموس میں اس کے معنی لکھے ہیں ''المرتفع والمختفض ضد والسکون''۔

جس نے ان کو ڈھانک لیا اور غلط راہ پر لے گیا فرعون نے اپنی قوم کو اور ٹھیک رستہ نہ بتایا ار ہم نے پچھلوں کو قریب کر دیا اور ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو بچا دیا پھر ہم نے پچھلوں کو ڈبو دیا پھر ہم نے بدلا لیا ان سے اور ہم نے ان کو سمندر میں ڈبو دیا اس لیے کہ بے شبہ انہون نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا تھا اور اس سے غافل تھے پھر پکڑا ہم نے فرعون کو اور اس کے لشکر کو اور انکو ہم نے سمندر میں ڈال

دیا۔فرعون چاہتا تھا کہ ان کو زمین سے نکال دے پھر ہم نے اس کو ڈبو دیا اور سب کو جو اس کے ساتھ تھے اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہا کہ رہو اس زمین پھر جب آوے گا آخرت کا وعدہ تو ہم تم کو لائیں گے ملوان۔

ہم نے تم پر چھاؤں کی ابر کی ارتم پر من وسلویٰ اتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔مگر انہوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور ہم نے تم ہر من وسلوے اتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اس میں زیادتی مت کرو تا کہ میرا غصہ نازل ہوا وہ ہلاک ہوا اور جدا کر دیے ہم نے بنی اسرائیل کے اسباط کے بارہ گروہ اور ہم نے موسیٰ پر وحی کی جب کہ اس کی قوم نے پانی مانگا ک چل اپنی لاٹھی کے سہرے اس چٹان پر اس سے بہتے ہیں پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔ان میں ہر ایک نے اپنا گھاٹ جان لیا کھاؤ اور پیو خدا کے رزق سے اور زمین پر مفسد ہو کر نافرمانی مت کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے پھر اپنے پروردگار سے دعا مانگ کہ ہمارے لیے وہ چیزیں نکالے جو زمین اگاتی ہے۔ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز اور لہسن موسیٰ نے کہا تم بدلنا چاہتے ہو برے کو بھلے سے جا اترو شہر میں کہ تم کو ملے گا جو تم مانگتے ہو۔(بقر)

اور ہم بنی اسرائیل کو دریا سے نکال لے گئے پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس آئے جو اپنے بتوں کو سیوا کرتے تھے بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایسے معبود بنا جیسے ان کے معبود ہیں موسیٰ نے کہا کہ بے شک تم جاہل قوم ہو یہ خراب حالت ہے جس میں یہ لوگ ہیں اور غلط ہے جو یہ کرتے ہیں اور جب ہم نے تم سے کہا کہ داخل ہو اس شہر میں پھر کھاؤ اس میں سے جو چاہو پیٹ بھر کر اور داخل ہو دروازوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو کہ ہم معافی چاہتے ہیں بخش دیں گے ہم

تمہاری سب خطائیں اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ دیں گے پھر ظالموں نے بات
بدل دی اس کے سوا جو ان سے کہی گئی تھی پھر ہم نے ان کی بدکاری کے سبب ان پر
آسمان سے آفت بھیجی اور جب موسیٰ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اسکے پروردگار نے
اس سے بات کی تو اس نے کہا کہ تو مجھ کو اپنے تئیں دکھا دے تا کہ میں تجھ کو ہر گز نہیں
دیکھ سکتا لیکن تو اس پہاڑ کو دیکھ پھر اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو مجھ کو دیکھ سکے گا پھر
جب اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰ بے
ہوش ہو کر گرا پھر جب ہوش میں آیا تو کہا کہ تو پاک ہے اے اللہ میں توبہ کرتا ہوں
تیرے سامنے اور میں پہلا ایمان لانے والا ہوں۔ خدا نے کہا اے موسیٰ میں نے تجھ
کو اور لوگوں پر اپنا رسول کرنے اور خود کلام کرنے سے برگزیدہ کیا ہے پھر جو میں تجھ کو
دیتا ہوں اس کو لے اور شکر کرنے والوں میں ہو اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم تجھ پر
ایمان نہ لاویں گے جب تک کہ علانیہ خدا کو نہ دیکھیں اور موسیٰ نے ہمارے وقت
مقررہ پر حاضر ہونے کے لیے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چھانٹے پھر تم کو بجلی کی کڑک
نے پکڑ لیا اور یہ سب باتیں تم دیکھتے تھے پھر ہم نے تم کو تمہارے مر جانے (بے ہوش
ہو جانے) کے بعد اٹھایا کہ شاید تم شکر کرو۔ پھر جب ان کو کپکپاہٹ نے پکڑا تو
موسیٰ نے کہا اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی ان کو اور مجھ کو بھی مار ڈالتا اور
جب ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا کہ مضبوط پکڑو جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے شاید
کہ تم بچ جاؤ اور جب ہم نے ان پر پہاڑ کو اٹھایا گویا کہ وہ سائبان تھا اور انہوں نے
گمان کیا کہ وہ ان پر کرے گا مضبوطی سے پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے۔ ہم نے موسیٰ
سے کہا کہ کیوں تم جلدی کر کے چلا آیا۔ اپنی قوم کے پاس سے کہا وہ بھی میرے پیچھے
ہیں اور میرے تیرے پاس جلدی چلا آیا ہوں تا کہ اے پروردگار تو راضی ہو اور وعدہ

کے اہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور ہم نے پورا کیا اس کو دس سے پھر تمام ہو گئی میعاد اس کے پروردگار کی چالیس رات اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میرا خلیفہ ہو اور اصلاح کر اور مفسدوں کے طریق کی پیروی مت کر۔ موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیور سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں سے آواز نکلتی تھی خدا نے موسیٰ سے کہا کہ ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو فتنہ میں ڈالا اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا۔ پھر سامری نے ان کے لیے بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں آواز نکلتی تھی پھر وہ بولے کہ یہ ہے ہمارا خدا اور موسیٰ کا خدا تو بھول گیا کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کی بات کا الٹ کر جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے لیے ضرر اور نہ نفع پہنچانے کا مالک ہے اور پہلے ہی ہارون نے ان سے کہا تھا کہ اے قوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم اس سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو اور بے شک تمہارا پروردگار رحم والا ہے۔ میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو انہوں نے کہا کہ ہم اس کی سیا کیا کریں گے جب تک کہ موسیٰ لوٹ کر نہ آوے پھر موسیٰ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آیا غصہ میں بھرا ہوا افسوس کرتا ہوا موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے اس بچھڑے کے بنانے میں اپنی جانوں پر ظلم کیا توبہ کرو اللہ کے سامنے اور مار ڈالو اپنی جانوں کو کہ یہی تمہارے حق میں تمہارے خدا کے نزدیک بہتر ہے جن لوگوں نے بچھڑا بنایا قریب ہے کہ ان کے پروردگار کا غصہ ان تک پہنچے گا اور ذلت دنیا کی اس زندگی میں۔

موسیٰ نے کہا اے قوم میری کیا تم سے خدا نے وعدہ نہیں کیا تھا اچھا وعدہ اور کیا ایک لمبا زمانہ تم پر گذر گیا تھا بلکہ تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غصہ اترے اس لیے تم نے میرے وعدے کے برخلاف کیا موسیٰ نے کہا کہ بہت برا کیا تم نے میرے بعد کیا جلدی کی تم نے اپنے پروردگار کے حکم میں اور پھینک دے الواح توریت کو

اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اس نے کہا کہ اے میرے ماں جائے ان لوگوں نے مجھ کو کمزور جانا تھا اور مجھ کو مارے ڈالتے تھے پھر میرے دشمنوں کو مت خوش کرو اور مت کرو مجھ کو ان ظالموں کے ساتھ۔ مجھ کو یہ ڈر تھا کہ تو یہ کہے گا تو نے تفریق ڈال دی بنی اسرائیل میں اور نہ انتظار کیا تو نے میری بات کا انہوں نے کہا ہم نے تو اپنے اختیار سے تیرے وعدے کے خلاف نہیں کیا بلکہ ہم قوم (قبطی) کے زیور کا بوجھ اٹھا رہے تھے پھر ہم نے اس کو پھینک دیا اور اسی طرح پھینک دیا سامری نے۔ پھر سامری نے بچھڑے کی مورت بنائی جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے اس نے کہا مجھے وہ بات سمجھائی جو ان کو نہیں سمجھائی پھر میں نے پیغمبروں کے پانوں تلے کے نشان کی مٹی لی پھر میں نے بچھڑے میں ڈال دی اور اسی طرح کرنا میرے دل نے مجھے اچھا بنایا موسیٰ نے کہا کہ دور ہو تجھ کو اس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو کہتا رہے گا کہ میرے پاس مت آ ئ۔

پھر جب موسیٰ کا غصہ تھا تو اس نے الواح کو اٹھالیا اور اس میں اس کے لیے ہدایت اور رحمت تی جو ڈرتے ہیں۔ پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی لوگ نیکی کرنے والے ہیں ان پر تعمت پوری کرنے کو اور ہر چیز کی تفصیل بتانے کو اور ہدایت اور رحمت کرنے کو کہ شاید وہ اپنے پروردگار سے ملنے پر ایمان لاویں۔

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا اور ان میں سے بارہ سردار کھڑے کیے اور خدا نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم قائم کرتے رہو گے نماز اور تم دیتے رہو گے زکوۃ اور تم ایمان لاتے رہو گے میرے رسولوں پر اور تم مدد کرتے رہو گے ان کی اور تم قرض دیتے رہو گے اللہ کو قرض حسنہ۔

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم کو یہ حکم کرتا ہے کہ ذبح کرو بیل کو

انہوں نے کہا کہ کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے موسیٰ نے کہا کہ میں تو اللہ سے پناہ مانگتا ہوں جاہل قوم سے انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے پوچھ کہ ہم کو بتلاوے کہ وہ کیسا بیل ہو کہا کہ وہ بیل نہ بوڑھا ہو اور نہ بچہ میانہ سال ان دونوں کے بیچ میں کرو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے پوچھ کہ بتلاوے کیا ہو اس کا رنگ موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ بیل ڈھڈھاتے زرد رنگ کا ہو اس کا رنگ خوش کرتا ہو دیکھنے والوں کو انہوں نے کہا کہ پوچھ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہ بتلاوے وہ کیسا ہے کہ ہم پر بیل مشتبہ ہو گئے ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پاویں گے۔

موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ ایسا بیل ہو جو نہ جوتا ہو کہ زمیں کو پھاڑے یا کھیتی کو پانی دے اس کے تمام اعضا مسلم ہوں اور اس میں کوئی دھبہ نہ ہو انہوں نے کہا اب تو نے ٹھیک بات بتائی پھر انہوں نے ذبح کیا او وکرتے نہیں لگتے تھے اے لوگو تم اس پاک زمین میں داخل ہو جو خدا نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور مت پھرو اپنے پیٹ کے بل پیچھے پھرو پلٹو گے اپنے پیٹ کے بل پیچھے پھرو پلٹو گے نقصان اٹھانے والے انہوں نے کہا اے موسیٰ اس میں تو بہت زبردست قوم رہتی ہے ہم ہرگز اس میں نہیں جائیں گے جب تک کہ وہ اس میں سے نہ نکل جاویں جب وہ اس زمین سے نکل جاویں گے تب ہم اس میں داخل ہوں گے ان میں سے دو آدمیوں نے کہا کہ جو خدا سے ڈرتے تھے جن پر خدا نے نعمت کی تھی کہ اے لوگو جا گھسو اس قوم کے دروازہ میں جب تم جا گھسو گے تم ہی غالب ہو گے اور خدا ہی پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز اس میں نہیں گھسیں گے جب تک کہ وہ اس میں ہیں تو جا اور تیرا پروردگار تم دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ موسیٰ

نے کہا اے پروردگار مجھ کو اختیار نہیں فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا تھا وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا۔

اس مقام پر یہ بحث پیش آوے گی کہ جب ''ضرب'' کے معنی چلنے کے آتے ہیں اس کے صلہ میں ''فی'' کا لفظ آتا ہے جیسے کہ

''اذ اضربتم فی الارض''

میں ہے حالانکہ

''فاضرب بعصاک البحر''

اور

''فاضرب بعصاک الحجر''

میں ''فی'' نہیں ہے مگر ''فی'' کے نہ ہونے سے کچھ ہرج نہیں ہے اس لیے کہ جب ''ضرب'' کے معنی چلنے کے لیے جاتے ہیں تو بواسطہ حرف جر یعنی ''فی'' کے متعدی کیا جاتا ہے اور جو افعال کہ بواسطہ جر کے متعدی ہوتے ہیں ان میں حرف جر کو محذوف کرنا اور فعل کو بلا واسطہ مفعول کی طرف متعدی کرنا جائز ہے اور اس مفعول کو منصوب علی نزع الخافض کہتے ہیں۔

اس مقام پر ''اضرب'' کے ''عصا'' کے ساتھ ربط دینے کو ایک حرف جر یعنی ''ب''، 'عصا' پر آچکی تھی پھر اس فعل کو مفعول کی جانب متعدی کرنے کے لیے دوسرے حرف جر یعنی ''فی'' کا لانا کسی قدر فصاحت کلام کے مناسب نہ تھا اور اس لیے اس کا حذف اولیٰ تھا۔ پس تقدیر کلام کی یہ ہے کہ

'' فاضرب بعصاک البحر''

اور قرینہ حذف ''فی'' کا خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیوں کہ یہی قصہ انہی الفاظ

سے سورۃ طٰہٰ میں بھی آیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ

"فاضرب لھم طریقا فی البحر"

پس ایک جگہ لفظ "فی" مذکور ہے تو یہی قرینہ باقی مقامات میں اس کے محذوف ہونے کا ہے۔ اسی آیت میں فعل "اضرب" کے بلا واسطہ حرف جرم متعدی المفعول ہونے کی مثال بھی موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب

مگر اپنی جان پر اور اپنے بھائی پر پھر ہم میں اور اس بد کار قوم میں فرق کو خدا نے فرمایا کہ وہ حرام کر دی گئی ہے ان پر چالیس برس تک وہ ٹکراتے پھریں گے زمین اور تو رنج مت کر اس بد کار قوم پر۔

نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے کہ "پس برو برائے ایشاں در راہ خشک" یعنی شاہ صاحب نے "ضرب" کے معنی زدن کے نہیں لیے رفتن کے لیے ہیں جو لازمی ہے اور لفظ "طریقا" اس آیت میں "اضرب" کا مفعول ہے اور بلا واسطہ حرف جو متعدی الی الفعول ہوا ہے۔

جغرافیہ کے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ خلیج عرب اور بحر احمر عدن کے پاس مل گئے ہیں دونوں طرف پہاڑ ہیں اور ان کے بیچ میں نہایت تنگ رستہ ہے جو جہاز خلیج عرب سے بحر احرم میں جاتے ہیں وہ اسی تنگ رستہ میں ہو کر گزرتے ہیں اس رستہ کو طے کرنے کے بعد بحر احمر ملتا ہے جو نہایت بڑا اور وسیع سمندر ہے جب اس کے شمال کی طرف چلے جاؤ تو اخیر کو اس کی دو شاخیں ہوگئی ہیں "اگر تم اپنے دائیں ہاتھ کو چت کر کر سب انگلیاں بند کرو اور صرف بیچ کی انگلی اور کلمے کی انگلی کھول دو اور دونوں کو پھیلا کر تا نو تو بحر احمر کی شاخوں کی بالکل صورت بن جاوے گی۔ کلمہ کی انگلی دائیں طرف رہے گی اور بیچ انگلی بائیں طرف اور ان دونوں کے بیچ میں ایک مثلث کی صورت دکھائی دے گی۔ بحر احمر کی دائیں شاخ جو

جانب شرق ہے چھوٹی ہے جیسے کہ کلمہ کی انگلی چھوٹی ہے اور بائیں شاخ جو جانب غرب ہے کسی قدر بڑی ہے جیسے کہ بیچ کی انگلی بڑی ہے اور یہ سمجھو کہ بیچ کی انگلی یعنی بڑی شاح کے بائیں طرف مصر ہے اور ان دونوں انگلیوں کے بیچ میں جو مثلث جگہ ہے وہ جگہ ان جنگلوں اور پہاڑوں کی ہے جہاں بنی اسرائیل چالیس برس تک ٹکراتے پڑے پھرے اور اسی جگہ کوہ سینا یا کوہ طور ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو تجلی ہوئی اور توریت ملی۔

جس زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں رہتے تھے فرعون مشہور بادشاہ تھا اس زمانہ میں اس کا دارلسلطنت شہر رامیس تھا اس کے بائیں طرف تھوڑے فاصلہ پر دریائے نیل تھا اور دائیں طرف یعنی جانب مشرق تین منزل کے فاصلہ پر بحر احمر کی بڑی شاخ تھی حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو شہر رامیس سے لے کر نکلے پہلی منزل ''سکوت'' میں ہوئی دوسری منزل ''ایثام'' میں تیسری منزل ''فھا حیروت'' میں یہ مقام بحر احمر کی بڑی شاخ کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب غرب۔ اس شاخ کی نوک کے پاس واقع تھا۔ جب فرعون نے مع اپنے لشکر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ تو راتوں رات حضرت موسیٰ اسرائیل سمیت بحر احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے جہاں ہم نے نقشہ میں نقطوں کا نشان کر دیا ہے پار اتر گئے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ سبب جوار بھاٹے کے جو سمندر میں آتا رہتا ہے اس مقام پر خشک زمین نکل آتی تھی اور کہیں پایاب رہ جاتی تھی بنی اسرائیل پایاب وخشک راستہ سے راتوں رات بہ امن اتر گئے۔ یہی مطلب صاف اس آیت سے پایا جاتا ہے۔ جو سورۃ دخان میں ہیکہ

''واترک البحر رھوا''

جس کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ چھوڑ چل سمندر کو ایسی حالت میں کہ اترا ہوا ہے۔ صبح ہوتے فرعون نے جو دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اتر گئے اس نے بھی ان کا تعاقب کیا اور لڑائی کی گاڑیاں اور سوار پیادے غلط رستے پر سب دریا میں ڈال دے اور وہ وقت پانی کے بڑھنے

کا تھا لمحہ لمحہ میں پانی بڑھ گیا جیسے کہ اپنی عادت کے موافق بڑھتا ہے اور دباؤ ہو گیا جس میں فرعون اور اس کا لشکر ڈوب گیا۔

علمائے اسلام کا زمانہ گیارہ بارہ برس سے سمجھنا چاہیے ان بزرگوں نے جو اپنے ہوش سے بحر احمر اور اس کی شاخ اس کو جس میں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا نہایت عمیق اور ایک قہار سمندر دیکھا ہے اور ان کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کیسا ہی بڑا جوار بھاٹا آوے وہ جگہ کبھی پایاب نہیں ہو سکتی اس لیے انہوں نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت اور الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت کرتی تھی الٹ پلٹ کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے بنایا اور ایسا معجزہ جو قانون قدرت کو بھی توڑ دے ٹھیرا دیا۔ مگر حقیقت حال یہ نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب بنی اسرائیل نے عبور کیا بحر احمر ایسا قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے۔ گو اس زمانہ کا صحیح جغرافیہ ہم کو نہ ملے مگر بہت پرانا جغرافیہ جو بطلیموس نے بنایا تھا مع اس کے نقشہ جات کے جو بطلیموس کے جغرافیہ کیمطابق بنائے گئے ہیں خوش قسمتی سے ہمارے پاس موجود ہے اور اس میں بحر احمر کا بھی نقشہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بطلیموس کے زمانہ تک بحر احرم میں تیس چھوٹے بڑے جزیرے موجود تھے اور یہ صاف دلیل اس بات کی ہے کہ اس زمانہ میں بحر احمر ایسا قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے یا جیسا کہ ہمارے علمائے اسلام بارہ سو برس سے اس کو دیکھتے آئے ہیں۔ بحر احمر کی اس حالت پر خیال کرنے سے بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مقام جہاں سے بنی اسرائیل اترے تھے بلاشبہ جوار بھاٹے کے سبب رات کو پایاب اور دن کو عمیق ہو جاتا ہوگا۔ مزید توضیح کے لیے بطلیموس کے جغرافیہ میں سے بعینہٖ بحر احمر کے نقشہ کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ یہ جغرافیہ ہمارے پاس اصل یونانی زبان میں جس میں بطلیموس نے لکھا تھا مع لیٹن ترجمہ کے موجود ہے۔ جو ۱۶۱۸ء میں لوئیس سیزدہم شاہ فرانس کے عہد

میں چھپا تھا۔ اس میں تمام جزیرے جو بحر احمر میں موجود تھے مندرج ہیں۔ مورخین کے قول کے بموجب بنی اسرائیل سنہ عیسوی سے دو ہزار پانسو تیرہ برس قبل بحر احمر کی شاخ سے اترے تھے اور بطلیموس جس نے جغرافیہ لکھا تھا اور جس کو گلاڈیوس ٹالمی کہتے ہے سنہ عیسوی کی دوسری صدی میں تھا پس بنی اسرائیل عبور کرنے کے دو ہزار سات سو برس بعد تک وہ جزیرے موجود تھے۔ یہ بطلیموس یونانی تھا مگر مصر میں رہتا تھا اور اس لیے بحر احمر کا جو حال اس نے لکھا ہے زیادہ اعتبار کے لائق ہے سمندر کے جزیرے مدت تک نکلے رہتے ہیں اور پھر کسی زمانہ میں ان اسباب سے جن کا ذکر علم جیالوجی میں ہے دفعتہ زمیں میں بیٹھ جاتے ہیں اور جہاں لوگ بستے تھے اور جن پایاب مقامات پر لوگ چلتے تھے وہاں دفعتہ میلوں گھوا پانی ہو جاتا ہے اسی طرح بطلیموس کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں یہ جزیرے بھی جو بحر احمر میں تھے غائب ہو گئے ہیں اور اب ہم کو اتنا بڑا اتھاہ سمندر دکھائی دیتا ہے مگر موسیٰ کے عہد میں ایسا نہ تھا اور اس بات پر یقین کرنے کی بہت سی وجوہات ہے کہ حضرت موسیٰ کو اس مقام پر سمندر کے پایاب ہو جانے کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے یہ رستہ انہوں نے اختیار کیا تھا۔ کیوں کہ سمندر کے پار ایسے جنگل و پہاڑ تھے جس میں فرعون کو لشکر لے جانا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرنا غیر ممکن تھا۔

اسماء جزیرہ ہائے بحر احمر

۱۔ تمی جینس
۲۔ ونرس
۳۔ زجینیا
۴۔ اگئی تھونس
۵۔ دیموئم
۶۔ اسارٹی
۷۔ پالی پچ
۸۔ ایرا پلیڈس
۹۔ جبسی لٹس
۱۰۔ گوماڈیرم
۱۱۔ جریکم
۱۲۔ سیٹی رورم
۱۳۔ کیٹی ٹھری
۱۴۔ میرونس
۱۵۔ تھرب ڈی ڈیس
۱۶۔ ساکرٹیٹس

۱۷۔ مجورم

۱۸۔ گارڈی منیڈ

۱۹۔ ڈیف نین

۲۰۔ ایری

۲۱۔ اکبن تھین

۲۲۔ کیم بستا

۲۳۔ مکبر نیا

۲۴۔ ارنیان

۲۵۔ بیکائی

۲۶۔ ایڈینی

۲۷۔ ڈایودوارے

۲۸۔ پینس

۲۹۔ اسی ڈس

(عجل) بچھڑا بنانے کا واقعہ اس وقت ہوا تھا جب کہ حضرت موسیٰ چالیس دن رات پہاڑ پر جا کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل نے بچپن سے مصریوں میں پرورش پائی تھی اور دیکھا کرتے تھے کہ وہ ساری قوم بتوں اور جانوروں کی پرستش کرتی ہے مصری بندر اور سانپ اور بیل اور بہت سے قسم کے جانوروں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جب بنی اسرائیل سمندر کے پار ہوئے تو وہاں بھی انہوں نے بتوں کی پرستش کرتے ہوئے لوگوں کو پایا اور موسیٰ سے کہا کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے (یہ قصہ سورۃ اعراف میں ہے) گمان غالب ہوتا ہے کہ وہ لوگ بچھڑے ہی کی مورت کی پوجا کیا کرتے ہوں گے اور اسی کی نقل پر بنی اسرائیل نے بھی

بچھڑے کی مورت بنائی تھی۔ جس کے سبب خدا کی خفگی ہوئی۔

(فاقتلوا) اس آیت سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ بنی اسرائیل میں سے کسی ایک نے بھی اپنے آپ کو مار ڈالا تھا کیوں کہ یہ کہنا کہ "مار ڈالو اپنے آپ کو" حضرت موسیٰ کا قول ہے ور یہ کہنا اس طرح کا کہنا ہے جیسے کوئی بزرگ کسی کو نفریں کرتے وقت کہے کہ ڈوب مر ایسا کرنے سے تو تیرا مرنا بہتر ہے۔ پس بنی اسرئیل پر خود حضرت موسیٰ کے غصہ کے یہ الفاظ ہیں خدا نے ان کو اپنے تئیں آپ مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ نہ ان میں کسی نے اپنے تئیں آپ مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ نہ ان میں کسی نے اپنے تئیں آپ مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ نہ ان میں کسی نے اپنے تئیں آپ مار ڈالا تھا یہ مطلب اس آیت کے پچھلے حصہ سے جس میں معاف کر دینے کا ذکر ہے زیادہ تر صاف ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں نے گو سالہ پرستی کی تھی انہی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ "پھر خدا نے تم کو معاف کیا۔"

(نری الله جهرة)

انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے کی خواہش تین طرح پر پیدا ہوتی ہے اس کا حال اور اوصاف سننے سے یا دل میں کسی خاص قسم کا ذوق وشوق پیدا ہو جانے سے یا اس کا حال کہنے والے کی بات پر یقین نہ کرنے سے، موسیٰ کو بھی خدا کے دیکھنے کا شوق ہوا مگر وہ شوق دوسری قسم کا تھا جس کے غلبہ میں انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور ہونی نہ ہونی بات کہہ اٹھتا ہے۔ بنی اسرائیل نے بھی خدا کو دیکھنا چاہا مگر یہ ان کا سوال تیسری قسم کا تھا وہ موسیٰ کی اس بات پر کہ خدائے پروردگار عالم موجود ہے اور اس نے موسیٰ کو اپنا پیغمبر کیا ہے یقین نہیں لاتے تھے اور اس بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو دکھا دے جب تک ہم علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیویں گے تجھ پر ایمان نہ لاویں گے۔ حضرت موسیٰ اپنے شوق کے سبب جس میں انسان کو زھول ہو جاتا ہے بھول گئے کہ خدا ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دے سکتا

اور بنی اسرائیل نے اپنی حماقت سے یہ چاہا کہ علانیہ خدا کو ہم دیکھ لیں اور یہ نہ سمجھے کہ خدا اپنے تئیں نہ کسی کو دکھا سکتا ہے اور نہ کوئی خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ ہر کوئی اس کی قدرت کا کرشمہ دیکھتا ہے اور اسی سے اس کی ذات کے موجود ہونے پر یقین لاتا ہے۔

(صاعقہ) صاعقہ کے معنی لغت میں، موت کے بھی ہیں اور عذاب مہلک کے بھی ہیں۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس عذاب سے کوئی ہلاک ہوئے بغیر رہے ہی نہیں اور عذاب یا بلا آنے کی ملسانہٹ اور گڑگڑاہٹ اور کڑک کے معنی بھی آتے ہیں اور بجلی آسمان پر سے گرنے والی آگ کے معنی بھی ہیں اور

"صعق" یکسر العین

کے معنی

"غشی علیه" یعنی بے هوش کیا گیا.

ا۔ دیکھنا چاہیے کہ اس جگہ

فاخذتکم الصاعقة

کے کیا معنی ہیں۔ موت کے معنی تو یہاں ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ

" وانتم تنظرون"

کا مطلب غلط ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ موت کی نسبت

"وانتم تنظرون "

نہیں کہہ سکتے۔ امام فخرالدین رازی بھی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں صاعقہ کے معنی موت کے نہیں ہیں کیوں کہ موت کی نسبت

"تنظرون"

نہیں آسکتا اور اسکے سوا خدا نے سورۃ اعراف میں فرمایا ہے

''وخر موسیٰ صعقا''

اور پھر فرمایا ہے

''فلما افاق''

اور افاقہ موت سے نہیں ہوتا بلکہ غشی سے ہوتا ہے سورہ اعراف میں

''صاعقہ''

کی جگہ

''رجفعہ''

فرمایا ہے جس کے معنی کب کپاہٹ کے ہیں۔ غرضیکہ اس جگہ

''صاعقہ''

کے معنی موت کے نہیں ہیں بلکہ ٹھیک معنی، گرج اور گڑگڑاہٹ ہیں ہیں خواہ وہ گرج بجلی ہو خواہ وہ گڑگڑاہٹ بادل کی ہو یا کسی آتشیں پہاڑ کی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب کہ اسی آیت میں ہے کہ

''ثم بعثنا کم من بعد موتکم''

تو یہ ایک قومی ثبوت اس بات کا ہے کہ یہاں 'صاعقہ' کے معنی موت کے ہیں مگر مفسرین اور خصوصا امام فخر الدین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی، بعث کا اطلاق

''لا بعد الموت''

پر بھیھ ہوتا ہے۔ جیسے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ

فضربنا علی اذانهم فی الکهف سنین عدداًثم بعثنا هم پس بعثنا

کے لفظ سے تو، صاعقہ کے معنی موت کے لینے پر استدلال نہیں ہوسکتا رہا لفظ، ''موت'' کا اس کی نسبت مفسرین نے نہایت سہل رستہ اختیار کیا ہے جو ہم کو نہایت ہی مشکل

اور پیچ دار معلوم ہوتا ہے انہوں نے فرمایا کہ محققین کا یہ قول ہے کہ ''صاعقہ'' سے مراد تو سبب موت ہے اور موت کے معنی موت ہی کے ہیں خدا نے ان لوگوں کو جو خدا کو دیکھنے گئے تھے صاعقہ سے جو سبب ان کی موت کا ہوا مار ڈالا اور پھر حضرت موسیٰ کی دعا سے اور گڑگڑا کر یہ کہنے سے کہ یہ تو ستر کے ستر مر گئے اب بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دوں گا اور میری نوبت کی گواہی کون دے گا خدا نے پھر انکو زندہ کر دیا۔

مگر میری سمجھ میں خدائے پاک کا کلام ایسا بودا نہیں ہے بلکہ جیسا اس کا قانون قدرت مستحکم اور مضبوط ہے ایسا ہی اس کا کلام بھی مضبوط ہے۔ جب کہ ہم کو یہ ثابت ہو گیا کہ صاعقہ کے معنی موت کے نہیں ہیں بلکہ اس مقام پر جو ہو بھی نہیں سکتے اور 'بعث' کا اطلاق

''لا بعد الموت''

پر بھی آتا ہے تو ہم لفظ ،موت، کو اس کے حقیقی معنوں پر یعنی بدن سے جان نکل جانے پر اطلاق نہیں کر سکتے بلکہ مردے کے مانند ہو جانے پر اطلاق کرتے ہیں اور اس کی دلیل خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس لیے کہ جو واقعہ اس مقام پر بیان ہوا ہے وہی واقعہ سورہ اعراف میں بھی آیا ہے اور وہاں یہ فرمایا ہے۔

''فلما اخذتھم الرجفة قال رب لو شئت اھلکتھم من قبل و ایای''.

یعنی بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی جو خدا کے دیکھنے کے لیے گئے تھے ڈر کے مارے کانپنے لگے تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی ان کو اور مجھ کو بھی مار ڈالتا۔

اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان کے مرنے تک نوبت نہ پہنچی تھی یا بے ہوش ہو گئے تھے یا ان کی حالت مردے کی سی ہو گئی تھی اور اسی سبب سے یہاں ان پر مردہ کا اطلاق کیا گیا ہے علاوہ اس کے حضرت موسیٰ پر بھی پروردگار کی تجلی ہوئی تھی جس کے سبب پہاڑ ٹکڑے

ٹکڑے ہوگیا تھا وہاں یہ لفظ

"وخر موسیٰ صعقا"

یعنی موسی بے ہوش ہوکر گر پڑا، سورہ احزاب ا میں خود خدا تعالیٰ نے خوف کی حالت کو

ا . فاذا جاء الخوف رایتم ینظرون الیک ترزوا رائیتم کالذی یغشی علیہ من الموت (احزاف) ، ۱۹

موت کی بے ہوشی کی حالت سے تشبیہ دی ہے پس ان سب آیتوں کے ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر بھی یہی حالت گزری تھی۔

موت کے لفظ کا نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔امام فخرالدین رازی اور صاحب تفسیر ابن عباس نے سورہ زمر کی تینتالیسویں آیت میں لفظ موت کو بہ معنی نوم قرار دیا ہے، 'حین موتہا' کی تفسیر 'حین منامہا' اور قرآن مجید میں رنج میں پڑے رہنے پر بھی موت کے لفظ کا استعمال ہوئے جہاں سورۃ آل عمران میں فرمایا ہے

"قل موتو ابیظکم"

یعنی اپنے غصہ سے مر جاؤ۔یعنی اس میں مبتلا رہ ڈھے ہوا ہے شہر غیر آباد یا فصل گزری ہوئی زمین پر بھی کا استعمال ہوتا ہے بے جان یا معدوم شے پر بھی موت کا لفظ بر جاتا ہے جہاں فرمایا ہے کہ

کنتم امو اتا فاحیا کم ثم یمیتکم ثم یحببکم

اور جگہ فرمایا ہے

یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی

غرض کہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس مقام پر لفظ 'موتکم' سے جو قرآن مجید میں آیا

ہے ان لوگوں کے فی الحقیقت مر جانے پر استدلال نہیں ہوسکتا۔

یہ تمام واقعات موسیٰ و بنی اسرائیل پر سینا کے مقام میں گزرے تھے وہاں ایک سلسلہ پہاڑوں کا ہے جس کو طور سینا، یا طور سینین کہتے ہیں اور کبھی صرف طور ہی اس کا نام لیتے ہیں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں وہ کوہ آتش فشاں تھا جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اس کی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے اور کچھ ان کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ پس وہ ان کو اس پہاڑ کے قریب لے گئے جس کی آتش فشانی اور گڑگڑاہٹ اور زور شور کی آواز اور پتھروں کے اڑنے کے خوف سے وہ بے ہوش یا مردے کی مانند ہو گئے۔ خدا تعالیٰ ان تمام کاموں کو جو اس کے قانون قدرت سے ہوتے ہیں خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے جن کے منسوب کرنے کا بلا شبہ وہ مستحق ہے اس طرح ان واقعات عجیبہ کو بھی اس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

اس بات کا آثار کہ کوہ سینا درحقیقت آتش فشاں تھا۔ اب تک پائے جاتے ہیں اور ہر شخص اب بھی جا کر دیکھ سکتا ہے ایک بہت بڑا عالم شخص یعنی کپتان اسٹینلی حال میں بطور سیاحت اس وادی مین گئے تھے جہاں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے گزر کیا تھا ۔انہوں نے اس پہاڑ کا حال اس طرح پر لکھا ہے کہ ''چٹانوں کی راہ سے جو بطور زینہ کے بنی ہوئی تھیں ہم ایک وادی میں پہنچے جو سرخ پتھر کے پہاڑوں کے درمیان تھیں یہاں پر عجیب و غریب پہاڑ دیکھنے میں آئے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا سرخ و سیاہ مادہ کی گرم نہریں ان پر بہتی ہیں درحقیقت آتشی مادہ اوپر بہہ آیا تھا جب کہ وہ زمین سے اٹھتے تھے یہ راستہ ایسی جگہ ہو کر گزرتا تھا اں بجز جلے ہوئے مادوں اور خاکستر کے اور کچھ نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ہتھیار ڈھالنے کے کارخانے میں ڈھیر ہوتے ہیں یہاں اکثر ایسی چیزیں دیکھنے میں آئیں جن کو کوئی نیا آدمی آتش فشاں پہاڑ کے آثار تصور کرے لیکن یہ غلط فہی ہے

جلے پہاڑوں کی مانند جو بڑے بڑے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں وہ صرف لوہے کے ریزے ہیں جو بھرے بھرے پتھروں کی بناوٹ میں ملے ہوئے ہیں سرخی مائل پتھر کی چٹانوں میں جو آتشی عمل کے آثار پائے جاتے ہیں وہ ان کی ابتدائی اٹھان سے متعلق ہیں۔ نہ کسی بعد کے انقلاب سے، ہر جگہ پانی کے عمل کے آثار ہیں آگے کے کہیں نہیں ہیں۔''

کینن اسٹینلی بہت بڑے پادری اور عیسائی مذہب کے پیشوا ہیں۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ درحقیقت خدا ہی آگ کی صورت میں پہاڑ پر اترا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی تحریر میں اس پہاڑ کو آتشیں پہاڑ کہنے سے بہت بچایا ہے۔ مگر جو شے کہ موجود ہے اس کو کوئی شخص ہیر پھیر کر بیان کرنے سے معدوم نہیں کرسکتا۔ خود توریت میں جو کچھ اس پہاڑ کی نسبت بیان ہوا ہے (اگر صحیح تسلیم کیا جاوے) تو کچھ شبہ نہیں رہتا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ تھا۔ کتاب خروج باب نوزدہم میں لکھا ہے کہ ''بوقت طلوع صبح رعدہا و برقہا و غمامہ و مظلمہ بلائے کوہ نمایاں شد و آواز کرنا بحدے شدید شد کہ تمامی وقوی کہ درار دو بودند لرزیدند و تمامی کوہ سینی را دود فرا گرفت و دودش مثل دود تنور متصاعد بود و تمامی کو بغایت متزلزل شد، یہ تمام حالتیں وہ ہیں جو کوہ آتش فشاں میں واقع ہوتی ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ آتش فشاں تھا اور لینن اسٹینلی کی یہ تاویل کہ وہ نشانیاں اس پہاڑ کی بناوٹ ہی کی ہیں صحیح نہیں ہوسکتی۔

خدا کی تجلی ہر چیز میں ہے جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے بنایا اور پیدا کیا۔ ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ

فلما تجل ربنا علی الجبل ، فلما تجلی ربنا علی البحر ، فلما تجلی ربنا علی الانسان ، فلما تجلی ربنا علی الحمار ، فلما تجلی ربنا علی البعوضة. وما فوقها ، فقد وقع کذا.

مگر کسی مادی یا فانی صورت میں نہ خدا آ سکتا ہے نہ سما سکتا ہے پس ہم توریت کے اس لفظ پر کہ ''خداوند در آتش بر آں تنزل نمود'' یقین نہیں لا سکتے گو کینن اسٹینلی کو یقین ہو۔ ہاں اگر ان لفظوں کے معنی بھی تجلی اور ظہور قدرت کے لیے جاویں تو پھر مقام انکار نہیں رہتا۔

(وظللنا علیکم الغمام)

توریت میں بنی اسرائیل پر بادلوں کی چھاؤں ہونے کا واقعہ عجیب طرح سے لکھا ہے کہ بادل تمام دن بنی اسرائیل کو راہ دکھانے کے لیے ان کے آگے آگے چلتا تھا اور جہاں ٹھہر جاتا تھا وہاں بنی اسرائیل قیام کرتے تھے اور رات کو وہی بادل روشنی کا ستون ہو جاتا تھا مگر اس پر کیوں کر یقین ہو سکتا ہے جب کہ چالیس برس تک بنی اسرائیل کو منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملا۔ ہمارے علمائے مفسرین نے بھی اپنی عادت کے موافق یہودیوں کی پیروی کی ہے اور اس آیت کی تفسیر میں ایسی قسم کی باتیں جن کا اشارہ تک اس آیت میں نہیں ہے بیان کی ہیں۔

قرآن مجید سے بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ بادل کا پھرنا معلوم نہیں ہوتا اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دھوپ اور گرمی کی سختی میں بادل آ جانے سے خدا نے ان کی تکلیف کو دور کر دیا جس کا بطور ایک احسان کے ذکر کیا ہے بڑی غلطی لوگوں کے خیال میں یہ ہے کہ جو امور موافق قانون قدرت کے ظہور میں آتے ہیں ان کو نہ معجزہ سمجھتے ہیں نہ احسان جتلانے یا ماننے کے قابل جانتے ہیں اور اس لئے اس میں بالطبع ایسی باتیں شامل کر لیتے ہیں جو قانون قدرت سے خارج ہوں حالانکہ خدا تعالیٰ نے تمام قرآن مجید میں جا بجا بندروں پر انہی باتوں سے اپنا احسان جتلایا ہے اور انہی کو بطور معجزہ کے بتلایا

ا۔ دیکھو کتاب خروج باب ۱۴، ورس ۱۹، ۲۰ باب ۴۰ ورس ۳۴۔۳۸۔

ہے جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے موافق قانون قدرت کے پیدا کیا ہے۔
جب بنی اسرائیل بحر احمر کی شاخ کو پار کر گئے جس کا پانی بسبب جوار بھاٹے کے اتر تا چڑھتا رہتا تھا تو اس پار پتھر اور ریگستان کا ایک مسطح بیابان ہے، وہاں اکثر ریگ کا طوفان رہتا ہے جو اس ملک کے سات مخصوص ہے اور حال کے سیاحوں نے بھی اس کو دیکھا ہے اس ریت کے میدان میں دھوپ کی شدت سے بنی اسرائیل کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔ خصوصا اس وجہ سے کہ ریت بھی بھوبل کی مانند گرم ہوگی جس پر چلنا اور بیٹھنا نہایت مشکل ہوگا۔ ایسے وقت میں ابر کا آجانا بلاشبہ بنی اسرائیل کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی۔ جس کو اس مقام پر بطور احسان کے خدا نے یاد دلایا ہے۔
(من وسلویٰ) 'من' ایک چیز ہے جو بطور ترنجین کے ایک خاص قسم کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے اور سلویٰ بٹیر کی قسم کا جانور ہے جو اس جنگل میں جہاں بنی اسرائیل گئے تھے بکثرت پایا جاتا ہے اور وہاں وہی ان کی غذا تھی۔ پس اسی کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ باقی عجائبات 'من' کے جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر یقین کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ قانون قدرت سے انکار کرنا۔ ان کا کچھ ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ گو مفسرین نے اور انبیاء کے قصے لکھنے والوں نے یہودیوں کی پیروی سے اپنی تصنیفات میں ان کا ذکر کیا ہے۔
حال کے سیاحوں نے بھی اس جنگل میں 'من' کو پایا ہے، کپتن اسٹیلنی لکھتے ہیں کہ چشمہ مرہ سے گذر کر دو وادیاں دیکھیں جس میں سے ایک یقیناً ایلم ہوگی۔ عام صورت اس وسیع میدان کی یہ تھی کہ ایک ریگستان تھا اور جا بجا پانی کے سے راستے جیسے کوئی دریا خشک ہو جاتا ہے بنے ہوئے تھے ان وادیوں کے راستہ راستہ جا کر عجیب سیاہ و سفید پہاڑ ملتے ہیں یہ بیابان بغیر درخت اور گھاس کے تھا لیکن ان وادیوں میں جن پر ایلم کا شبہ ہوتا ہے۔ درخت اور جھاڑیاں موجود تھیں۔ یہاں کھجور کے درخت چھوٹے چھوٹے تھے اور یہاں پر

’تموسک‘ کے درخت بھی تھے جن کے پتوں پر وہ شے جاتی ہے جس کو اہل عرب ’من‘ کہتے ہیں

(واذا قلنا ادخلوا)

اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ کے وقت کا قصہ نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل کا حال ہے، جب کہ وہ حضرت یوشع کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تھے اس شہر کا نام قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے۔ مگر قدیم نام اس کا یریحو ہے۔ جس کو یونانی میں ’جریکو‘ کہتے ہیں اور مسلمان مفسروں نے اس کو ’اریحا‘ لکھا ہے۔

(وادخلو الباب سجدا)

سجدہ سے مراد حقیقی سجدہ کرنا نہیں ہے جس میں ماتھا زمین پر ٹیکنا ہوتا ہے۔ بلکہ خشوع وخضوع سے خدا کا شکر کرتے ہوئے داخل ہونا مراد ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

”(ارادبه الخضوع وهو الاقرب)

یعنی سجدہ سے مراد عاجزی ہے اور یہی معنی اس جگہ زیادہ اچھے ہیں۔

(فبدل)

اس تبدیلی سے کسی لفظ کا بدل دینا مراد نہیں ہے کیوں کہ ان کو الفاظ نہیں بتائے گئے تھے بلکہ استغفار یعنی گناہوں سے معافی چاہنے کا حکم تھا۔ مگر انہوں نے اس حکم کو بدل ڈالا۔ اور توبہ استغفار کی کچھ پروا نہیں کی۔ بلکہ فتح کے سبب مغرور و متکبر ہوگئے۔ امام فخر الدین رازی نے بھی یہ معنی اختیار کیے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ

لما امروا بالتواضع و سوال المغفره لم یمتثلو امر الله ولهم یلتفوا الیه.

یعنی جب کہ ان کو تواضع اور استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو انہوں نے اللہ کے حکم کی

تعمیل نہ کی اوراس پر التفات نہ کیا۔اور بیضاوی میں بھی یہی مطلب تسلیم کیا گیا ہے کہ

"بدلوابما امروا بہ من الوبة والاستغفار طلب مایشھون من اعراض الدنیا "

یعنی انہوں نے بدل دیا حکم توبہ واستغفار کا جوان کو دیا گیا تھا دنیاوی چیزوں کے چاہنے سے جس کے وہ خواہش مند تھے۔

(فانفجرت)

اس آیت میں یہی ایک امر بحث کے لائق تھا کہ پانی کے بارہ چشمے کیوں کر پید ہوئے تھے اوراس بحث کو ہم نے سینتالیسویں آیت کی تفسیر میں بالا ستیعاب بیان کیا۔ پہاڑی ملک کواہل عرب حجر کہتے ہیں جیسے کہ 'عرب الحجر' یعنی عرب کا پہاڑی حصہ اسی طرح،

"فاضرب بعصاک الحجر"

میں لفظ حجر کا استعمال ہوا ہے۔ بحراحمر کی شاخ کوعبور کرنے کے بعد ایک وادی ملتی ہے جس کا قدیم نام ایثام ہے وہاں پانی نہین ملتا۔توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک چشمہ تھا جس کا پانی نہایت تلخ تھا اور پی نہیں سکتے تھےاس لیےاس کا نام 'مرہ' رکھا ہے۔حال کے زمانہ کے سیاحوں نے بھی وہاں ایک چشمہ پایا ہے جس کو وہ 'مرہ' خیال کرتے ہیں یہی مقام ہے جہان بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے پانی مانگا تھا۔اس مقام کے پاس پہاڑیاں ہیں جن کی نسبت خدانے حضرت موسیٰ سے کہا کہ

"فاضرب بعصاک الحجر"

یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چڑھ چل۔اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جس کوتوریت میں 'ایلم' لکھا ہے وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے۔جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑوں کی جڑیاچٹانوں کی دراڑوں میں سے جاری ہوتے ہیں جن

کی نسبت خدا نے فرمایا ہے

" فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا"

یعنی اس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔ اگر ہم توریت کی عبارت پر یقین کریں تو اس سے بھی یہی پایا جاتا ہے اور اسکی یہ عبارت ہے کہ

"بعد ازاں بہ ایلیم آمدند و در آنجا دوازدہ چشمہ آب یافتند و ھفتاد درخت خرما بود و در آنجا بہ پہلوئے آب اردو زدند"

یہ مقام اب بھی موجود ہے اور سیاحوں نے دیکھا ہے۔ مگر اب وہاں پانی کے چشمے نہیں بہتے۔ کیوں کہ پہاڑی چشمے انقلاب زمانہ سے سوکھ جاتے ہیں جیسے کہ مکہ معظّمہ میں زمزم کا چشمہ خشک ہوگیا ہے۔ مگر ایسے مقاموں کو ہمیشہ لوگ مقدس سمجھتے ہیں اور س کے یادگار یا نشان قائم رکھنے کو وہاں کنوئین کھود دیتے ہیں جس طرح کہ مکہ معظّمہ میں چاہ زمزم کھودا گیا ہے۔ اس مقام پر بھی جہاں موسیٰ کو بارہ چشمے ملے تھے۔ لوگوں نے کسی زمانے میں کنوئیں کھودے ہیں اور اب وہاں سترہ کنوئیں موجود ہیں اور وہ مقام عیون موسیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقام پر بھی 'تمر سک' کے درخت ہوتے ہیں جن کے پتوں پر 'من' جم جاتا ہے۔

(واذ قلتم یاموسیٰ)

اس آیت کی تفسیر میں مفسروں نے دو زمانے کی جدا جدا باتوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ بہت لمبی آیت ہے اور اس کے جداگانہ دو حصے ہیں ایک حصہ اس سوال و جواب کا ہے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کیا تھا۔ اور دوسرا حصہ ان واقعات کا ہے جو بعد حضرت موسیٰ بلکہ اس سے بھی بہت زمانہ کے بعد بنی اسرائیل پر واقع ہوئے تھے۔

جن جنگلوں اور میدانوں میں بنی اسرائیل پڑے پھرتے تھے وہاں بجز جنگل کے

جانوروں کے شکار کے یا اس مویشی کے گوشت کے جو بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ تھے اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ ہوتی تھی اور ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بنی اسرائیل دق ہو گئے تھے۔ جس کی شکایت انہوں نے حضرت موسیٰ سے کی اور زمین کی پیداوار کھانے کو مانگی جو شکار کے گوشت یا پلاؤ جانوروں کے گوشت سے ادنیٰ درجہ کی تھی۔ حضرت موسیٰ کا اصلی مقصد فلسطین میں جانا اور وہاں کے شہروں پر قبضہ کرنا کا تھا مگر بنی اسرائیل عمالیقوں اور کنعانیوں سے ڈرتے تھے اور لڑنے پر اور ملک فتح کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ پس جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے زمین کی پیداوار کا کھانا ملنے کی خواہش کی، تو انہوں نے جواب دیا کہ کسی شہر میں چل پڑو اور جا اترو وہاں سب کچھ ملے گا۔ پس اس سے یہ سمجھنا کہ ان کے سفر میں کوئی شہر پڑا تھا اور حضرت موسیٰ نے یا خدا نے اس میں اترنے کا حکم دیا تھا۔ ایک صریح غلط فہمی ہے۔

دوسرا حصہ آیت کا ان واقعات کے بیان میں ہے جب کہ بنی اسرائیل فلسطین میں پہنچ گئے اور شہروں کو فتح کر لیا اور اس میں آباد ہو گئے۔ پھر ان کی بدیوں اور برائیوں اور انبیا کے قتل کے سبب ان پر آفت آپڑی اور ذلیل و خوار اور مسکین بے یارو مددگار ہو گے اور باوجودیکہ ان میں سے بادشاہان ذیشان پیدا ہوئے۔ مگر تمام قوم میں سے وہ شان و شوکت یک لخت جاتی رہی اور اس وقت تک ان کا یہی حال ہے۔

(و رفعنا)

یہ مضمون دو مقام میں آیا ہے ایک تو اسی آیت میں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو اونچا کیا اور سورۃ اعراف میں یہ لفظ ہیں

واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة وظنوا انه

واقع بہم ان دونوں مقاموں میں چار لفظ ہیں جن کے معنی حل ہونے سے مطلب

سمجھ میں آوے گا۔رفع،فوق،نتق،ظلہ۔

''رفع'' کے معنی اونچا کرنے کے ہیں مگراس لفظ سے یہ بات کہ جو چیز اونچی کی گئی ہے وہ زمین سے بھی معلق ہوگئی ہولازم نہیں آتی ۔ دیوار اونچا کرنے کو بھی 'رفعنا' کہہ سکتے ہیں حالاں کہ وہ زمین سے معلق نہیں ہوتی۔

''فوق'' کے لفظ کو بھی اس شے کا زمین سے معلق ہونالازم نہیں ہے۔

''شق'' کا لفظ البتہ بحث طلب ہے جس کے معنی مفسرین نے مذہبی عجائبات بنانے کو 'قلع' کے بھی لیے ہیں۔جس کو زمین سے یا جگہ سے علیحدہ کرنالازم ہے 'رفع' کے بھی لیے ہیں جس کو علیحدہ کرلینالازم نہیں ہے بیضاوی میں لکھا ہے

''واذا نتقنا الجبل فوقهم اى قلعناه رفعناه''

مگرقاموس میں اسکے معنی ہادینے کے لکھے ہیں۔

''نتقه زعزعه''

اورزعزع کے معنی ھلا دینے کے ہیں

''لزعزعة تحريک الريح الشجرة و نحوها او کل تحريک شديد

يعنى

'زعزعہ' کے معنی ہوا کا درخت کو ہلا دینے کے ہےں اور ہر جنبش شدید کو بھی زعزعہ کہتے ہیں پس صاف طور سے نقنا، کے معنی ہلا دینے کے ہیں۔یعنی ہم نے پہاڑ کو ہلا دے ااورالفاظ

'' وظنوا انه واقع بهم''

زیادہ تر پہاڑ کے ہلا دینے کے جس سے ان کواس کے گر پڑنے کا گمان ہوامناسب ہیں۔

''ظلہ'' کے معنی سائبان کے بھی ہو سکتے ہیں۔ چھتری کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ جو چیز کہ ہم پر سایہ ڈالے اس کے بھی ہو سکتے ہیں اور اس چیز کا زمین سے معلق ہمارے سر پر ہونا ضرور نہیں ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ

''الظلہ کل ماظلک من سقف بیت او سحابة او جناح حایطة ،

یعنی 'ظلہ' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو سایہ ڈالے، گھر کی چھت یا ابر کا ٹکڑا یا احاطہ کا بازو یعنی دیوار پس ''ظلہ'' کے لفظ سے بھی یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ معلق سر کے اوپر ہو۔

اب غور کرنا چاہیے تھا کہ واقعہ کیا تھا، بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے ہوئے تھے پہاڑ ان کے سر پر نہایت اونچا اٹھا ہوا تھا وہ اس کے سایہ کے تلے تھے اور طور بہ سبب آتش فشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا۔ جس کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ ان کے اوپر گر پڑے گا پس اس حالت کو خدا تعالیٰ نے ان لفظوں میں یاد دلایا ہے کہ

'' ورفعنا فوقکم الطور'' ، '' نتقنا الجبل فوقھم کانہ ظلة وظنوا انہ واقع بھم''

پس ان الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور موافق قانون قدرت نہ ہو ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب وغریب واقعہ بنا دیا ہے اور ہمارے مسلمان مفسر (خدا پر رحمت کرے) عجائبات دور از کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اسکی عمدگی سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے تفسیروں میں لغو اور بے ہودہ عجائبات بھر دی ہیں۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ کوہ سینا کو خدا ان ک سر پر اٹھا لایا تھا کہ مجھ سے اقرار کرو نہیں تو میں اسی پہاڑ کے تلے کچل دیتا ہوں۔ اور بعضوں نے کہا کہ نہیں بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اکھاڑ کر ہوا میں اڑا لایا تھا۔ اور پانچ میل کا چوڑا پانچ میل کا لمبا تھا۔ اتنی

بڑائی اس کی اس لیے تھی کہ کل لشکر بنی اسرائیل کا اس کے تلے ایک ہی دفعہ میں کچل جاوے ۔ یہ تمام خرافاتیں لغو و بیہودہ ہیں اور خدائے پاک کا کلام پاک ایسی بے ہودہ باتوں سے پاک ہے

(کونوا قردۃ)

ہوجاؤ بندر ۔ اس کی تفسیر میں بھی ہمارے علمائے مفسرین نے عجیب وغریب باتیں بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل اور خاصیت میں بھی بندر ہوگئے تھے ۔ بعضوں کا قول ہے کہ وہ سب تیسرے دن مر گئے اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ بندر جواب درختوں پر چڑھتے اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اچھلتے پھرتے ہیں انہی بندروں کی نسل میں سے ہیں ۔

مگر یہ تمام باتین لغو وخرافات ہیں ۔ خدائے پاک کے کلام کا یہ مطلب نہیں ہے ۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا تھا اور اس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا ۔ مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارہ پر رہتا تھا فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا ۔ ان کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا ۔ جب نہ مانا تو ان کو قوم سے مقطع ، برادری سے خارج ، کھانے پینے سے الگ ، میل جول سے علیحدہ کر دیا اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کیا کرتے تھے اور اسی لیے ان کی حالت بندروں کی سی حالت ہوگئی تھی ۔ جس کی نسبت خدا نے فرمایا کہ

''کونوا قردۃ خاسئین''

یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ہیں ، جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل وخوار ہیں اسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل وخوار ورسوا ہو ۔ جس کے سبب اس زمانے کے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ آنے والے انکی ذلت ورسوائی کا حال

سن کر عبرت پکڑیں۔

یہ کہنا کہ وہ لوگ سچ مچ کے بندر ہو گئے تھے بجز اہل الجنۃ کے اور کوئی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سبب سے بعض مفسرین نے بھی ان کے سچ مچ کے بندر ہو جانے سے انکار کیا ہے۔ جس کو ہم بطور تائیدا پنے کلام کے اس مقام پر نقلل کرتے ہیں۔ بیضاوی میں لکھا ہے

"وقال مجاهد مامسخت صورتهم ولكن قلوبهن فمثلوا بالقرة كما مثلوا بالحمار فی قوله كمثل الحمار يحمل اسفارا"

یعنی مجاہد کا قول ہے کہ ان کی صورتیں بندر کی سی ہو گئی تھیں بلکہ ان کے دل بندروں کے سے ہو گئے اور اسی لے بندروں کے ساتھ ان کو تشبیہ دی ہے جیسے کہ خدا نے گدھے کے ساتھ اپنے اس قول میں ان کی مثال گدے کی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں تشبیہہ دی تھی۔

(تذبحوا بقره)

یہ قصہ توریت میں بھی ہے مگر اس میں بنی اسرائیل کا موسیٰ سے اس کا اتا پتا پوچھنا مذکور نہیں ہے اور اس کے ذبح کے بعد جو قصہ توریت میں ہے وہ قرآن مجید میں نہیں ہے ، بہر حال اتنی بات کہ خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا قرآن اور توریت دونوں ا میں موجود ہے۔

بقره ، بالتحريک ومع التا

گائے اور بیل دونوں پر بولا جاتا ہے اور قرآن مجید یہ الفاظ کہہ

" لا ذلول تثير الارض ولا تسقى الحبرث "

صاف اس کے بیل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ قرآن کے تمام الفاظ سے اور ان پتوں اور نشانوں سے جو بتائے گئے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ وہ بیل بت پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر بطور سانڈ کے چھوڑا ہوا تھا۔ تفسیر کبیر میں بھی مسلمہ کی تفسیر

''ای وحشیة مرسلة من الجس''

لکھی ہے جو ٹھیک چھوڑے ہوئے سانڈھ کی ہے اور اسی کے ذبح کرڈالنے کا موسیٰ نے حکم دیا تھا اور بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ ذبح ہونے سے بچ جاوے اسی لئے اس کے اتے پتے پوچھتے تھے۔ پس اس قصہ میں کوئی عجوبہ بات نہیں ہے۔ جس بچھڑے کو بنی اسرائیل نے پوجا تھا اس کا معدوم کرنا اور جس بیل کو بطور سانڈ کے چھوڑا تھا کہ وہ بھی ایک قسم کی پرستش ہے اس کو ذبح کرڈالنا اس شرک وکفر کے مٹانے کے لیے تھا۔ ہمارے مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ہے یہ سمجھا ہے کہ یہ قصہ اگلی آیت

''واذ قتلتم نفسا

سے متعلق ہے اور پہلی آیت کو خدا نے پیچھے کردیا ہے۔

(واز قتلتم)

اس قصہ کو پہلے قصہ س کچھ تعلق نہیں ہے۔ بیل کے زبح کرنے کا قصہ ختم ہو چکا یہ دوسرا قصہ ہے کہ بنی اسرائیل

ا۔ دیکھو کتاب اعداد ۱۹۔

میں ایک شخص مارا گیا اور قاتل معلوم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ سب جو موجود ہیں اور انہیں میں قاتل بھی ہے۔ مقتول کے اعضا سے مقتول کو ماریں جو لوگ درحقیقت قاتل نہیں ہیں وہ بہ سبب یقین اپنی بے جرمی کے ایسا کرنے میں کچھ خوف نہ کریں گے۔ مگر اصلی قاتل بہ سبب خوف اپنے جرم کے جو از روئے فطرت انسان کے دل میں اور بالتخصیص جہالت کے زمانے میں اس قسم کی باتوں سے ہوتا ہے۔ ایسا نہ کرنے کا اور اسی وقت معلوم ہو جاوے گا اور وہی نشانیاں جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھی ہیں لوگوں کو دکھا دے گا۔ اس قسم کے حیلوں سے اس زمانہ میں بھی بہت سے چور معلوم

ہو جاتے ہیں اور وہ بسبب خوف اپنے جرم کے ایسا کام جو دوسرے لوگ بلا خوف بہ تقویت اپنی بے جرمی کے کرتے ہیں نہیں کر سکتے۔ پس یہ ایک تدبیر قاتل کے معلوم کرنے کی تھی اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

ہمارے مفسرین نے ان آیتوں کی یہ تفسیر کی ہے کہ پہلا اور پچھلا ایک ہی قصہ ہے اور پچھلی آیتوں میں جو بیان ہوا ہے وہ باعتبار وقوع کے مقدم ہے اور قصہ یوں قرار دیا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک شخص قتل کیا تھا۔ اس کا قاتل معلوم کرنے کو خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا اور یہ کہا کہ اس مذبوح بیل کے اعضاء سے مقتول کو مار وان کے مارنے سے مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کو بتلا دیا۔

مگر اس تفسیر میں متعدد نقصان ہیں۔ اول تو پچھلی آیتوں کا مقدم قرار دینے اور دونوں قصوں کو ایک کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دوسرے

"کذا لک یحیی اللہ لموتی"

کے معنی جب مربوط ہوتے ہیں جب اس کے پہلے یہ جملہ

" فاحیاء اللہ مقدر"

مانا جاوے اور ایسے جملہ کو جو خارج از عقل اور خلاف عادت باری تعالیٰ ہے اپنی طرف سے بغیر موجود ہونے کسی یقین یا اشارہ صریح کے مقتدر ماننا عبادت قرآن میں اضافہ کرنا ہے۔ تیسرے یہ کہ باوجود اس اضافے کے یہ ماننا پڑے گا کہ

'کذالک یحیی اللہ الموتی'

سے مراد احیاء اموات بروز بعث ونشر ہے اور اس جگہ بعث ونشر کے حال کے بیان کرنے کا کوئی محل وموقع نہیں ہے اور نہ کوئی مباحثہ بعث ونشر کی بابت ہے۔

جو سیدھے سادے صاف صاف معنی آیتوں کے ہم نے بیان کیے ہیں اور جن میں

نہ آیتوں کی ترتیب الٹی پڑتی ہے اور نہ کسی جملہ خلاف از عقل و بغیر سند نقل کے اپنی طرف سے بڑھانے کی حاجت ہوتی ہے اور جو صاف طور پر قرآن مجید سے پایا جاتا ہے۔ شاید اس کی نسبت بھی بعض لوگ کچھ شبہ کریں گے۔ اول تو یہ کہیں گے

'اضربو'

میں ضمیر مذکر کی ہے اور

'بعضہا'

میں ضمیر مونث کی، اور دونوں کا مرجع ہم نے مقتول ٹھہرایا ہے۔ مگر یہ اعتراض کسی طرح صحیح نہیں ہونے کا۔ اس آیت سے پہلے

"واذفتلقم نفسا "

واقع ہے اور

"بعضہا

کی ضمیر نفس کی جانب راجع ہے اور نفس مونث ہے اور اس کے لیے مونث ہی کی ضمیر ہونی چاہیے۔

"اضربوہ"

کی ضمیر کو بھی تمام مفسرین نے نفس ہی کی طرف راجع کیا ہے۔ مگر باعتبار شخص مقتول کے اس کا مذکر لانا جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبرے میں لکھا ہے۔

" الھا فی قولہ تعالیٰ فاضربوہ ضمیر وھوامان ان یرجع الی النفس وحینئذ یکونل التذکیر علی تاویل الشخص والانسان واما الی القتیل وھو الذی دل علیہ قولہ وما کنتم تکتمون".

دوسرا یہ شبہ کریں گے کہ

"یحیی"

اور

"موتی"

کے لفظ کے ہم نے وہ معنی نہیں لیے جو صریح ان لفظوں سے پائے جاتے ہیں۔مگر یہ اعتراض بھی صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ ہم نے ان لفظوں کے وہی معنی لیے ہیں جن معنوں میں خود خدا نے ان لفظوں کو استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے۔

"وکنتم امواتافاحیاکم"

یعنی تم مردہ یعنی معدوم یا غیر موجود یا نامعلوم تھے۔پھر ہم نے تم کو زندہ یعنی مخلوق یا موجود یا ظاہر کیا پس اسی دلیل سے ہم نے یہاں سے

"یحیی" "موتی"

کے یہی معنی لیے ہیں کہ نامعلوم قاتل معلوم ہوگیا اوران کے معنوں کے صحیح ہونے پر خود اسی مقام میں خدا تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے۔اوپر کی آیت میں لفظ واللہ مخرج آیا ہے اسی کے مقابل اس آیت میں یحی اللہ کا لفظ آیا ہے۔اوپر کی آیت میں

تکتمون

کا لفظ آیا ہے۔اسی کے مقابل اس آیت میں موتی کا لفظ آیا ہے پس علانیہ ثابت ہے کہ یحیی اللہ سے ظاہر ہونا قاتل کا اور موتی سے نامعلوم یا غیر ظاہر ہونا قاتل کا مراد ہے نہ مقتول کا زندہ ہونا۔خدا اپنی قدرت اوراپنی حکمت کو انہی باتوں میں جو انسان روزمرہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ظاہر کرتا ہے۔مگر انسان کا خیال اس پر قناعت نہیں کرتا اور دوراز کار باتوں کو پسند کرتا ہے۔

تیسرا شبہ یہ کریں گے کہ

”کذالک یحیی اللہ الموتی“

کے قبل ہم کو یہ جملہ کہ

” فاظھر اللہ “

مقدر ماننا پڑے گا۔مگر یہ جملہ نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف قرآن اور نہ خلاف سیاق کلام خدا، کیوں کہ خود خدا نے فرمایا ہے

’واللہ مخرج‘

برخلاف اس پہلے جملہ کے نہ وہ زمین کا ہے نہ آسمان کا

....

ہاروت ماروت کی اصلیت

ہارون ماروت دونوں تاریخی شخص ہیں یعنی ان کا وجود تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں شخص شام کے رہنے والے تھے۔قرآن مجید میں ان کو کوئی قصہ بجز اس کے جو یہاں ہے بیان نہیں ہوا ہے۔تمام قصے جو مفسرین نے ان کی نسبت اپنی تفسیروں میں بھر لیے ہیں ان کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے۔جتنی روائتیں ان کی نسبت مذکور ہیں وہ سب مصنوعی اور جھوٹی ہیں۔مسٹر ہائیڈ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مجوسیوں کے ہاں ان کی نسبت بہت سے قصے لغو مشہور تھے۔ ہمارے مفسریں کی یہ عادت ہے کہ کسی کے ہاں کا قصہ ہو جب وہ اپنی تفسیروں میں اس کو داخل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ایک ایسی مصنوعی روایت داخل کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ مسلمانی روایت ہے۔مگر اس جھوٹ کا جو الزام ہے وہ مفسروں یا راویوں پر ہے قرآن شریف اس سے بری ہے۔

یہ دونوں فرشتے نہیں تھے بلکہ آدمی تھے۔ ہمارے ہاں کے بعض مفسروں نے بھی ان کو آدمی قرار دیا ہے چنانچہ حسن نے ملکین کے لفظ کو لام کے زیر سے پڑھا ہے جس کے معنی دو بادشاہوں کے ہیں اور ضحاک سے اور ابن عباس سے بھی لام کی زیر سے پڑھنا روایت کیا گیا ہے۔ پھر ان میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ کون تھے حسن کا قول ہے کہ وہ دونوں بابل میں عجم کے کافروں میں تھے بغیر ختنہ کیے ہوئے۔کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں بادشاہوں میں سے صالح آدمی تھے۔

ہم ملکین کے لفظ کو مطابق قرات مشہور لام کے زیر سے پڑھتے ہیں مگر فرشتے مراد

نہیں لیتے۔ بلکہ آدمی مراد لیتے ہیں جس کو لوگ نہایت نیک سمجھتے ہیں۔اس پر فرشتہ کا اطلاق کرتے ہیں۔قرآن مجید سے بھی کافروں میں اس محاورہ کا ہونا پایا جاتا ہے۔جس طرح کہ زلیخا کی سہیلیوں نے حضرت یوسف کو دیکھ کر کہا تھا کہ

" ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم"

اور مجوسیوں میں بھی ایسا استعمال تھا اور ہائڈ صاحب کی کتاب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجوسی ہاروت ماروت کو فرشتہ کہتے تھے۔پس اس آیت جس طرح کہ لوگوں کے اس گمان کو کہ، جو علم ان کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اتارا گیا تھا بیان کیا گیا ہے،اسی طرح پر جس خیال سے کہ وہ ان کو فرشتہ کہتے تھے ملکین کا لفظ لام کے زیر سے لایا گیا ہے۔یعنی ان لوگوں نے اس چیز کی پیروی کی جس کی نسبت وہ کہتے تھے کہ بابل میں ہاروت اور ماروت پر جن کو وہ فرشتہ کہتے تھے خدا کی طرف سے اتاری گئی ہے۔پس خدا نے یہ نہ فرمایا ہے کہ جو علم ان کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے اتارا ہوا تھا اور نہ یہ فرمایا ہے کہ وہ دونوں فرشتے تھے بلکہ جو زعم ان دونوں کی نسبت کافروں یا یہودیوں کا تھا وہ بیان کیا ہے۔

اب ایک اور شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جادو سیکھنے والوں کو منع کیوں کرتے تھے کہ تم مت سیکھو اور کافر مت بنو۔یعنی برا کام کرنے والے مت بنو۔ یہ بات کچھ تعجب کی نہیں ہے ۔جادو سے اپنے خیال میں نقصان پہچانا۔خواہ فی الحقیقت اس سے نقصان پہنچتا ہو یا نہیں۔ ہر کوئی یہاں تک کہ جادوگر بھی برا جانتا ہے اور اسی وجہ سے وہ سیکھنے والے کو منع کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو کوئی برا کام جانتے ہیں مگر جب کوئی ان سے سیکھنا چاہتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خراب کام ہے کیوں سیکھتے ہو لیکن جب سیکھنے والا اصرار کرتا ہے تو سکھا دیتے ہیں۔پس ہاروت اور ماروت کا سیکھنے والوں کو ایسا کہنا ایک عام مجراء طبعی کے موافق تھا۔

اسی آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ سحر باطل ہے یعنی سحر کچھ موثر نہیں ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی کو یہ سبب اپنے سحر کے کچھ نقصان پہنچانے والے نہ تھے اور یہ کہنا نص صریح اس بات پر ہے کہ سحر کچھ اثر نہیں رکھتا اور یہی معنی سحر کے باطل ہونے کے ہیں۔ آگے جو خدا نے فرمایا ہے کہ

"الا باذن الله"

اس کے یہ معنی سمجھنا کہ ان کا سحر خدا کے حکم سے اثر کرتا تھا محض غلطی اور ناسمجھی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عامل یا جادوگر کسی کام کے لیے عمل یا جادو پڑھتا ہے اور وہ کام اتفاقیہ اس کی خواہش کے مطابق ہو جاتا ہے اور شبہ پڑتا ہے کہ عمل یا جادو کے اثر سے ہوا ہے اس شبہ کے مٹانے کو خدا نے فرمایا ہے

"الا باذن الله"

یعنی ایسی حالت میں جو کام ہو جاتا ہے وہ خدا کے سے ہو جاتا ہے۔ کچھ جادو یا عمل کے سبب سے نہیں ہوتا۔

....

حضرت نحمیا کا قصہ

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

او کالذی مر علیٰ قریة وھی خاویة علی عروشھا قال انی یحیی ھذه الله بعد موتھا فاماته الله مائة عام ثم بعثه ، قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم قال بل لبثت مائة عام فانظر الی طعامک وشرابک لم یتسنه وانظر الی حمارک ولنجعلک آیة للناس وانظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما فلما تبین له قال اعلم ان الله علی کل شئی قدیر.

یا (تو نے نے اس شخص کو نہیں دیکھا یعنی اسکا حال نہیں جانا جس نے رویا میں دیکھا) کہ گویا وہ گذرا ایک شہر پر ایسی حالت میں کہ وہ سر کے بل گرا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ کیوں کر زندہ کرے گا (یعنی آباد کرے گا) اللہ اس کو اس کے مر جانے کے (یعنی ویران ہونے کے) بعد پھر اللہ نے اس کو سو برس تک مرا ہوا رکھا پھر اس کو اٹھایا خدا نے کہا کہ کتنی دیر تک تو پڑا رہا اس نے کہا کہ میں پڑا رہا ایک یا کچھ کم ایک دن کہا بلکہ تو پڑا رہا سو برس پھر دیکھ اپنے کھانے کو اور اپنے پینے کو (کیا) وہ نہیں بگڑا ہے اور دیکھ اپنے گدھے کو (کیا وہ نہیں گل گیا ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ تجھ کو ایک نشانی آدمیوں کے لیے بناؤں اور دیکھ ہڈیوں کو کس طرح ہم ان کو حرکت میں لاتے ہیں۔ پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں پھر جب اس کو یہ بات ظاہر ہوئی اس نے کہا (حالت بیداری میں) میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قبل اس کے کہ اس کی تفسیر بیان کی جاوے لفظ ''کالذی'' میں جو حرف کاف ہے اس پر جو بحث ہے وہ بیان کرنی چاہیے۔ علمائے نحو میں سے کسائی اور فراء اور ابو علی فارسی کا یہ قول ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جہاں فرمایا ہے کہ

''الم تر الی الذی حاج ابراھیم''

وہاں بھی ''الذی'' آیا ہے اس کا عطف پہلی آیتوں کے معنوں پر ہے نہ لفظ پر۔ یہ بحث تو صرف سیاق عبارت سے اور ایک نحوی قاعدہ سے متعلق ہے۔ اس بحث سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا کہ ''الذی'' پر کاف تشبیہ لانے سے جو یہ معنی ہو گئے ہیں کہ اس شخص کی مانند، تو مانند کے کہنے سے کیا مطلب ہے۔ اخفش نے اس بحث کو نہایت مختصر کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہاں کاف زائد ہے۔ مگر کاف زائد کے لانے کی اور اس کے زائد ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ صاف بات تھی کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ ''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا'' اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو ایک قریہ میں گذرا'' پھر دوسری جگہ کاف زائد لانے کی اور مانند اس شخص کے جو ایک قریہ میں گزرا کہنے کی کیا حاجت تھی۔ میرو نحوی دوسری آیت میں چند لفظ محذوف مانتا ہے اور اس کا قول ہے کہ تقدیر آیت کی یوں ہے

''والم ترالی من کان الذی مر علیٰ قریة''

یعنی تو نے کیا نہیں دیکھا اس شخص کو جو تھا مثل اس شخص کے جو ایک قریہ پر گذرا۔ مگر اس سے بھی آیت کا مطلب نہیں کھلتا اور یہی سوال باقی رہتا ہے کہ مثل اس شخص سے کیا مطلب ہے۔

صاحب بیضاوی نے غالباً ان مشکلات کو خیال کیا ہے اور ایک قول بیان کرنے سے اپنی دانست میں اس مشکل کو حل کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"او کالذی مر علی قریة"

حضرت ابراہیم کا قول ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے۔ یعنی جب نمرود نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ "میں زندہ کرتا ہوں" تو حضرت ابراہیم نے کہا کہ اگر تو زندہ کرتا ہے تو اس طرح زندہ کو جس طرح کہ خدا نے اس شخص کو زندہ کیا تھا جو ایک قریہ پر گذرا تھا۔ اس تفسیر کے مطابق تقدیر آیت کی یہ ہوتی ہے کہ

"ان کنت تحیی فاحی کاحیاء الله الذی مر علی قریة"

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لفظ کاف سے اس شخص کی مانند مراد نہیں بلکہ جس طرح وہ زندہ ہوا تھا اس طرح زندہ کرنے کی مانند مراد ہے اور پھر قاضی بیضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو زندہ ہوا تھا یا تو عزیز تھے یا خضر تھے یا کوئی کافر منکر بعث تھا۔ عزیز تو نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ کے بہت بعد ہوئے ہیں اور یہ معلو نہیں کہ قاضی صاحب نے خضر سے مراد کسی سے لی ہے اور یہ واقعہ خضر پر کب گذرا تھا اور نہ یہ معلوم کہ وہ کافر منکر بعث کون تھا۔

رجما بالغیب

جو کچھ جی میں آیا یا سنا لکھ دیا۔ راوی کی روایت (گو وہ کیسی ہو صریح البطلان ہو) تفسیروں میں قصوں کے لکھ دینے کو کافی ہے۔ پس یہ قول حضرت ابراہیم کا کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

اگر قرآن مجید کا ٹھیک ٹھیک ادب کیا جاوے اور اس کو دیو پری کا قصہ نہ قرار دیا جاوے جیسے کہ عجائب پسند مسلمان قرار دیتے ہیں تو آیت کے معنی نہایت صاف ہیں۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ کاف حرف تشبیہہ کا ہے اور کان بھی اسی کاف تشبیہہ سے بنا ہے اور کاف تشبیہہ کو بہ سبب کسی ضرورت کے مثلاً بغرض اہتمام تشبیہہ یا تبدیل سیاق کلام یا کسی اور

ضرورت کے مشبہ بہ سے جدا کر کے مقدم کر دینا جائز ہے۔ مثلا

"زید کا لاسد"

سے جب کاف تشبیہہ کو کسی سبب سے جدا کر کے مقدم کریں تو یوں کہیں گے

"کان زیدالاسد"

اس مقام پر بھی

'الذی'

مشتبہ نہیں ہے بلکہ اس سے اس شخص کے مرور کی تشبیہ یا تمثیل مدرا ہے پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ

"الم تر الی الذی کانه مرعلی قرية"

یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے اس شخص کو جو گویا کہ گذرا تھا ایک قریہ پر، درحقیقت وہ شخص گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے اور جو تقدیر آیت کی ہم نے بیان کی ہے اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس شخص کا حال بیان کیا جاتا ہے جو یہ سمجھا تھا کہ گویا میں ایک قریہ میں گیا ہوں اور اس طرح کا بیان صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ رویا کا واقعہ ہے مگر نحوی قاعدہ کے مطابق

"کان"

کا لفظ

'الذی' موصول کے صلہ میں واقعہ نہیں ہو سکتا۔ اس ضرورت سے حرف تشبیہہ یعنی لفظ کان کو مقدم لانا پڑتا تھا اور وہ مقدم نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ اسکے اسم و خبر صلہ کے جزو تھے۔ اس لیے حرف کاف جو اصل لفظ تشبیہہ کا تھا وہ اس کی جگہ مقدم کیا گیا۔

قرآن مجید میں اس شخص کا جس کا رویا یہاں بیان ہوا ہے ذکر نہیں ہے اور نہ قریہ کا ذکر ہے جسمیں اس شخص نے رویا میں دیکھا تھا۔ غالبا اس قریہ کے تعین کی ضرورت بھی

نہیں کیوں کہ اس شخص نے رویا میں دیکھا ہوگا کہ میں ایک قریہ میں گزرا ہوں جو ویران پڑا ہے۔ البتہ اس شخص کی جس نے یہ رویا دیکھا اس کی تعین کرنی چاہیے۔ غالباً آں حضرت کے زمانے میں اس شخص کے نام کو ہر کوئی جانتا ہوگا۔ مگر اب ہمارے پاس اس شخص کا نام متعین کرنیکو بجز روایات اور تاریخی واقعات کے اور کچھ نہیں ہے۔ تاریخی واقعات سے جہاں تک کہ تحقیق ہو سکتے ہیں اور جن پر اعتماد ہو سکتا ہے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص نحمیا نبی تھے۔

توریت میں جو واقعات بیت المقدس کی ویرانی کے لکھے ہیں اور جو زمانہ اس کا قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر نے ۵۹۰ قبل مسیح میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور ۵۸۸ قبل مسیح بیت المقدس کو فتح کرلیا اور معبد کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا مگر کیخسرو بادشاہ ایران نے غلبہ پا کر یہودیوں کو قید بابل سے آزاد کیا اور ۵۴۶ قبل مسیح کے انہوں نے بیت المقدس میں واپس آ کر قربانیاں کیں اس کے بعد کسی بادشاہ نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت کی اور کسی نے پھر منع کر دیا ۵۱۸ قبل مسیح میں دارا نے بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دے دی مگر ہامان کی دشمنی سے حرج پڑتا رہا۔

۴۶۷ ء قبل مسیح کے عزیز پیغمبر بیت المقدس میں گئے اور یہودیوں کی بھلائی کا زمانہ شروع ہوا مگر بیت المقدس اس طرح جال ہوا اور ڈھیا ہو پڑا تھا حضر نحمیا نبی کو اسکا نہایت رنج تھا انہوں نے خدا سے بہت التجا اور دعا کی کہ وہ کسی طرح پھر تعمیر ہو۔ ایک دفعہ ارتحشتائی بادشاہ کے حضور میں حاضر تھے بادشاہ نے پوچھا کہ تم کیوں رنجیدہ ہو، انہوں نے کہا کہ میں کیوں رنجیدہ نہ ہوں کہ وہ شہر جس میں ہمارے بزرگوں کے مزار ہیں، ویران پڑا ہے اور اس کے دروازے اگ سے جلے پڑے ہیں بادشاہ نے پوچھا کہ پھر تو کیا چاہتا ہے حضرت نحمیا نے کہا کہ مجھ کو وہاں جانے دیں تا کہ میں اس کو پھر تعمیر کروں، بادشاہ نے اجازت دی اور ایک میعاد مقرر کی کہ اس عرصہ میں تعمیر کر کے واپس آ جانا۔

جب نحمیا بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف تھے تو ان لوگ پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ کیا وہ بیت المقدس کو بنالیں گے اور اسکے پتھروں کو جو جلے ہوئے اور خاک کے ڈھیروں کے تلے جمع ہیں نکال لیں گے کتاب نحمیا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نحمیا کو بیت المقدس کی تعمیر کی بڑی فکر تھی اور خدا کے سامنے ہمیشہ التجا اور دعا کیا کرتے تھے، بلا شبہ ان کے دل میں یہ بات گزری ہوگی کہ اس شہر کے مرجانے یعنی ویران ہو جانے کے بعد کس طرح اللہ تعالیٰ اسکو زندہ یعنی آباد کرے گا انہیں تر ددات اور خدا سے التجا کرنے کے زمانے میں جیسا کہ مقتضائے فطرت انسانی ہے حضرت نحمیا نے رویا میں دیکھا اور انکو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس آباد اور تعمیر ہو جائے گا اسی رویا کا ذکر اس آیت میں ہے اور وہ رویا یہ ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ میں ایک قریہ میں گیا ہوں جو بالکل ڈھے گیا ہوا اور ویران پڑا ہے رویا ہی میں انہوں نے کہا کہ اس قریہ کے اس طرح مرجانے یعنی ویران ہو جانے کے بعد کس طرح خدا اس کو زندہ کرے گا یعنی آباد کرے گا۔ اسی حالت میں انہوں نے دیکھا کہ میں مر گیا ہوں اور پھر جی اٹھا ہوں رویا میں ان سے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم پڑے رہے انہوں نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم اس نے کہا کہ تم سو برس تک پڑے رہے اپنے کھانے اور اپنے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں اور اپنے گدھے کو دیکھ کہ اس کا کیا حال ہو گیا ہے اور دیکھ کہ پھر اصلی ہڈیاں کس طرح ہلتی ہیں اور کس طرح ان کے اوپر گوشت چڑھتا ہے اس عجیب رویا سے ان کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس ضرور تعمیر ہو جاوے گا۔ پس یہی قصہ ہے جو خدا کی قدرت اور حکمت اور عظمت کو جتاتا ہے اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہمارے مفسروں کی عادت ہے کہ سیدھی بات کو بھی ایک عجوبہ بات بنا کر بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی نا تحقیق اور قصے کہانیاں اس میں شامل کر دیتے ہیں اسی طرح اس میں بھی کیا ہے بایں ہمہ جب ان تمام باتوں پر غور کیا جاتا ہے تو جو اصل بات ہے وہ بھی اس

میں سے نکل سکتی ہے چناں چہ اس مقام پر ابھی جو روایت ابن عباس کے نام سے تفسیر کبیر میں بیان کی ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ یہ تمام واقعہ جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک رویا تھا۔ اس روایت میں بجائے حضرت نحمیا کے حضرت عزیز کا نام لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے حضرت عزیز ہی ہوں مگر تاریخ سے مطابقت کرنے سے حضرت نحمیا کا ہونا زیادہ تر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اسی روایت میں لکھا ہے کہ جب وہ بیت المقدس میں پہونچے تو وہاں انگور اور انجر پھل رہے تھے۔ انہوں نے انجیر اور انگور کھائے اور انگوروں کو نچوڑ کر شیرہ پیا اور سو رہے اور سونے ہی کی حالت میں خدا تعالیٰ نے ان کو مردہ کر دیا اور سو برس تک مردہ پڑے رہے ان لفظوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے متقدمین کی بھی یہ رائے تھی کہ یہ واقعہ حالت نوم میں گزرا تھا جس کو ہم نے سیدھی طرح رویا سے تعبیر کیا ہے باقی حصہ جو اس روایت میں لکھا ہے محض بے اصل ہے جس کے لیے کوئی سند نہیں ہے۔

قرآن مجید کا سیاق کلام اس طرح پر واقع ہوا ہے کہ جو قصے اس میں بیان کئے گئے ہیں ان کا مقصد بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف کے خواب کا جہاں ذکر ہے وہاں بھی اسی طرح بیان ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور چاند و سورج کو اپنے تئیں سجدہ کرتے دیکھا اور یوں نہیں بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ چاند اور سورج مجھ کو سجدہ کرتے ہیں۔ کیوں کہ خواب میں دیکھنا قرینہ مقام علانیہ روشن تھا۔ اسی طرح اس مقام پر بھی حضرت نحمیا کے خواب کا مقصد بیان کیا گیا ہے اور

''فلما تبین''

کے لفظ سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ تمام واقعات جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں رویا میں واقع ہوئے تھے

حضرت عزیر

ان کے ابن اللہ ہونے پر بحث

قرآن مجید میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے

او قالت الیھود عزیز ن ابن اللہ ،

یعنی یہودیوں کا قول ہے کہ ''عزیز خدا کا بیٹا ہے'' ہمارے علمائے مفسرین اس آیت کی تفسیر میں یہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے توریت مقدس کو ضائع کر دیا تھا یعنی بخت نصر نے جب بیت المقدس کو ویران کیا ہے اور جلایا ہے، اس وقت ضائع ہوگئی تھی مگر حضرت عزیر کے دعا مانگنے پر اللہ تعالٰی نے توریت ان کو یاد کروادی اور انہوں نے اس کو لکھ دیا۔ اس وقت یہودیوں نے کہا کہ یہ بات جو عزیر کو حاصل ہوئی تو بے شک وہ ابن اللہ ہے۔

اس کے بعد علمائے مفسرین نے یہ بحث کی ہے کہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کس نے کہا (۱) عبید ابن عمیر کا یہ قول ہے کہ صرف ایک یہودی نے یہ بات کہی تھی جس کا نام فخاص بن عازورا تھا اور (۲) سعید بن جبیر اور عکرمہ کا یہ قول ہے کہ ایک جماعت یہودیوں کی تھی جنہوں نے یہ کہا تھا (۳) بعض کا یہ قول ہے کہ یہ مذہب یہودیوں میں رائج تھا مگر پھر انہوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ (۴) تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ جو یہود مدینہ میں رہتے تھے ان میں سے چند آدمیوں کا یہ مذہب تھا کل یہودیوں کا یہ مذہب نہیں تھا۔

یہ سب اقوال ہمارے علمائے مفسرین کے ہیں مگر یہودی اس سے انکار کرتے ہیں

اور کہتے ہیں کہ یہودی عزیر کو بھی ابن اللہ نہیں کہتے تھے۔

علمائے مفسرین نے جو کچھ اس کی نسبت بیان کیا مورخانہ طریقہ پر اسکا ماخذ تلاش نہیں کیا اور نہ یہودی مذہب کی کسی کتاب کا حوالہ دیا۔ پس ہم کو علمائے مفسرین کے اقوال کا ماخذ تلاش کرنا ہے اور وہ صرف دو قول ہیں۔

اول یہ کہ بعد ضائع ہو جانے توریت کے حضرت عزیر پیغمبر نے از سر نو توریت کو لکھا۔

دوم یہ کہ یہودیوں کے کسی فرقہ نے حضرت عزیر کو ابن اللہ کہا۔

پہلے قول کی سند ہم یہودی کتابوں سے بیان کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ تین کتابیں ہیں جو حضرت عزیر کیطرف منسوب ہیں۔ ایک کتاب موسوم یہ کتاب ''عزرا'' ہے جو موجودہ عہد عتیق کی کتابوں میں شامل ہے اور سب لوگ اس کو صحیح اور معتبر مانتے ہیں۔ علاوہ اس کے دو کتابیں اور ہیں جو کتاب اول ''عیز ڈراس'' اور کتاب دوم ''عیز ڈراس'' کے نام سے موسوم ہیں۔ عزرا کا نام یونانی زمیں میں ''عیز ڈراس'' کہا جاتا ہے اور جو کہ ان دونوں کتابوں کی نسبت خیال کیا گیا ہے کہ یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں اس لیے ان دونوں کتابوں کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ان کتابوں میں سے دوسری کتاب کے چودھویں باب میں یہ ورہیں: ''دیکھ اے خدا میں جاؤں گا جیسا کہ تو نے مجھ کو حکم دیا ہے اور جو لوگ موجود ہیں میں ان کو فہمائش کروں گا لیکن جو لوگ کہ بعد کو پیدا ہوں گے انکو کون فہمایش کرے گا۔ اس طرح دنیا تاریکی میں ہے اور جو لوگ اس میں رہتے ہیں بغیر روشنی کے ہیں۔'' (ورس ۲۰)

''کیوں کہ تیرا قانون جل گیا ہے پس کوئی نہیں جانتا ان چیزوں کو جو تو کرتا ہے اور ان کاموں کو جو شروع ہونے والے ہیں۔'' (ورس ۲۱)

''لیکن اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو روح القدس کو مجھ میں بھیج اور میں لکھوں گا تمام جو کچھ کہ دنیا میں ابتدا سے ہوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا تھا تاکہ لوگ تیری راہ کو پاویں اور وہ لوگ جو اخیر زمانہ میں ہوں گے زندہ رہیں۔'' (ورس ۲۲)

''اور اس نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ جا اپنے رستہ سے لوگوں کو اکٹھا جمع کر اور ان سے کہہ کہ وہ چالیس دن تک تجھ کو نہ ڈھونڈیں۔'' (ورس ۲۳)

''لیکن دیکھ تو بہت سے صندوق کے تختے تیار کر اور اپنے ساتھ ''ساریا'' و ''دبریا'' ''سلیما''۔ ''اکینیسبن'' اور ''ایشیل'' کو لے۔ ان پانچوں کو جو بہت تیزی سے لکھنے کو تیار ہیں۔'' (ورس ۲۴)

''اور یہاں آ اور میں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن کروں گا جو کہ نہ بجھے گی تاوقتیکہ وہ چیزیں پوری نہ ہوں جو تو لکھنی شرور کرے گا۔'' (ورس ۲۵)

''اور جب کہ تو پورا کر چکے گا تو بعض چیزوں کو تو مشتہر کرے گا اور بعض چیزوں کو تو خفیہ عقل مندوں کو دکھاوے گا کل اسی وقت تو لکھنا شروع کرے گا''۔ (ورس ۲۶)

''پس میں نے ان پانچ آدمیوں کو لیا جیسا کہ اسنے حکم دیا تھا اور میدان میں گئے اور وہاں رہے۔'' (ورس ۳۷)

اور دوسرے دن دیکھو ایک آواز نے مجھ کو پکارا اور کہا اے 'عیز ڈراس'' اپنا منہ کھول اور میں جو کچھ پینے کو دیتا ہوں اس کو پی۔'' (ورس ۳۸)

''تب میں نے اپنا منہ کھولا اور دیکھو اس نے ایک بھرا ہوا پیالہ میرے منہ تک پہنچایا اور جو کہ مثل پانی کے ایک چیز سے بھرا ہوا تھا لیکن اسکا رنگ مثل آگ کے تھا۔'' (ورس ۳۹)

’’اور میں نے اس کو لیا اور پیا اور جب میں پی چکا میرے دل میں سمجھ آئی اور میرے سینہ میں عقل پیدا ہوئی کیوں کہ میری روح نے میرے ذہن کی قوت بخشی۔‘‘ (ورس ۴۰)

’’خدا ان پانچ آدمیوں کو بھی سمجھ دی اور انہوں نے رات کے عجیب خوابوں کو جو بیان کیے گئے لکھا اور جو ان کو معلوم نہ تھے اور وہ چالیس دن تک بیٹھے اور انہوں نے دن میں لکھا اور رات کو روٹی کھائی۔‘‘ (ورس ۴۲)

’’لیکن میں دن کو بولتا تھا اور رات کو اپنی زبان بند نہیں کرتا تھا۔‘‘ (ورس ۴۴)

’’چالیس دن میں انہون نے دوسو چار (یا نوسو چار) کتابیں لکھیں۔‘‘ (ورس ۴۴)

’’اور ایسا ہوا کہ جب چالیس دن پورے ہو گئے تو خدا بولا اور اس نے کہا کہ جو تو نے پہلے لکھا ہے اس کو عام طور سے مشتہر کر۔ تاکہ لائق اور نالائق سب پڑھیں۔‘‘ ورس (۲۵)

لیکن پچھلی ستر جو ہیں ان کو پوشیدہ رکھ تاکہ تو صرف ان کو دے سکے جو تیرے لوگوں میں عقل مند ہوں۔‘‘ (ورس ۴۶)

’’کیوں کہ ان میں سمجھ کا چشمہ ہے اور عقل کا ذخیرہ ہے اور علم کی روشنی ہے۔‘‘ (ورس ۴۷)

’’اور میں نے ایسا ہی کیا۔‘‘ (ورس ۴۸)

کتاب عزرا جو عہد عتیق میں داخل ہے اور جس کو سب معتبر مانتے ہیں اس میں لکھا ہے کہ ایں عزرا از بابل برآمد کہ او در شریعت موسیٰ کہ خداوند کے خدائے اسرائیل دادہ بود کاتب ماہر بود۔‘‘ (باب ۷ ورس ۶)

’’زاں رو کہ عزرا قلب خود را خصوص طلبیدن و بجا آوردن شریعت خداوند و بہ خصوص تعلیم نمودن فرائض واحکام بہ اسرائیل حاضر کرد۔‘‘ (باب ۷، ورس ۱۰)

جارج سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ ’’یہ رائے کہ عزرا

نے نہ صرف کتب خمسہ موسیٰ کو بلکہ عہد عتیق کی اور کتابوں کو بھی خدا کی وحی سے دوبارہ تیار کیا ۔متعدد عیسائی فادرز کی بھی یہی رائے ہے جن کا ذکر ڈاکٹر پریڈیوز نے کیا ہے اور مصنفوں کی بھی یہ رائے ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس رائے کی اصل بنا "عیز ڈراس" کے باب دوسرے کے ایک حصہ پر ہے ، ڈاکٹر پریڈیوز نے بیان کیا ہے کہ اس باب میں عیسائیوں نیعزرا کی طرف بہ نسبت یہودیوں کے بہت زیادہ باتیں منسوب کی ہیں کیونکہ یہودیوں کا یقین ہے کہ عزرا نے صرف موسیٰ کی کتابوں کا ایک صحیح نسخہ تیار کیا تھا اور اس پر بہت محنت کر کے اس کو بہت مکمل کیا تھا۔اس میں بہت کم شبہ ہے کہ یہ خیال ابتداء یہودیوں سے شروع ہوا گو اب ان کی رائے اور ہو" ہمارے نزدیک یہ سندیں جو ہم نے بیان کیں ان سے ہمارے مفسرین کے پہلے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

دوسرے قول کی تصدیق کے لیے ہم "عیز ڈراس" کی اس دوسری کتاب سے استدلال کرتے ہیں ۔اس کے چودھویں باب میں یہ ورس ہیں۔

"اور اب میں (خدا) تجھ سے کہتا ہوں۔" (ورس ۷)

"کہ تو اپنے دل میں وہ نشانیاں جل جمع رکھ جو میں نے دکھائی ہیں اور ان خوابوں کو جو تو نے دیکھے ہیں اور ان تعبیروں کو جو تو نے سنی ہیں۔" (ورس ۸)

"کیونکہ تو سب سے علیحدہ کر دیا جاوے گا اور اب سے تو میرے بیٹے کے ساتھ رہے گا اور ایسے لوگوں کیساتھ جو تیری ہی مانند ہیں یہاں تک کہ زمانہ کا خاتمہ ہو جاوے۔" (ورس ۹)

یہ ترجمہ جو ہم نے لکھا ہے انگریزی زبان کے ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب "عیز ڈراس" موجود نہیں ہے۔ اگر بیٹے کے ساتھ رہنے سے حضرت عیسیٰ مراد ہوں تو یہ ورس محض مہمل و بے معنی ہو جاتا ہے بلکہ سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کلمہ کا اطلاق خود

حضرت عزرا کی طرف ہے کہ اب سے تو میرا بیٹا رہے گا یعنی مقبول و مقرب۔

اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ موجود تھا اور کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ وہی عربی ترجمہ عرب میں اور بالتخصیص مدینہ میں جہاں کثرت سے یہودی رہتے تھے مروج ہوگا اور نہایت قرین قیاس ہے کہ وہ ترجمہ ایسے لفظوں میں ہوگا جس سے لوگ حضرت عزرا کو ابن اللہ تعبیر کرتے ہوں گے جس طرح کہ عیسائی اسی قسم کے لفظوں کے سبب سے حضرت مسیح کو ابن اللہ تعبیر کرتے ہیں۔ پس یہ قول ہمارے علماء کا کہ مدینہ کے یہودیوں کا یہ خیال تھا نہایت صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اب ہم کو ''عیز ڈراس'' کی دوسری کتاب پر جس کے حوالے ہم نے دیے ہیں بحث کرنی باقی ہے۔ یہ کتاب مجموعہ کتب عہد عتیق میں شامل نہیں ہے اور اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جھوٹی یا نامعتبر کتاب ہے گو کہ اس میں بہت سی باتیں عمدہ اور صحیح بھی موجود ہیں۔

اس کتاب کے نامعتبر ہونے کی یہ دلیلیں پیش ہوتی ہیں۔

اول: یہ کہ اس کتاب کا کوئی عبری یا یونانی نسخہ نہیں پایا جاتا صرف لیٹن زبان کے چند نسخے اور ایک عبری زبان کا نسخہ ہے۔ مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ عبری یا یونانی نسخہ کا نہ پایا جانا خصوصا ایسی حالت میں کہ سب لوگ اس کا یونانی میں لکھا جانا خصوصا ایسی حالت میں کہ سب لوگ اس کا یونانی میں لکھا جانا تسلیم کرتے ہیں اس کے نامعتبر ہونے کی کیوں کر دلیل ہوسکتی ہے۔

دوسری دلیل یہ پیش ہوتی ہے کہ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ابتدا ہی میں یہ کتاب یونانی زبان میں لکھی گئی تھی جس کا یہ مفاد ہے کہ حضرت عزرا نے نہیں لکھی کیوں کہ اگر وہ لکھتے تو عبری زبان میں لکھتے مگر اس کا یونانی زبان میں ابتداء لکھا جانا صرف کیا گیا ہے اور اس کا

کچھ ثبوت نہیں ہے۔علاوہ اس کے بالاتفاق تسلیم کیا گیاہے اوراس کا کچھ ثبوت نہیں ہے۔ علاوہ اس کے بالاتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ حضرت متی کی انجیل دراصل عبری زبان میں لکھی گئی تھی جواب دنیامیں موجودنہیں ہےاورموجودہ انجیل یونانی زبان کی اس کاترجمہ ہے۔پس کیا وجہ ہے کہ ''عیز ڈراس'' کی کتاب کے اس نسخہ کوجس کا یونانی میں لکھا جانا خیال کیا گیا ہے عبری کاترجمہ نہ تصور کیا جاوے۔

تیسری سب سے بڑی دلیل اس کتاب کی عزرا کی لکھی ہوئی نہ ہونے کی ڈاکٹر گرے کاقول ہے وہ کہتے ہیں کہ اس ''کتاب کے مختلف مقامات کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مسئلوں اور خیالات اور فقروں کی طرح ہے جوعہد جدید میں پایا جائے اور یہ بات کہ ہمارے سیویریعنی حضرت مسیح کا ذکران کا نام لے کراس میں بہت صاف الفاظ میں کیا ہے۔ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرکل نہیں تواکثر حصہ اس کا انجیل کے بعد لکھا ہوا ہے۔

جن ورسوں میں ایسے الفاظ ہونے کا خیال کیا گیا ہے وہ مندرجہ زیل ورسوں میں مذکور ہیں۔

''اوراس لیے میں تم سے کہتا ہوں اے کفارتم میں سے جو سنتے اور سمجھتے ہیں کہ تم ڈھونڈواپنے گڈریا کوکہ وہ تم کو ہمیشہ کا آرام دے گا کیوں کہ اب وہ قریب ہےاوردنیا کے آخیرمیں آنے والا ہے۔'' (باب۲، ورس۳۴)

''بادشاہت کے انعام کے لیے تیار رہو کیوں کہ ہمیشہ کی روشنی تم پر چمکنے والی ہے۔ '' (باب۲، ورس۳۵)

''اس دنیاکے سایہ سے بھاگواوراپنے جلال کی خوشی کوحاصل کرو میں اپنے سیویرکی تصدیق صاف طور سے کرتا ہوں۔'' (باب۲، ورس۳۲)

عیسائی حضرت عیسیٰ پر سیویر کا لفظ اطلاق کرتے ہیں اور اسی خیال سے ڈاکٹر گرے نے خیال کیا ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ مراد ہیں اور یہ کتاب انجیل کے بعد لکھی گئی ہے۔ مگر وہ عبری لفظ جس کا ترجم سیویر یعنی نجات دہندہ کیا جاتا ہے وہ عہد عتیق میں اشعیاء بنی کی کتاب باب ۴۳ ورس ۳ و ۱۱ و باب ۴۵ ورس ۲۱ و باب ۴۹ ورس ۲۶ و باب ۶۰ ورس ۱۶ میں آیا ہے اور خدا کی طرف اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔ پھر یہاں بھی سیویر سے خدا کیوں سمجھا نہیں جاتا۔

''تب میں نے فرشتہ سے پوچھا کہ یہ جوان شخص کون ہے جوان لوگوں کے سروں پر تاج رکھتا ہے اور ان کے ہاتھ میں شاخیں دیتا ہے۔'' (باب ۲، ورس ۴۶)

''پس اس نے جواب دیا کہ یہ خدا کا بیٹا ہے جس کو انہوں نے دنیا میں قبول کیا ہے۔'' (باب ۲، ورس ۴۷)

مگر بزرگ اور مقدس آدمی کو خدا کا بیٹا کہنا ایک عام محاورہ کتب عہد عتیق کا ہے۔ حضرت موسیٰ کی دوسری کتاب یعنی سفر خروج کے چوتھے باب کی بائیسویں آیت میں خدا نے حضرت یعقوب کو اپنا پہلا بیٹا کہا ہے اور وہ آیت یہ ہے: ''و بہ فرعون بگوئے کہ خداوند چنیں می فرماید کہ اسرائیل پسر اول زادہ من است'' زادہ کا لفظ اصل عبری میں نہیں ہے۔

ہوشیع نبی کی کتاب کے پہلے باب کی دسویں آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کے بیٹوں کا اطلاق ہوا ہے اور وہ آیت یہ ہے: ''معہذ التعداد بنی اسرائیل مثل ریگ دریا کہ پیمودنی و شمودنی نیست خواہد بود بلکہ واقع می شود در تمامی مقامے کہ بایشاں گفتہ خواہد شد کہ پسران خدا می آید۔''

''اور جو شخص کہ مندرجہ بالا برائیوں سے بچے گا وہ میر عجائبات کو دیکھے گا۔'' (باب ۷، ورس ۲۷)

”کیوں کہ میرا بیٹا جیسس ان لوگوں کے ساتھ ظاہر ہوگا جو اس کے ساتھ ہوں گے اور جو لوگ باقی رہیں گے وہ چار سو برس کے اندر خوش ہوں گے۔“ (باب ۷، ورس ۲۸)

بعد ان برسوں کے میرا بیٹا کرائسٹ مر جاوے گا اور تمام لوگ جو جان رکھتے ہیں وہ بھی“ (باب ۷، ورس ۲۹)

جیسس اور جیسو اور جوشیو یہ تینوں صورتیں یونانی نام جوشوا اور جیشوا کی ہیں جو مخفف ہے جیہوشوا کا، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مقام میں جو جیسس نام ہے ڈاکٹر گرے نے کس دلیل پر اس کو حضرت مسیح کا نام سمجھا ہے۔ کیوں کہ اس عیز ڈارس کی پہلی کتاب کے پانچویں باب ورس ۵ میں یہی نام آیا ہے اور یہ وہ شخص ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بنی اسرائیل کے ساتھ بیت المقدس میں آیا تھا۔ مذکورہ بالا ورس میں اسی شخص کا نام معلوم ہوتا ہے کیوں کہ لکھا ہے کہ جیسس ان لوگوں کے ساتھ ظاہر ہوگا جو اس کے ساتھ ہوں گے اور اس سے صاف اشارہ انہیں لوگوں کی طرف ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بیت المقدس میں آئے تھے۔

اس شخص نے بہت سی نیکی اور خدا پرستی کے کام کیے ہیں جن کا ذکر عیز ڈراس کی پہلی کتاب کے باب ۵ ورس ۸ و ۲۴ و ۲۸ و ۵۶ و ۶۸ و ۷۰ و باب ۶ ورس ۲ و باب ۹ ورس ۱۹ میں مندرج ہے اور انہیں نیک کاموں کے سبب سے اس کو خدا نے اپنا بیٹا کہا ہے۔

مسیح اور کرائسٹ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یہ لفظ ہر ایک کے لیے استعمال ہوتا تھا جس پر ایک خاص رسم میں تیل ملا جاتا تھا (دیکھو سفر لویان باب ۴ ورس ۳ و ۵ و ۱۶) ان ورسوں میں مسیح یا کرائسٹ کا لفظ ہائی پریسٹ کے لیے استعمال ہوا ہے اور بنی اسرائیل کے بادشاہوں کو بھی تیل ملا جاتا تھا اور وہ بھی اس لقب سے بولے جاتے تھے (دیکھو پہلا سموئل باب ۲ ورس ۱۰ و ۳۵ و باب ۱۲ ورس ۳ و ۵ و باب ۱۶ ورس ۶ و باب ۲۴ ورس ۶ و ۱۰ و باب ۲۶ ورس ۹ و ۱۱ و ۱۳۔ دوسرا سموئل باب ا ورس ۱۴ و ۱۶ و باب ۱۹ ورس ۲۱ و باب ورس ۱)

یہودیوں میں پریسٹ کو بھی تیل ملا جاتا تھا جس وقت کہ وہ اپنے کام پر مقرر ہوتے تھے (دیکھو پہلی کتاب تواریخ الایام باب ۱۶ ورس ۲۲ و زبور ۱۰۵ ورس ۱۵) پس اس مقام پر کرائسٹ سے وہی جیسس مراد ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بیت المقدس میں آیا تھا اور بطور پریسٹ کے اس نے بہت سے کام کیے تھے۔

مسٹر آرنلڈ ان اخیر دو ورسوں کی نسبت جن میں جیسس اور کرائسٹ کا لفظ آیا ہے یہ لکھتے ہیں کہ ''اس ورس اور اس کتاب کے اور چند فقروں سے جیسس کرائسٹ کا نام اور ان کے کام اور موت وغیرہ کا حال صاف صاف معلوم ہوتا ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ کسی یہودی نے، جس نے اس کتاب کو تسلیم کر لیا ہو، وہ عیسائی نہ ہو گیا ہو، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کسی یہودی نے جس نے اس کتاب کو تسلیم کر لیا ہو ان لفظوں کے وہ معنی سمجھے ہوں جو مسٹر آرنلڈ نے سمجھے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں'' کہ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب ہمارے سیویر یعنی حضرت مسیح کے تھوڑے زمانہ بعد لکھی گئی ہوگی اور جس کے حالات اور جس کے حواریوں کی تحریرات سے مصنف نے چند فقرے لکھے ہیں'' اگر چہ ہم نے تشریح کر دی ہے کہ ان ورسوں کے معنی نہیں ہو سکتے جو عیسائی مصنف سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم ان کے اس قول کو تسلیم کر لیں کہ یہ کتاب حضرت مسیح کے تھوڑے زمانہ بعد لکھی گئی تھی تو بھی یہ بات تسلیم کرنی ضرور ہوگی کہ قبل نزول قرآن مجید کے یہ کتاب تحریر ہو چکی تھی اور جو کہ اس مین متعدد جگہ انسانوں کو ابن اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس واسطے یہودیوں کا بعضا فرقہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتا ہو گا جیسا کہ ہمارے مفسروں نے لکھا ہے کہ مدینہ کے یہودیوں کا یہ اعتقاد تھا چنانچہ سعید ابن جبیر اور عکرمہ نے روایت کی ہے کہ سلام بن مشکم اور نعمان بن ادنی اور مالک ابن صیف جو مدینہ کے یہودی تھے آنحضرت ﷺ کے پاس آئے کہ ہم کیوں کر تمہاری

یا بعداری کریں تم نے تو ہمارا قبلہ چھوڑ دیا ہے اور عزیز کو ابن اللہ بھی نہیں سمجھتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ شام کے یہودیوں کا یہ اعتقاد نہیں تھا اور اسی وجہ سے وہ لوگ اس بات سے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ سمجھتے تھے ہمیشہ انکار کرتے رہے ہیں، مگر ان کے انکار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی فرقہ بھی اس اعتقاد کا نہ تھا اگر اس وقت عیسائیوں سے پوچھو تو سب عیسائی اس بات سے کہ وہ حضرت مریم کو بھی خدا سمجھتے تھے انکار کریں گے حالاں کہ چوتھی صدی کے اخیر میں عیسائیوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا جو کولی ری ڈینس پکارا جاتا تھا۔ موشیم اکلیز یا سٹکل ہسٹری صفحہ ۱۷۰ میں لکھا ہے کہ ان لوگوں نے باپ اور بیٹے (یعنی خدا اور حضرت مسیح) کے سوا حضرت مریم کو بھی خدا مانا تھا یہ فرقہ چند روز رہا اور مدت سے معدوم ہو گیا۔ اسی طرح یہودیوں کا بھی ایک خاص فرقہ تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اب وہ معدوم ہے۔

مسلمان عالموں کی دلیل کہ قرآن مجید علانیہ مدنیہ میں پڑھا جاتا تھا اور آیت

"وقالت الیھود عزیر ن ابن اللہ"

سب یہودی سنتے تھے اگر ان کا یہ اعتقاد نہ ہوتا تو ضرور الزام دیتے کچھ کم مضبوط نہیں ہے۔

....

حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور وفات کا مسئلہ

حضرت عیسیٰ کی نسبت جو امور قرآن مجید میں مذکور ہیں وہ بلا شبہ نہایت غور کے لائق ہیں ان میں سے ہم اس مقام پر صرف حضرت عیسیٰ کی ولادت اور وفات پر بحث کریں گے ۔ان کے متعلق باقی باتیں دوسرے مضمون میں علیحدہ بیان کی جائیں گی۔

عیسائی اور مسلمان دونوں خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ صرف خدا کے حکم سے عام انسانی پیدائش کے برخلاف بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔اگر ایسا ہی ہونا فرض کیا جاوے تو اول اس بات پر غور کرنی ہوگی کہ بن باپ کے پیدا کرنے میں حکمت الٰہی کیا ہو سکتی ہے۔ ایسے واقعات جو خلاف عادت یا مافوق الفطرت تسلیم کیے جاتے ہیں ان سے یا تو قدرت کاملہ پروردگار کا اظہار مقصود ہونا چاہیے یا ان کا وقوع بطور معجزہ مانا جاوے جب کہ خداوند تعالیٰ اقسام حیوانات کو بغیر تولد و تناسل کے عادتاً۔ پیدا کرتا رہتا ہے اور خود انسان کو بھی بلکہ تمام حیوانات کو ابتداء اس نے اسی طرح پیدا کیا ہے۔یا یوں کہو کہ آدم کو بے ماں و بے باپ کے پیدا کیا تھا تو حضرت عیسیٰ کے صرف بے باپ کے پیدا کرنے میں اس زیادہ قدرت کاملہ کا اظہار نہ تھا۔اگر یہ خیال کیا جاوے کہ صرف ماں سے پیدا کرنا دوسری طرح پر اظہار قدرت کاملہ تھا تو یہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔اس لیے کہ اظہار قدرت کاملہ کے لیے ایک ابربین اور ایسا ظاہر ہونا چاہیے کہ جس میں کسی کو شبہ نہ رہے۔بن باپ کے مولود کا ہونا ایک ایسا امر مخفی ہے جس کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اظہار قدرت کاملہ کے لیے کیا گیا ہے۔

بطریق اعجاز حضرت عیسیٰ کے بن باپک کے پیدا ہونے پر معجزہ کا بھی اطلاق نہیں ہو

سکتا۔معجزہ بمقابلہ منکران نبوت صادر ہوتا ہے۔قبل ولادت حضرت مسیح بلکہ ادعائے نبوت یا الوہیت کوئی شخص منکر نہیں ہوسکتا تھا۔پھر معجزہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے۔معہذا اگر وہ معجزہ ہوتا تو حضرت مریم معجزہ ہوتا نہ حضرت مسیح کا۔علاوہ اس کے جب کہ ان کی ولادت ٹھیک اسی طرح پر واقع ہوئی تھی جس طرح کہ عموماً بچوں کی ہوتی ہے کہ نو مہینے تک حمل میں رہے اور بروقت ولادت حضرت مریم پر وہ تمام حالات طاری ہوئے۔جو عموماً عورتوں پر بچہ پید اہونے میں طاری ہوتے ہیں تو کسی طرح اعجازاً۔ان کے پیدا ہونے کا کسی کو احتمال بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

عیسائی حضرت مسیح کے بن باپ کے پیدا ہونے کو ایک اور حکمت الہٰی پر منسوب کر سکتے ہیں کہ وہ گنہگار انسان کی آمیزش سے پاک اور بے گناہ ہوں تا کہ گنہگار انسانوں کی طرف سے فدیہ کیے جاویں۔مگر جب ماں کی شرکت سے وہ بری نہ تھے تو انسانی آمیزش سے پاک نہیں ہوسکتے تھے۔لاطینی کلیسائی کونسل ٹرینٹ میں تسلیم کیا کہ حضرت مریم بھی بن باپ کے پیدا ہوئی تھیں۔اگر یہ بھی مانا جاوے تو وہ بھی ماں کی شرکت سے بری نہ تھیں۔ انجام کار عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے حضرت مریم کو انسانی خاصیت یعنی گنہگار ہونے کی قابلیت سے اس لیے پاک کر دیا تھا کہ ان سے فدیہ ہونے کے لائق مولود پیدا ہو تو خدا اس طرح حضرت عیسیٰ کے باپ کو بھی پاک کر سکتا تھا اور بن باپ کے پیدا کرنے میں کوئی خاص حکمت نہیں ہوسکتی تھی۔

ابتداء میں عیسائیوں کو یہ خیال نہیں تھا کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے یا بن باپ کے پیدا ہونگے۔کیوں کہ مسیح کی نسبت یقین کیا جاتا تھا کہ وہ داؤد کی نسل سے ہوں گے۔یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو مسیح موعود نہیں مانا مگر جنہوں نے ان کو مسیح موعود مانا اور عیسائی یا نصاری کہلائے ان سب کو کامل یقین تھا کہ وہ حضرت داؤد کی اولاد میں ہیں۔

چنانچہ انجیل کے باب اورس ۲۷ اور متی کی انجیل باب اورس ۴۰ سے پایا جاتا ہے کہ یوسف حضرت مریم کا شوہر داود کی نسل سے تھا۔ مسلمان بھی قرآن کی رو سے جیسے کہ سورۃ انعام میں لکھا ہے حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیم کی ذریت یعنی اولاد سمجھتے ہین۔ پس اگر حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے ہوں تو وہ نسل داؤد یا اولاد ابراہیم سے کیوں کر قرار پاسکتے ہیں۔

اگر یہ کہا جاوے کہ ماں کے سبب سے ان کو داؤد کی نسل سے قرار دیا گیا ہے تو یہ بات دووجہ سے غلط ہے اول اس لیے کہ یہودی شریعت میں عورت کی طرف سے نسب قائم نہیں ہوسکتا دوسرے یہ کہ حضرت مریم کا داؤد کی نسل سے ہونا ثابت نہیں کیٹو سیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔ ''یوسیبیس جو قدیمی مذہبی مورخ ہے گو حضرت عیسیٰ کے نام پر اس نے طویل طویل بحث کی ہے مگر اس کے بیان سے اور نیز متی اور لوگ کی انجیلوں سے مریم کی پیدائش اور نسب پر کوئی نئی روشنی نہیں پڑتی۔ اپنی جو مریم کی ماں بیان کی گئی ہیں ان کی نسبت جس قدر قصے ہیں وہ محض افسانے ہیں اور ان کا کچھ ثبوت وشہادت نہیں ہے۔'' انجیل لوگ باب اورس ۶، ۳۷ سے پایا جاتا ہے کہ حضرت مریم حضرت زکریا کی بیوی الیشبع کی رشتہ دار تھیں اور الیشبع ہارون کی بیٹی تھیں۔ مگر یہ نومعلوم ہے کہ مریم والیشبع میں کیا رشتہ تھا ور نہ یہ معلوم ہے کہ ہارون کس کی اولاد میں تھے۔ قرآن مجید میں حضرت مریم کا باپ کا نام عمران لکھا ہے۔ اس پر استدلال کرنے سے بھی داؤد کی نسل سے حضرت مریم کا ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

عیسائی مفسر جب کہ حضرت عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو تسلیم کر کر نسل داؤد سے ثابت کرنے میں عاجز ہوئے۔ تو انہوں نے کہا کہ سینٹ لوک کی انجیل میں جو نسب نامہ یوسف کا لکھا ہے در حقیقت وہ مریم کا نسب نامہ ہے تا کہ مریم کا داؤد کی نسل سے ہونا ثابت کریں۔ دو انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کے نسب نامے ہیں۔ متی کی انجیل میں حضرت

عیسیٰ کے باپ کا نام یوسفؑ اوران کے باپ کا نام یعقوبؑ لکھا ہے اور لوک کی انجیل میں یوسفؑ کے باپ کا نام ہیلی لکھا ہے۔ پہلا نسب نامہ بذریعہ ناثان کے۔ یہ دونوں نسب نامے بلاشبہ مختلف ہیں۔ مگر عیسائی مفسر کہتے ہیں جیسے کہ تفسیر ہنری اسکاٹ میں مندرج ہے کہ یوسف نے ہیلی کی دختر سے یعنی حضرت مریم سے شادی کی تھی اور شاید اس نے یوسف کو متبنّی بھی کیا تھا اور یوسف ہیلی کا بیٹا کہلاتا تھا اور یہودیوں میں رواج تھا کہ نسب ناموں میں صرف مردوں کا نام لکھتے تھے نہ عورتوں کا۔ اس لیے سینٹ لوک نے اس نسب نامہک میں جو درحقیقت مریم کا ہے بجائے مریم کے یوسف کا نام لکھ دیا ہے۔

اس بیان پر بعض عیسائی علماء بے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ نسب نامہ داؤد تک بذریعہ ناثان کے پہنچا ہے اور حضرت مسیح کا بذریعہ سلیمان کے داؤد کی نسل میں ہونا چاہیے اسکا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ سلیمان کی اولاد میں ہونے والے تھے بلکہ صرف یہ بیان ہوا ہے کہ وہ داؤد کے بیٹے اور یشی کی نسل سے ہوں گے اور سلیمان بطور ایک عمدہ نمونہ حضرت مسیح کے بیان ہوئے ہیں۔

اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے کہ اس پچھلے نسب نامے میں بجائے حضرت مریم کے یوسف کا نام لکھا گیا ہے اور یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ یوسف ہیلی کے متبنیٰ اور داماد تھے اور یہ بھی فرض کیا جاوے کہ حضرت عیسیٰ کا سلیمان کے ذریعہ سے داؤد کی اولاد میں ہونا کچھ ضرور نہ تھا تو بھی اس بات کا جواب نہیں ہوسکتا کہ یہودی شریعت میں ماں کی طرف سے نسب نہ معتبر گنا جاتا تھا اور نہ بیان کیا جاتا تھا یہاں تک کہ عورتوں کا نام بھی نسب ناموں میں داخل کیا جاتا تھا۔ پس حضرت عیسیٰ مسیح کی نسبت جو جو پیشین گوئی تھی کہ داؤد کی نسل میں سے ہوں گے کس طرح ماں کی طرف منسوب نہیں ہوسکتی بلکہ بموجب اس پیشین گوئی کے ضرور ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح ایسے باپ کی اولاد ہوں جو داؤد کی نسل سے ہو۔

پادری رچارڈ واٹسن نے تفسیر انجیل لوک میں لکھا ہے کہ ''یہ عام یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ یوسف کے بیٹے ہیں اور ان کا معجزہ کے طور سے پیدا ہونا مشہور نہیں کیا گیا تھا بلکہ یوسف اور مریم کے دلوں ہی میں مخفی تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بات کب پہلے پہل ظاہر کی گگئی۔ چوں کہ انجیل کے حالات میں اس پر کچھ اشارہ نہیں پایا جاتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حواریوں کو بھی ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے وہ اور نیز اور بھی ان کو یوسف اور مریم کا بیٹا سمجھتے تھے اور یہ امر منجملہ ان امور کے تھا جن کو مریم نے خدا کی ہدایت سے حضرت عیسیٰ کے مردوں سے جی اٹھنے کے بعد تک اپنے دل میں چھپا رکھا۔ اگر پیش تر سے یہ بات مشہور ہو جاتی تو حضرت عیسیٰ کی تبلیغ رسالت کے بعد لوگ اکثر حضرت مریم کو تنگ کیا کرتے اور اہانت کی باتیں ان سے پوچھا کرتے اور جب کہ اس قدر اختلاف رائے عیسیٰ کی نسبت ان کے دشمنوں میں ہوتا تو مریم کو خطرہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ کم سے کم یہ ہوتا تو مریم کو خطرہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ کم سے کم یہ ہوتا کہ وہ بہت دقت وہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتیں۔ ان امور کے لحاظ سے ظن قوی ہوتا ہے کہ یہ بات حضرت عیسیٰ کی زندگی بھر کسی کو معلوم نہیں ہوئی تھی مگر سینٹ لوک کے اس فقرہ سے کہ، جیسا کہ وہ یوسف کا بیٹا خیال کیا جاتا تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعد عروج مسیح کا بیٹا خیال کیا جاتا تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعد عروج مسیح یہ امر منجملہ ان باتوں کے تھا جو پہلے پہل معلوم ہوگئی تھیں اور بغیر کسی شبہ کے وہ مان لیا گیا تھا اور اسی وجہ سے یہ بات انجیل متی اور انجیل لوک میں داخل ہوئی ہے۔''

اس بات کو خود حواری حضرت عیسیٰ کے اور تمام عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مریم کا خطبہ یوسف سے ہوا تھا۔ یہودیوں کے ہاں خطبہ کا یہ دستور تھا جیسے کہ کیتھو سیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ شوہر اور زوجہ میں اقرار ہو جاتا تھا کہ اس قدر معیاد کے بعد شادی کریں گے۔ یہ اقرار یا تو ایک باقاعدہ تحریر یا معاہدہ کے ذریعہ سے گواہوں کی موجودگی میں ہوتا تھا جس

طرح کہ ہم مسلمانوں کے ہاں نکاح کا خط لکھا جاتا ہے یا بغیر تحریر کے اس طرح پر ہوتا تھا کہ مرد عورت کو گواہوں کے سامنے ایک ٹکڑا چاندی کا دے دیتا تھا اور یہ لفظ کہتا تھا کہ یہ چاندی کا ٹکڑا اس امر کی کفالت میں قبلو کر کہ اتنے دنوں بعد تو میری زوجہ ہو جاوے گی۔

یہ معاہدے حقیقت میں عقد نکاح تھے۔ صرف زوجہ کا گھر میں لانا باقی رہ جاتا تھا اور وہ اس معیاد پر ہوتا تھا جو اس معاہدہ میں قرار پاتی تھی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسی کہ مسلمانوں میں فاتحہ خیر ہوتی ہے جو درحقیقت ایک شرعی نکاح ہے لیکن زوجہ فی الفور گھر میں نہیں لائی جاتی یا جیسے کہ اب بھی بعض دفعہ مسلمانوں میں نکاح بہ تحریر نکاح خط عمل میں آتا ہے اور زوجہ کا شوہر کے گھر بھیجنا کسی آئندہ وقت پر ملتوی رہتا ہے۔

یہودیوں کے ہاں اس رسم کے ادا ہونے کے بعد مرد اور عورت باہم شوہر اور زوجہ ہو جاتے تھے اور بجز اس کہ کہ زوجہ اپنے شوہر کے گھر رہنے کو اس مدت کے بعد بھیج دی جاوے اور کوئی ایسی رسم جس پر جواز تزوج منحصر ہو عمل میں نہیں آتی تھی یہاں تک کہ اگر بعد اس رسم کے اور قبل رخصت کرنے کے ان دونوں سے اولاد پیدا ہو تو وہ جائز اولاد تصور نہیں ہوتی تھی بلکہ بے گناہ شرعی اولاد جائز تصور ہوتی تھی۔ شاید خلاف رسم بات ہونے سے معیوب گنی جاتی ہوگی اور دونوں کو ایک شرم اور خجالب کا باعث ہوتی ہوگی۔

امر مذکورہ کا ثبوت کیٹو سیکلو پیڈیا سے بھی ظاہر ہوتا ہے اس میں لکھا ہے کہ جب یہ معاہدہ شادی کا یہودیوں میں ہو جاتا تھا تو زن و مرد ایک دوسرے کو دیکھنے کے مجاز ہوتے تھے۔ جس کی ان کو پہلے اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک نسبت شدہ باکرہ کے بطن سے خدا نے اپنے بیٹے کے پیدا ہونے میں یہ حکمتیں رکھی تھیں۔ اول۔ یہ کہ ان پر غیر مشروع اولاد ہونے کا طعنہ عاید نہ ہو۔ دوم، یہ کہ ان کے والدین موافق یہودی شریعت کے سزا کے مستوجب نہ ہوں۔ سو،۔ یہ کہ یوسف کے نسب نامہ سے جن کی رشتہ دار

مریم تھیں۔مریم کا نسب نامہ ظاہر ہو جاوے۔ چہارم۔ یہ کہ حضرت مسیح کا ایام طفولیت میں کوئی مربی اور سرپرست ہو۔ان تمام بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں میں اس طرح نسبت کے بعد اولاد کا پیدا ہونا شرعاً ناجائز نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں نے نعوذ باللہ حضرت مریم پر جو بہتان باندھا تھا وہ یوسف کے ساتھ نہیں باندھا تھا بلکہ پنتھرا اتالی کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ کیوں کہ یوسف ان کے شرعی شوہر ہو چکے تھے پس کوئی وجہ اس بات کے خیال کرنے کی نہیں ہے کہ یوسف فی الواقع مسیح کے باپ نہ تھے۔متی کی انجیل میں جو یہ لکھا ہے کہ یوسف نے جب یہ دیکھا کہ مریم حاملہ ہیں تو ان کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔اگر یہ بیان تسلیم کیا جاوے تو اس کا سبب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ عام رسم کے برخلاف حاملہ ہو جانے سے یوسف کو رنج وخجالت ہوئی ہو گی جس کے سبب سے ایسا خیال ہوا ہوگا۔مگر جو کہ فی الحقیقت وہ پاک حمل تھا اور جو کچھ حضرت مریم کے پیٹ میں تھا وہ روح القدس اور کلمۃ اللہ تھا۔یوسف نے خواہ خود ہی خواہ اپنے خواب کی تائید پر جس کا ذکر سینٹ متی کی انجیل میں ہے وہ خیال چھوڑ دیا۔

اگرچہ ان چاروں مروج انجیلوں کے زمانہ تالیف میں نہایت اختلاف ہے مگر جو زمانہ کہ علمائے عیسائی نے قریب صحت کے تسلیم کیا ہے اس کی رو سے پایا جاتا ہے کہ متی کی انجیل حضرت عیسیٰ کے بعد دوسرے یا تیسرے سال مین اور لوک کی انجیل اکتیسویں یا بتیسویں سال میں اور یوحنا کی انجیل تریسٹھویں یا چونسٹھویں سال اور مارک کی انجیل اس کے بھی بہت دنوں بعد تحریر ہوئی تھی۔مگر متی کی نسبت بخوبی ثابت ہے کہ وہ دراصل عبرانی میں لکھی گئی اور موجودہ یونانی انجیل اس کا ترجمہ ہے۔جس ے مترجم کا نام اور زمانہ ترجمہ اب تک تحقیق نہیں ہوا۔پس متی کی موجودہ یونانی انجیل بھی قدیم نہیں ہے بلکہ اخیر زمانہ کی لکھی ہوئی ہے۔

یہ تمام انجیلیں اور حواریوں کے نامے اور اعمال جو ان انجیلوں کے آخیر میں شامل ہیں یونانی زبان میں لکھے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں عیسائی مذہب کو ان ملکوں میں رواج دینے کے لیے لکھی گئی تھیں جہاں یونانی زبان مروج تھی اور جہاں کے لوگ زیادہ تر یونانیوں کے سے خیالات رکھتے تھے۔

یونانیوں میں ایک عام خیال تھا کہ نہایت مقدس اور بزرگ شخص کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ہرکیولیس، ڈیاس کوری، رامیولس، فیثا غورث، افلاطون، ان سب کو یونانی خدا کا بیٹا کہتے تھے اور افلاطون کے حمل کے قصہ کو قصہ حمل مثل حضرت عیسیٰ بیان کرتے تھے۔ غرض کہ جب حواریوں کو یونانی زبان کے ذریعے سے دین عیسوی کا پھیلانا مدنظر ہوا تو حضرت عیسیٰ کو ایسے بزرگ لقب سے ملقب کرنا پڑا ہوگا جو ان لوگوں کے خیالات سے مناسب تھا۔ جن کے لیے وہ انجیلیں لکھی گئی تھیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک وہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کی ولادت کی نسبت ان خالص خیالات کے ظاہر ہونے کا ذریعہ نہیں ہوسکتیں جو حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں اور ان انجیلوں کے تحریر ہونے سے پیشتر تھا۔ بایں ہمہ انہی انجیلوں کے تحریر ہونے سے پیشتر تھا۔ بایں ہمہ ہم انہی انجیلوں میں متعدد جگہ پاتے ہیں کہ یوسف کو حضرت مریم کا شوہر اور حضرت مسیح کو ان کا باپ یوسف کا بیٹا تسلیم کیا ہے۔

انجیل متی باب اورس ۱۶ میں لکھا ہے کہ یوسف مریم کا شوہر تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ متی کی انجیل میں حضرت عیسیٰ کے نسب نامہ میں اوروں کی نسبت یونانی لفظ 'اجن نسی' بیائے معروف استعمال ہوا ہے جس سے خاص باپ کا بیٹا ہونا پایا جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی نسبت یونانی لفظ ''جناں'' آیا ہے۔ جس سے اس ورس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''یعقوب سے پیدا ہوا یوسف شوہر مریم جس سے عیسیٰ پیدا ہوا مگر ویطسطین نے یونانی، زبان کی سند پر ثابت کیا ہے'' کہ 'جناں' کا لفظ بھی ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہونے پر بولا جاتا ہے۔

معہذا اس تغیر کا سبب وہی خیالات ہیں جو یونانیوں میں مذہب عیسوی پھیلانے کی بناء پر پیدا ہوئے تھے۔

لوک کی انجیل باب ۲ ورس ۳۳ کے موجودہ نسخوں میں یہ لفظ ہیں ''تب یوسف اور اس کی ماں'' مگر اس مقام پر بھی اسی خیال سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر کریساخ کی صحیح اور مقابلہ کر کے چھاپی ہوئی انجیل مطبوعہ لپسک ۱۸۰۵ء اور سنڈروف کی چھاپی ہوئی انجیل مطبوعہ ۱۸۴۹ء اور رومن ولگٹ کے ترجمہ انگریزی میں یوسف کا نام نہیں ہے بلکہ ''اس کا باپ اور اس کی ماں'' لکھا ہے اور ٹروٹوپ نے یونانی انجیل کی شرح میں اس کی تصیح کی ہے جس سے یوسف کا پدر مسیح ہونا تسلیم ہوتا ہے۔ لوک کی انجیل کے اسی باب کے ۴۳ ورس میں بھی قدیم نسخے الگزنڈریانوس میں بھی 'گوینس' کا لفظ ہے جس کے معنی والدین کے ہیں۔

لوک کی انجیل باب ۲ ورس ۴۸ میں حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ ''دیکھ تیرا باپ اور میں غمگین ہو کر تجھے ڈھونڈتے تھے۔''

لوک انجیل باب ۲ ورس ۲۷ و ۴۱ میں یوسف اور مریم کو حضرت عیسیٰ کا ماں باپ کہہ کر تعبیر کیا ہے۔

متی کی انجیل باب ۱۳ ورس ۵۵ میں لکھا ہے کہ لوگوں نے حضرت عیسیٰ کی نسبت کہا کہ ''کیا یہ بڑھی کا بیٹا نہیں، کیا اس کی ماں مریم نہیں کہلاتی۔''

اور انجیل یوحنا باب ۶ ورس ۴۲ میں ہے کہ لوگوں نے حضرت مسیح کی نسبت یہ کہا کہ ''کیا یہ یسوع یوسف کا بیٹا جس کے ماں باپ کو ہم پہچانتے ہیں۔''

انجیل یوحنا باب اورس ۴۵ میں لکھا ہے کہ ''فلپ نے نتھنئیل کو کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے ہم نے اسے پایا ہے وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔''

اعمال حواریین باب ۲ ورس ۳۰ میں پطرس حواری نے حضرت عیسیٰ کے داؤد کی نسل میں ہونے کی نسبت کہا ہے کہ ''خدا نے اس سے (یعنی داؤد سے) قسم کر کے کہا کہ میں تیرے تخت پر بیٹھنے کے لیے جسم کے طور پر تیری کمر سے مسیح کو پیدا کروں گا۔''

سینٹ پال نے اپنے خط موسومہ رومیاں باب اورس ۴ میں لکھا ہے کہ ''وہ مسیح جسم کے حق میں داؤد کی تخم سے ہوا پر روح قدس کے حق میں جی اٹھنے کی قوی دلیل سے خدا کا بیٹا ثابت ہوا۔''

ان تمام سندوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کے زمانے کے سب لوگ اور خود حواری بھی جانتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ بغیر باپ کے۔ مگر ہو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا روحانی اعتبار سے کہتے تھے اسی خیال سے جس سے کہ یونانی اپنے ہاں کے بزرگوں کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور اس بات کو نہایت صفائی سے سینٹ پال نے اپنے خط کی مذکورہ آیت میں بیان کیا ہے۔ زمانہ کے گزرنے پر وہ خیال جس سے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہا محو ہو گیا اور لوگ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا سمجھنے لگے اور اس کے ساتھ یہ قرار دیا کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ان کی ضد سے یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نعوذ باللہ وہ ناجائز طور پر پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ اتہام سلس نے جو تیسری صدی میں تھا۔ کیا تھا اور ظاہراً یہ وہ زمانہ ہے کہ جب عیسائیوں کو اس باپ میں کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں زیادہ تر غلو ہو گیا تھا۔

قرآن مجید نے اس بات میں کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے کچھ بحث نہیں کی جب قرآن نازل ہوا اس وقت دو فرقے مخالف موجود تھے۔ ایک فرقہ نہایت نالائقی اور بدی سے یہ کہتا تھا کہ حضرت مسیح بطور ناجائز مولود کے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسرا

فرقہ یہ کہتا تھا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ ہیں۔ قرآن مجید نے ان دونوں فرقوں کے اعتقاد کو رد کر دیا اور حضرت مسیح کے مقدس اور روح پاک ہونے پر اور حضرت مریم کی عصمت وطہارت پر گواہی دی اور اس بات کو کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ میں جھٹلا دیا۔ اور بتلا دیا کہ وہ مثل اور انسانوں کے خدا کے بندے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں بیان ہوا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ جہاں تک کہ اشارہ ہے حضرت عیسیٰ کے روح القدس اور کلمۃ اللہ ہونے کا اور حضرت مریم کی عصمت اور طہارت کا اشارہ ہے۔ جیسا کہ ہم آگ بیان کرتے ہیں۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ جو شخص حضرت مریم کی نسبت تہمت بد لگاوے وہ مسلمان نہیں ہے۔

سورۃ آل عمران میں ہے کہ فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بے شک اللہ تجھ کو خوش خبری دیتا ہے ایک کلمہ کی اپنی طرف سے اس کا نام (ہوگا) مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا رویت دار دنیا میں اور آخرت میں اور (خدا کے) مقربوں سے اور کلام کرے گا لوگوں کے گھوارہ میں (یعنی بچپنے میں) اور بڑھاپے میں اور ہوگا نیکوں میں سے مریم نے کہا اے پروردگار کہاں سے ہوگا میرے بیٹا اور نہیں چھوا ہے مجھ کو کسی آدمی نے۔ خدا نے ہی کہا ہوگا اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے جج کہ کوئی کام کرنا ٹھہرا چکتا ہے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس کو کہتا ہے کہ ہو پھر ہو جاتا ہے۔ اور سورۃ مریم میں ہے کہ پھر ہم نے بھیجا اس کے (یعنی مریم کے پاس اپنی روح کو پھر وہ بن گئی اس کے لیے ٹھیک آدمی، مریم نے کہا کہ بے شک میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (خدا سے) ڈرتا ہے اس نے کہا کہ میں تو صرف تیرے خدا کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ مجھ کو پاکیزہ لڑکا دوں۔ مریم نے کہا کہ کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور نہیں چھوا ہے مجھ کو کسی آدمی نے اور نہ میں بدکار ہوں۔ اس نے کہا یہی ہوا تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس کو لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی رحمت کرنا چاہتے ہیں اور تھی یہ بات ٹھہر چکی۔

فرشتہ کا حضرت مریم کو بیٹا ہونے کی بشارت دینا اور ان کا یہ کہنا، کہ مجھے مرد نے نہیں چھوا ہے سینٹ لوک کی انجیل میں بھی مذکور ہے تمام یہودی یقین رکھتے تھے کہ ان میں ایک مسیح پیدا ہونے والا ہے جو یہودیوں کی بادشاہت کو پھر قائم کرے گا اس لیے یہودی اور یہودی عورتیں بیٹا ہونے کی نہایت آرزو رکھتی تھیں دعائیں مانگتی تھیں اور عبادتیں کرتی تھیں کہ وہ شخص ہمارا ہی بیٹا ہو۔ ایسی حالتوں میں ان کا اس قسم کی خوابوں کا دیکھنا یا بن بولنے والے کی آوازوں کا سننا یا متخیلہ میں کسی مجسم شے کا دکھلائی دینا ایسا امر ہے جو بمقتضائے فطرت انسانی واقع ہوتا ہے۔ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس سورۃ میں جو خطاب فرشتوں کا حضرت مریم سے ہے وہ بطریق الہام اور روح فی النفث اور القافی القلب کے ہے مگر مجھ کو کچھ شبہ نہیں جیسے کہ سیاق کلام سے پایا جاتا ہے۔ کہ امر بشارت جو اس صورت میں اور سورہ مریم میں بیان ہوا ہے وہ ایک ہی واقعہ ہے۔ اور رویا میں واقع ہوا تھا اور سینٹ متی کی انجیل سے بھی ایسا ہی مستنبط ہوتا ہے کیوں کہ بموجب اس انجیل کے یوسف کو بھی اس حمل کی خبر خواب میں بذریعہ فرشتہ دی گئی تھی۔

بیٹا ہونے کی بشارت حضرت اسحاق کو اور ان کی بیوی کو اور حضرت زکریا کو بھی دی گئی تھی۔ صرف بشارت سے تو بے باپ کے پیدا ہونا لازم نہیں آتا ہے۔ ہاں ان بشارتوں پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں کوئی ایسا لفظ تو نہین ہے جس سے بن باپ کے پیدا ہونے کا اشارہ نکلے، سو ایسا بھی کوئی لفظ ان بشارتوں میں نہیں ہے۔

سب سے زیادہ غور کے لائق لفظ

"لم یمسنی بشر ولم اک بغیا"

ہے۔ بلا شبہ یہ دونوں کلمے نہایت صحیح ہیں اور جس زمانہ میں بشارت ہوئی اس زمانہ میں بلا شبہ حضرت مریم کو کسی مرد نے نہیں چھوا تھا۔ بلکہ غالباً ان کا خطبہ بھی یوسف کے ساتھ

نہ ہوا تھا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے بعد بھی یہ واقع نہیں ہوا۔

جس طرح کہ حضرت مریم کو اس بشارت سے تعجب ہوا۔ اسی طرح حضرت اسحاق اور ان کی بیوی اور حضرت زکریا کو بھی تعجب ہوا تھا۔ جب کہ وہ فرمانے لگیں:

" یا ویلتی الدوانا عجوز وھذا بعلی شیخا ان ھذا لشئی عجیب"

اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔

"فاقلبت امرته فی صرة فصکت وجھھا وقالت عجوز عقیم "

اور حضرت زکریا نے فرمایا۔

"انی یکون لی غلام وقد یلغنی الکبر وامراتی عاقر"

اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔

"وکالت امرتی عاقرا وقد بلغت من الکبر عتیا"

حضرت مریم کی حالت اولاد ہونے سے مایوسی کی نہ تھی اور اسحاق اور ان کی بیوی اور زکریا اور ان کی بیوی کی حالت مایوسی کے قریب تھی۔ مگر جب ان دونوں سے بیٹے کا پیدا ہونا بغیر باپ کے تسلیم نہیں کیا گیا تو حضرت مریم کے تعجب سے جو صرف اس وقت کی کیفیت پر تھا جب کہ بشارت ہوئی تھی۔ نہ آئندہ کی ہونے والی حالت پر۔ کیوں کر حضرت عیسیٰ کے بے باپ کے پیدا ہونے پر استدلال ہوسکتا ہے اور کیا عجب ہے کہ اس خواب کے بعد ہی حضرت مریم کو اور ان کے مربیوں کو حضرت مریم کی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو جو آخر کار یوسف کے ساتھ عقد ہونے سے پورا ہوا۔

اس تعجب کے بعد فرشتے نے حضرت مریم سے کہا کہ

"کزالک اللہ یفعل ما یشاء"

حضرت مریم سے کہا کہ

"قال کذالک قال ربک وھو علی ھین"

اس طرح حضرت زکریا سے کہا کہ

"قال کذالک قال ربک وھو علی ھین"

لفظ جو سورۃ آل عمران میں ہے وہ کسی امر کے ہونے پر بلا اسباب

"کن فیکون "

قدرتی وفطرتی کے دلالت نہیں کرتا کیوں کہ ہر شے کے ہونے کو خدا اس طرح فرماتا

ہے

"اذا اراد شیا انمایقول له کن فیکون"

پس ہر شے

"کن"

کے حکم سے ہمیشہ قانون قدرت اور قاعدہ فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ پس یہ الفاظ کسی طرح اس بات پر کہ حضرت مسیح کی ولادت فی الفور بلا قاعدہ فطرت اور بغیر باپ کے ہوئی تھی، دلالت نہیں کرتے۔

"آیة اللناس"

کے لفظ سے یہ سمجھنا کہ حضرت مسیح کو بغیر باپ کے بطور ایک نشانی معجزہ کے پیدا کیا تھا محض بے جا ہے، اس لیے کہ بے باپ کے پیدا ہونا (اگر بالفرض ہوا بھی ہو) ایسا امر مخفی ہے جو کسی طرح

"آیته للناس"

نہیں ہوسکتا۔ آیتہً کا لفظ قرآن مجید میں فرعون، اصحاب کہف والرقیم، قوم نوح، نوح اور اصحاب سفینہ پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ حضرت مریم بوجہ اپنی عبادت اور خدا پرستی اور

نیکی کے اور حضرت عیسیٰ بہ سبب اس رحم دلی کے جو انجیل سے پائی جاتی ہے، خدا کی عمدہ نشانی کے لقب کے مستحق تھے۔

”بکلمۃ منہ“ کے لفظ یا

”کلمة القاها الی مریم“

کے الفاظ بھی کسی طرح بن باپ کے پیدا ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد جگہ لفظ ”کلمہ“ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں فرمایا ہے۔

” وتمت کلمة ربک الحسنی علی بنی اسرائیل “

اور سورۃ یونس میں فرمایا ہے

”و کذالک حقت کلمة ربک علی الدین فسقوا“

اسی طرح اور بہت سی جگہ آیا ہے اور کلمۃ اللہ سے وہ امور محققہ مراد ہیں جو ہونے والے تھے اور ہوئے اور ہوں گے۔ حضرت مسیح کا حضرت مریم سے پیدا ہونا ایک امر محقق اور معین تھا یا یوں کہو کہ مدعود تھا پس اسی امر محقق یا موعود کو کلمہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور جس طرح تمام قرآن میں کلمہ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح اس مقام پر بھی کیا ہے ان الفاظ سے بن باپ کے پیدا ہونے پر کچھ بھی اشارہ نہیں نکلتا۔

سورۃ النساء میں جہاں خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی نسبت فرمایا ہے کہ

”کلمة القاها الی مریم“

وہاں یہ بھی فرمایا ہے

”و روح منه “

اس لفظ سے بھی بن باپ کے پیدا ہونا نہیں ثابت ہوتا۔ تمام جان داروں کی نسبت

کیا حیوان اور کیا انسان ''روح منہ'' کا لفظ اطلاق کیا جاسکتا ہے۔سوائے اس کے اور کسی معنی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔خصوصا مسلمانوں کے مذہب کے مطابق جو خدا کے یا خدا کی روح کے یا خدا کے کلمہ کے مجسم ہونے کے قائل نہیں ہیں او راس کو

''لم یلد ولم یولد''

جانتے ہیں معہذا چند علمائے مفسرین نے بھی جیسا کہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے ''روح منہ'' قریبا قریبا ویسے ہی معنی مراد لیے ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں۔

اس میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ لوگوں کے لیے دینی زندگی کا سبب تھے۔اس لیے ان کو روح سے تعبیر کیا ہے۔خدا نے قرآن کی صفت میں فرمایا ہے

''کذالک اور حینا الیک روحا من امرنا''

اسی طرح حضرت عیسیٰ کو بھی روح کہا گیا ہے۔اور روح کے لفظ سے ان کی بزرگی بھی ظاہر ہوتی ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ یہ تو خدا کی نعمت ہے اور اس سے صرف اس نعمت کا بزرگ اور کامل ہونا مراد ہوتا ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ روح سے رحمت مراد ہے۔اس آیت کی تفسیر میں

''وایدھم بروح منہ''

کہا ہے

''ای برحمتہ منہ''

اور جب کہ حضرت عیسیٰ خلق کے لیے رحمت تھے تو ان کی نسبت

''روحا منہ''

کا اطلاق کیا گیا ہے۔سورۃ مجادلہ میں تمام ایمان والوں کی نسبت کہا گیا ہے

"اولئک کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منه"

پھر حضرت عیسیٰ کی نسبت ایسے الفاظ کا استعمال کسی طرح اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

سورۃ مریم میں جو الفاظ وارہوئے ہیں ان پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ ان سے بن باپ کے پیدا ہونے کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ سورۃ مریم میں حضرت مریم کا رویا کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے انسان کی صورت دیکھی جس نے کہا کہ "میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تم کو بیٹا دوں۔ اس کے بعد جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر (فی) تعقیب کی آئی جیسے کہ

"فحملته فاجاء ھا المخاض"

مگر اس فی سے اتصال زمانی مستنبط نہیں ہوسکتا۔ جیسے کہ مثال مذکورہ بالا سے ظاہر ہے۔ کیوں کہ ان کے حاملہ ہونے اور دردزہ شروع ہونے میں اتصال زمانی نہ تھا۔ لوک کی انجیل میں بھی لکھا ہے کہ "جب مریم کے جننے کے دن پورے ہوئے وہ اپنا پہلوتا بیٹا جنی" تفسیر کبیر میں بھی مدت حمل نو مہینے یا آٹھ مہینے یا سات مہینے لکھے ہیں۔ ابن عباس کی روایت نو مہینے کی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ غرض کہ اس مقام پر جہاں فی آئی ہے اس سے ہر جگہ خواہ مخواہ اتصال زمانی مستنبط نہیں ہوسکتا ہے۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد آیات سورہ مریم پر غور کرنا چاہیے کہ جب حضرت مریم نے اپنے رویا میں انسان کو دیکھا تو انہوں نے کہا

"انی اعوذ الرحمن منک ان کنت تقیا"

اس نے کہا

"انما انا رسول ربک لاھب لک غلام زکیا"

حضرت مریم نے کہا

"ان یکون لی غلام و لم یمسنی بشر ولم اک بغیا"

اس نے کہا

"کذالک قال ربک ھو علی ھین ولنجعلہ آیۃ للناس و رحمۃ منا وکان امرا مقضیا"

اس کے بعد ہے۔

"فحملتہ"

پس اس حرف فی سے جو فحملتہ پر ہے یہ لازم نہیں آتا کہ بمجرد اس گفتگو کے کسی زمانہ مابعد میں وہ حاملہ ہوئیں۔ جس وقت کی یہ گفتگو ہے بلاشبہ حضرت مریم کو کسی بشر نے نہیں چھوا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کا خطبہ یوسف سے ہوا اور وہ حسب قانون فطرت انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں۔

اسی طرح

"فاتت بہ قومھا تحملہ"

کی فے کا حال ہے کہ وہ ولادت کے زمانے سے متصل نہیں ہے بلکہ امر مذکورہ ولادت کے بعد کسی زمانہ میں واقع ہوا ہے۔ تفسیر ابن عباس میں لکھا ہے کہ ولادت کے چالیس دن بعد یہ واقع ہوا ہے اور تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ یعنی قوم کے پاس لانے کا اور حضرت عیسیٰ کے کلام کرنے کا۔ حضرت عیسیٰ کی صغرسنی میں واقع ہوا تھا اور ابوالقاسم بلخی کا قول ہے کہ حضرت عیسیٰ جوان ہونے کے قریب تھے جب یہ واقعہ ہوا تھا چناں چہ تفسیر کبیر کی یہ عبارت ہے۔

"اختلف الناس فیہ فالجمھور علی انہ قال ھذا الکلام حال صغرہ ،

وقال ابو القاسم البلخی انه کما قال ذالک ھین کان کالمراق الذی یفھم وان لم یبلغ حدالتکلیف ُ

(تفسیر کبیر) غرض کہ علمائے مفسرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تکلم حضرت عیسیٰ ولادت کے متصل نہ تھا۔

قرآن مجید سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ایسے وقت میں واقع ہوا تھا جب حضرت عیسیٰ نبی ہو چکے تھے۔ کیوں کہ آپ نے فرمایا ہے۔ کہ

" انی عبداللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبینا "

تاریخ پر اور انجیلوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی بارہ برس کی عمر تھی (دیکھو انجیل لوک باب ۲) جب انہوں نے بیت المقدس میں یہودی عالموں سے گفتگو کی۔ اسی بات پر یہودی عالم ناراض ہوئے اور انہوں نے آکر حضرت مریم سے کہا کہ تیرے ماں باپ تو بڑے نیک تھے تو نے یہ کیسا عجیب یعنی بد مذہب لڑکا جنا ہے۔ حضرت مریم نے خود اس کا جواب نہیں دیا اور حضرت عیسیٰ کو اٹھا لائیں۔ اس وقت انہوں نے فرمایا کہ

"انی عبداللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبینا"

اور ممکن ہے کہ یہ واقعہ اس کے بھی بعد ہوا ہو۔ یعنی جب کہ حضرت یحییٰ شہید ہو چکے تھے اور حضرت عیسیٰ نے یہودیوں کو سمجھانا اور ان کی بدیوں کو وعظ میں برا کہنا شروع کر دیا تھا

۔

غرض کہ اس قدر تو جملہ علمائے مفسرین تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ولادت کے زمانہ کے متصل واقع نہیں ہوا تھا اس کے بعد ہوا۔ کوئی مدت مابعد کے زمانہ کی چالیس دن اور کوئی قریب عمر مراہق یعنی بارہ برس کی قرر دیتا ہے اور باستدلال قرآن مجید زمانہ نبوت قرار دیتے

ہیں۔

قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسٰی نے ایسی عمر میں جس میں حسب فطرت انسانی کوئی بچہ کلام نہیں کرتا کلام کیا تھا۔قرآن مجید کے یہ لفظ ہیں

"کیف نکلم من کان فی المهد صبیاً

اس میں لفظ"کان" کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے سے ہم کیوں کر کلام کریں جو مہد میں تھا یعنی کم عمر لڑکا ہماری گفتگو کے لائق نہیں۔یہ اسی طرح کا محاورہ ہے جیسے کہ ہمارے محاورہ میں ایک بڑا شخص ایک کم عمر لڑکے کی نسبت کہے کہ کہ ابھی ہونٹ پر سے تو اس کے دودھ بھی نہیں سوکھا کیا یہ ہم سے مباحثہ کے لائق ہے"کان" کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اس وقت وہ نہ مہد میں تھے نہ مہد کے لائق تھے اور اس کے بعد کی آیت سے اس مراد کی اور بھی تائید ہوتی ہے اور بالفرض حضرت عیسٰی نے اگر مہد میں کلام بھی کیا ہو تو اس سے ان کے بن باپ کے پیدا ہونے پر کیوں کر استدلال ہوسکتا ہے۔

یہودیوں کے اس قول سے بھی کہ

"یا مریم لقد جئت شیا"

فرمایا

"اخت هارون ما کان ابوک امر سوء و ما کان امک بغیا"

حضرت عیسٰی کے بن باپ کے پیدا ہونے پر استدلال نہیں ہوسکتا۔اس لیے کہ اس زمانہ میں جب کہ یہودیوں نے حضرت مریم سے یہ بات کہی کوئی بھی حضرت مریم پر بدکاری کی تہمت نہیں کرتا تھا اور نہ اس آیت میں اس قسم کی تہمت کا اشارہ ہے فری کے معنی بدیع و عجیب کے ہیں۔اس لفظ سے غالبا یہودیوں نے مراد لی ہوگی

" شیا عظیما منکرا"

مگر اس سے یہ بات کہ انہوں نے اس وقت حضرت عیسیٰ کی نسبت ناجائز مولود ہونے کی تہمت کی تھی لازم نہیں آتی۔ بلکہ قرینہ اس کے برخلاف ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ نے اس کے جواب میں اس تہمت سے بری ہونے کا کوئی لفظ بھی نہیں کہا۔ اگر اس وقت یہودیوں کی مراد اس سے تہمت بدنسبت حضرت مریم کے اور ناجائز مولود ہونے کی نسبت حضرت عیسیٰ کے ہوتی تو ضرور حضرت عیسیٰ اپنے جواب میں اپنی اور اپنی ماں کی بریت اس تہمت سے ظاہر کرتے۔

صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تلقین سے جو خلاف عقائد یہود تھی علمائے یہود ناراض ہوکر حضرت مریم کے پاس آئے جس سے ان کی غرض یہ ہوگی کہ وہ حضرت عیسیٰ کو ان باتوں سے باز رکھیں اور کہا کہ تیرا باپ اور تیری ماں تو بڑے نیک تھے تو نے یہ کیسا عجیب بچہ جنا ہے جو تمام عقائد کے برخلاف باتیں کرتا ہے۔ حضرت مریم نے کہا کہ اسی سے پوچھو۔ اس پر یہودیوں نے کہ وہ کل کا بچہ ہمارے منہ لگنے کے لائق نہیں۔ اس پر حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو اٹھالائیں اور انہوں نے کہا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو فطرت انسانی کے موافق واقع ہوا اور اب بھی واقع ہوتا ہے۔ شوخ وشریر لڑکے کی ماں سے اس کی شکایت کی جاتی ہے۔ جو شوخی کہ اس نے کی ہو اس کی نسبت اس کی ماں کہتی ہے کہ اسی سے پوچھو۔ پس ان الفاظ سے جو قرآن مجید میں ہیں حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے پر کسی طرح استدلال نہیں ہوسکتا۔ اٹھالانے کا لفظ اس مقام پر مجازا بولا گیا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ گود میں اٹھالانا لازم نہیں آتا۔

سورۃ انبیاء میں حضرت مریم کی نسبت خدا نے فرمایا ہے

”والتی احصنت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا وجعلناھا وابنھا آیۃ للعالمین“

اس سے بھی حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اول تو کوئی مسلمان خدا کی روح کے مجسم ہونے پر اعتقاد نہیں کرسکتا۔

''احصنت فرجھا''

کے یہ معنی نہیں کہ

'' احصنت فرجھا من کل رجل''

بلکہ یہ معنی ہیں کہ

''احصنت فرجھا من غیر زوجھا ''

چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے

''احصنت اے عن الفواحش لانھا قذفت باالزنا''

اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حصان کے معنی عفیفہ عورت کے ہیں اور اسکی مثال میں حضرت مریم کی نسبت جو لفظ

''احصنت فرجھا ''

کا آیا ہے وہی لکھا ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اس لفظ سے حضرت مریم کا تہمت بد سے بری ہونا نکلتا ہے نہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا محصنات کے معنی عفاف کے اور جگہ بھی قرآن میں آتے ہیں جیسے کہ

''محصنات غیر مسافحات'' '' محصنین غیر مصافحین''

اور شوہر دار عورت کے بھی آئے ہیں جیسے کہ

''والمحصنات من النساء ''

تفسیر کبرے میں لکھا ہے

''یقال امرۃ محصنۃ اذا کانت ذات زوج''

پس حضرت مریم کی نسبت احصنت کا لفظ زیادہ تر صاحب زوج ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

نفخ روح حضرت عیسیٰ میں کچھ دلیل ان کے بن باپ ہونے نہیں ہوسکتی۔ تمام انسانوں کی نسبت خدا تعالیٰ نے نفخ روح کہا ہے جیسے کہ سورۃ تنزیل میں فرمایا ہے۔

"خلق الانسان من طین ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهین ثم سواهو نفخ فیه من روحه"

پس جس طرح کہ اور انسانوں میں اللہ اپنی روح نفخ کرتا ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ میں بھی کی تھی۔

سورۃ آل عمران میں ہے

" ان مثل عیسیٰ عند الله کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون"

اس آیت سے بھی حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پید ہونا ثابت نہیں ہوتا، مفسرین نے لکھا ہے کہ وفد تجران جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور جو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے پر یہ دلیل لاتے تھے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں اس لیے خدا کے بیٹے ہیں۔ اس دلیل کے رد کرنے کو یہ آیت نازل ہوئی۔ اگر یہ روایت صحیح مانی جاوے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا تسلیم کرلیا ہو کیوں کہ یہ دلیل بہ طور دلیل الزامی کے ہے۔ دلیل الزامی میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ جو مقدمہ مخالف نے قائم کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ بلکہ اس کے مقابلہ میں ایک اور مقدمہ مسلمہ پیش کیا جاتا ہے جس سے مخالف کی دلیل باطل ہوجاتی ہے۔ پس اس مقام پر دلیل الزامی اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اگر بالفرض تم بوجہ بن باپ کے پیدا ہونے کے حضرت عیسیٰ کو خدا

کا بیٹا مانتے ہو تو حضرآدم کو جو بن ماں باپ کے پیدا ہوئے ہیں بدرجہ اولیٰ خدا کا بیٹا ماننا چاہیے اور جب کہ تم حضرت آدم کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے تو حضرت عیسیٰ کو صرف بن باپ کے پیدا ہونے سے کیوں خدا کا بیٹا مانتے ہو۔

معہذا اگر لفظ مثل سے حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ میں مماثلت مراد ہے تو وہ مماثلت دونوں کی خلقت میں تو نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ حضرت آدم مٹی سے یا پانی سے پیدا ہوئے تھے اور نہ وہ نو مہینے کسی عورت کے پیٹ میں رہے اور نہ مثل ایسے انسانوں کے جو نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں ان کا حالت نطفہ سے جنین ہونے تک نشوونما ہوا۔ برخلاف حضرت عیسیٰ کے۔ پس حضرت عیسیٰ اور حضرت آدم کی پیدائش میں تو کسی طرح مماثلت نہیں ہوسکتی اور اگر یہ کہا جاوے کہ صرف باپ نہ ہونے میں مماثلت ہے تو یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اول یہ بات ثابت ہونی چاہیے کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے جب یہ بات ثابت ہوجاوے تو بن باپ کے پیدا ہونے میں مماثلت کا دعویٰ ہوسکتا ہے۔ حالاں کہ ان کا بے باپ کے پیدا ہونا ابھی تک ثابت نہیں ہے پس اگر مماثلت ہے تو یا تو نفخ روح میں ہے کہ حضرت آدم کی نسبت بھی کہا ہے ہے

”فنفخنا فیه من روحنا“

اور یا صرف مخلوق ہونے میں ہے کہ جس طرح حضرت آدم خدا کے بندے اور مخلوق تھے اس طرح حضرت عیسیٰ بھی خدا کے بندے اور مخلوق ہیں اور اس کی تائید قرآن مجید سے ہوتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے

”لن یستنکف المسیح ان یکون عبدالله “

پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس آیت سے حضرت مسیح کے بن باپ ہونے پر استدلال کیا جاوے۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر جگہ حضرت عیسیٰ کو ابن مریم کہا گیا ہے۔ اگر ان کے کوئی باپ ہوتا تو ان کی ابنیت باپ کی طرف منسوب کی جاتی نہ ماں کی طرف۔ مگر یہ دلیل نہایت بودی ہے۔ کیوں کہ جب قرآن نازل ہوا تو حضرت عیسیٰ یہود اور نصاریٰ دونوں میں ابن مریم کے لقب سے مشہور تھے۔ وہی مشہور لقب ان کا قرآن میں بھی بیان کیا گیا ہے اس سے ان کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

حضرت مسیح کے واقعات میں جیسے کہ آپ کی ولادت کا مسئلہ بحث طلب ہے ویسا ہی آپ کی وفات کا مسئلہ بھی غور کے لائق ہے۔ یہودی یقین رکھتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر ڈالا۔ عیسائی یقین رکھتے ہیں کہ یہودیوں نے ان کو صلیب پر چڑھایا اور وہ صلیب ہی پر مر گئے پھر صلیب پر اتار کر قبر میں دفن کیا پھر ہو جی اٹھے۔ جمہور مسلمین کا یہ اعتقاد ہیکہ وہ صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ پر الحاد کا اور یہودی شریعت کے مسائل مقررہ سے پھر جانے کا الزام لگایا تھا۔ انجیل یوحنا کے ساتویں باب کی بارہویں آیت میں لکھا ہے کہ ''لوگوں میں اس کی (یعنی حضرت عیسیٰ کی) بابت بہت تکرار تھی۔ بعضے کہتے تھے کہ وہ نیک ہے اور کتنے کہتے تھے کہ نہیں بلکہ وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی انجیل کے باب ۲۶ آیت ۶۵ میں لکھا ہے کہ سردار امام نے اپنے کپڑے پھاڑ کر کہا کہ یہ (یعنی حضرت عیسیٰ) کفر کہہ چکا ہے اب ہم کو اور گواہوں کی کیا درکار ہے دیکھو اب تم نے اس کا کفر بکنا سنا۔''

یہودی شریعت میں جیسے کہ توریت کی کتاب احبار باب ۲۴ ورس ۱۴ و کتاب استثناء باب ۱۳ سے پایا جاتا ہے ارتداد یا الحاد کی سزا سنگسار کرنا تھا۔ مگر اس زمانہ میں رومیوں کی سلطنت تھی اور وہ یہودی شریعت سے مرتد ہونے کے جرم میں کسی کو سنگسار نہیں کرتے تھے اس لیے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ پر بادشاہ وقت سے باغی ہونے کی تہمت لگائی اور پلاط

سے کہا کہ وہ اپنے تئیں یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے۔ لوگوں کو ورغلاتا ہے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتا ہے، جرم بغاوت کی سزا صلیب پر چڑھا کر مار ڈالنا تھی۔ اس لیے یہودیوں نے پلاط سے جو وہاں کا حاکم تھا درخواست کی کہ وہ صلیب پر چڑھا دیا جاوے۔

واقعہ صلیب کے بعد مختلف فرقوں نے مختلف رائیں اس کی نسبت قائم کیں۔ یہودی اپنی شیخی سے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو شریعت کے بموجب پہلے سنگسار کر کے قتل؛ کر ڈالا اور پھر صلیب پر لٹکا دیا۔ عیسائی سنگسار کر کے مار ڈالنا تو تسلیم نہیں کرتے جو درحقیقت غلط بھی ہے مگر صلیب پر چڑھا کر مار ڈالنا تسلیم کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ بعد اس کے حضرت عیسیٰ قبر میں دفن کیے گئے اور پھر مردوں میں سے جی اٹھے اور حواریوں سے ملے اور پھر زندہ آسمان پر چلے گئے اور اپنے باپ یعنی خدا کے دائیں ہاتھ پر جا بیٹھے۔ بعض قدیم عیسائی فرقے جن کو حضرت عیسیٰ کا صلیب پر چڑھایا جانا بہت ناگوار تھا۔ حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھائے جانے سے قطعاً منکر تھے بعضے کہتے تھے کہ شمعون قرینی صلیب پر چڑھایا گیا اور بعض کہتے تھے کہ یہودائے اسخریوطی۔ شمعون وہ شخص ہے جو صلیب لے کر چلنے کو بیگار میں پکڑا گیا تھا اور یہودا وہ شخص ہے جس نے مخبری کر کے حضرت عیسیٰ کو پکڑوایا تھا۔

مسلمان مفسروں کی عادت ہے کہ پرانے قصوں میں بغیر تحقیقات اصلیت کے اور بلا غور کرنے کے مقصد قرآن مجید پر جہاں تک ہو سکتا ہے یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کو لے لیتے ہیں۔ انھوں نے پچھلی روایت کو زیادہ مودب سمجھا اور ظاہری الفاظ قرآن مجید

۱۔ دیکھو انجیل متی باب ۲۲ ورس ۱۶ و باب ۲۷ ورس ۱۱ و ۲۷ و انجیل لوک باب ۱۵ ورس ۲ و ۲۶ باب ۲۳ ورس ۲ و انجیل یوحنا باب ۱۹ ورس ۱۹۔

کو اس کے مناسب پایا۔ اس لیے انھوں نے پچھلی روایت کو اختیار کیا اور قرآن مجید

کے ایک لفظ کی بناء پر جس کو ہم آگے بیان کریں گے یہ قرار دیا کہ شمعون یا یہودا کی صورت بدل کر بعینہ حضرت عیسیٰ کی سی صورت ہوگئی تھی اور یہودیوں نے اس کو حضرت عیسیٰ جان کر صلیب پر چڑھا دیا تھا اور وہ زندہ آسمان پر چلے گئے تھے۔

ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر جانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے اعتقاد میں چنداں تفاوت نہیں ہے کیونکہ دونوں حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا اعتقاد رکھتے ہیں، مگر درحقیقت یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو دونوں مذہبوں میں نہایت مختلف ہے۔ عیسائی مذہب میں حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھائے جانے اور صلیب ہی پر جان دینے کا اعتقاد رکن اعظم ایمان ہے۔ کیوں کہ ان کے اعتقاد میں انسانوں کی نجات صرف حضرت عیسیٰ کے فدیہ ہونے یعنی صلیب پر جان دینے میں منحصر ہے۔ جو کوئی اس امر کا اعتقاد نہ کرے وہ موجودہ عیسائی مذہب کے مطابق عیسائی نہیں ہے اور نہ نجات کا مستحق ہے۔ پس مسلمانوں کا یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ بغیر صلیب پر چڑھائے زندہ آسمان پر چلے گئے۔ موجودہ عیسائی مذہب کے بالکل برخلاف ہے۔

اس واقعہ پر بحث کرنے سے پہلے ہم کو مناسب ہے کہ صلیب دینے کی نسبت کچھ بیا ن کریں کہ وہ کیوں کر دی جاتی تھی اور کس طرح اس پر جان نکلتی تھی۔ جاننا چاہیے کہ صلیب بطور چلیپا کے اس صورت کی ہوتی تھی: سپر چڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ لکڑیوں پر جو یمین و یسار میں ہیں پھیلاتے تھے اور اس کی ہتھیلیوں کو ان لکڑیوں سے ملا کر آہنی کیلیں ٹھوک دیتے تھے جہاں گول نشان ہے وہاں ایک مضبوط لکڑی لگی ہوتی تھی جو دونوں ٹانگوں کے بیچ میں رہتی تھی اور انسان اس پر لٹک جاتا تھا اس سے یہ غرض تھی کہ انسان بدن کے بوجھ سے نہ کھسکنے پاوے۔ پھر دونوں پاؤں کو اوپر تلے کر کے اور نیچے کی لمبی لکڑی پر رکھ کر ایک لوہے کی میخ اس طرح ٹھوکتے تھے کہ دونوں پاؤں کو توڑ کر لکڑی میں نکل جاتی تھی

اور کبھی پاؤں میں میخ نہیں ٹھوکتے تھے بلکہ رسی سے خوب جکڑ کر باندھ دیتے تھے۔

صلیب پر چڑھا دینے سے انسان مر نہیں جاتا کیوں کہ اس کی صرف ہتھیلیاں اور کبھی ہتھیلیاں اور پاؤں زخمی ہوتے تھے اس کے مرنے کے سبب یہ ہوتا تھا کہ چار چار، پانچ پانچ دن تک اس کو صلیب پر لٹکائے رکھتے تھے اور ہاتھ پاؤں کے چھیدوں اور بھوک اور پیاس اور دھوپ کا صدمی اٹھاتے اٹھاتے کئی دن میں مرتا تھا۔ چنانچہ اس کی سند طیطوس کی شہادت سے جو کتاب سیطری کا ن صفحہ ۱۱ میں اور ازیجرس کی شہادت سے جو تفسیر انجیل متی مطبوعہ گریگارٹن صفحہ ۲۲۳ میں مندرج ہے اور ازلسطر ینان کی کتاب صفحہ ۲۹۰ سے جو حضرت مسیح کے حالات میں لکھی ہے اور یوسی بیس کی تاریخ کلیسا صفحہ ۲۹۱ سے بخوبی پائی جاتی ہے۔

اب اس بات پر غور کرنی چاہیے کہ حضرت عیسیٰ کو کس طرح صلیب پر چڑھایا تھا۔ جس دن حضرت عیسیٰ صلیب پر چڑھائے گئے وہ جمعہ کا دن تھا اور یہودیوں کی عید فصح کا تہوار تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب ان کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان کی ہتھیلیوں میں کیلیں ٹھونکی گئیں مگر یہ امر مشتبہ ہے کہ پاؤں میں بھی کیلیں ٹھونکی گئیں یا نہیں۔ کیوں کہ انجیل یوحنا میں صرف ہتھیلیوں کے چھید دیکھنے کا ذکر ہے اور لوقا کی انجیل میں ہاتھ پاؤں دونوں کا مگر اس اختلاف سے جو اصل امر ہے اس میں کچھ اثر پیدا نہیں ہوتا۔

عید فصح کے دن ختم ہونے پر یہودیوں کا سبت شروع ہونے والا تھا اور یہودی مذہب کی رو سے ضرور تھا کہ مقتول یا مسلوب کی لاش قبل ختم ہونے دن کے یعنی قبل شروع ہونے سبت کے دفن کر دی جاوے مگر صلیب پر انسان اس قدر جلدی نہیں مر سکتا تھا۔ اس لیے یہودیوں نے درخواست کی کہ حضرت مسیح کی ٹانگیں توڑ دی جاویں تا کہ فی الفور مر جاویں۔ مگر حضرت عیسیٰ کی ٹانگیں توڑی نہیں گئیں اور لوگوں نے جانا کہ وہ اتنی دیر میں مر گئے۔ برچھی کا حضرت عیسیٰ کے پہلو میں ان کے زندہ یا مردہ ہونے کی شناخت کے لیے چبھونا

صرف یوحنا کی انجیل میں ہے اور کسی انجیل میں نہیں ہے اور نہ اس وقت جب کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے ہاتھوں کے چھید حواریوں کو دکھلائے۔ پسلی کے چھید کا دکھانا کسی انجیل میں لکھا ہے اور اس برچھی کا چبھونا نہایت مشتبہ ہے محہذا ابھی اگر وہ صحیح ہو تو وہ بھی کوئی ایسا زخم جس سے فی الفور ہلاکت ہو متصور نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ان کے ہاتھ پاؤں زخمی تھے اسی طرح پسلی کے نیچے بھی ایک زخم تسلیم کیا جاوے۔

جب کہ لوگوں نے غلطی سے جانا کہ حضرت در حقیقت مر گئے ہیں تو یوسف نے حاکم سے ان کے دفن کر دینے کی درخواست کی۔ وہ نہایت متعجب ہوا کہ ایسے جلد مر گئے۔ اس قدر جلدی مر جانے کی خبر سے کچھ حاکم ہی متعجب نہیں ہوا بلکہ عیسائی بھی اس کو ناممکن سمجھتے تھے اور اس لیے تیسری صدی عیسوی میں جو عیسائی علماء تھے انہوں نے حضرت عیسیٰ کا اس قدر جلد صلیب پر مرنا آخر کار معجزہ قرار دیا۔

غرضیکہ یوسف کو دفن کرنے کی اجازت مل گئی اور حضرت عیسیٰ صرف تین چار گھنٹے صلیب پر رہے کسی کتاب سے نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی رسم تجہیز و تکفین کی حضرت عیسیٰ کے ساتھ عمل میں آئی تھی بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف نے ان کو ایک لحد میں رکھا اور اس پر ایک پتھر ڈھانک دیا۔

اس بات کا تصفیہ نہیں ہو سکتا کہ یوسف نے یہ کام اس لیے کیا تھا تا کہ حضرت عیسیٰ کے دشمن یقین کر لیں کہ در حقیقت عیسیٰ مر گئے اور ہو جانتا تھا کہ وہ مرے نہیں ہیں یا آنکہ در حقیقت ان کو مردہ سمجھ کر اس نے لحد میں رکھ دیا تھا۔ بہر حال رات کو وہ اس لحد میں نہ تھے اور اس سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود یہودیوں کو بھی شبہ تھا کہ وہ مر گئے ہیں یا نہیں۔ اس لیے صبح کو بروز شبہ انہوں نے حاکم کی اجازت سے وہاں پر پہرہ متعین کر دیا مگر اب کیا فائدہ تھا جو کچھ ہوتا تھا وہ اس سے پہلے ہو چکا تھا۔

جب اس تمام واقعہ پر مورخانہ طور پر نظر ڈالی جاوے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر مرے نہ تھے بلکہ ان پر ایسی حالت طاری ہوگئی تھی کہ لوگوں نے ان کو مردہ سمجھا تھا اس امر کی نظریں کہ صلیب پر سے لوگ زندہ اترے ہیں تاریخ میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر کلارک نے متی کی انجیل کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایسی کئی ایک مثالیں موجود تھیں کہ شخص مصلوب کئی دن تک زندہ رہا۔ ہیروڈٹس رومی مورخ نے لکھا ہے کہ سندوکیس دار کے حکم سے صلیب پر چڑھایا گیا۔ اور پھر اس کے حکم سے اتارا گیا وہ زندہ رہا کر دیا گیا۔ یوسی سیس مورخ نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ طیطوس بادشاہ کے حکم سے بہت سے قیدی صلیب پر چڑھائے گئے ان میں سے تین آدمی اس کے ملاقاتی تھے۔ اس نے بادشاہ سے ان کی سفارش کی اور وہ صلیب پر سے اتارے گئے اور ان کا معالجہ کیا گیا۔ مگر ان میں سے دو آدمی مر گئے اور ایک شخص اچھا ہو گیا۔ حضرت عیسیٰ تین چار گھنٹے بعد صلیب سے اتار لیے گئے تھے اور ہر طرح پر یقین ہوسکتا ہے۔ کہ وہ زندہ ہی رات کو وہ لحد سے نکال لیے گئے اور وہ مخفی اپنے مریدوں کی حفاظت میں رہے۔ حواریوں نے ان کو دیکھا اور ملے اور پھر کسی وقت اپنی موت سے مر گئے۔ بلاشبہ ان کو یہودیوں کی عداوت کے خوف سے نہایت مخفی طور پر کسی نامعلوم مقام پر دفن کر دیا ہوگا جو اب تک نامعلوم ہے اور یہ مشہور کیا گیا ہوگا کہ وہ آسمان پر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ کی وفات بھی نہایت شبہ تھا کہ بنی اسرائیل جو پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتے پھرتے اور دشمنوں سے لڑتے لڑتے حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے نہایت تنگ ہو گئے تھے حضرت موسیٰ کی تلاش کے ساتھ کیا کریں گے اس لیے کہ ان کو بھی ایک پہاڑ کی کھوہ میں ایسے نامعلوم مقام میں دفن کیا گیا تھا کہ آج تک کسی کو اس کا پتہ معلوم نہیں ہوا۔ چنانچہ توریت کی پانچویں کتاب میں لکھا ہے۔ کہ ''پس موسیٰ بندہ خداوند در آنجا بزمین معہ آب موافق قول خداوند وفات کرد او را در درہ زمین معہ آب برابر بیت یعور دفن کد ہیچ

کس از مقبرہ او تا بہ امروز واقف نیست'' حضرت علی مرتضیٰ کا جنازہ بھی خوارج کے خوف سے اسی طرح مخفی طور پر دفن کیا گیا تھا۔ حالاں کہ خوارج کا خوف بہ نسبت یہودیوں کے بہت کم تھا اور اسی طرح بعض لوگوں نے حضرت علی مرتضیٰ کی نسبت بھی کہا تھا کہ وہ آسمان پر چلے گئے۔

اب ہم کو قرآن پر غور کرنا چاہیے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ کی وفات کے متعلق چار جگہ ذکر آیا ہے۔

اول۔ تو سورۃ آل عمران میں اور وہ یہی آیت ہے جس کی ہم تفسیر لکھتے ہیں کہ جب

''اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک و رافعک الی'' (آل عمران آیت ۵۶)

اللہ نے عیسیٰ سے کہا کہ'' بے شک میں تجھ کو وفات دینے والا ہوں اور تجھ کو اپنی طرف رفع کرنے والا ہوں۔''

دوم۔ سورۃ مائدہ میں جہاں فرمایا ہے کہ'' جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا بتاؤ تو حضرت عیسیٰ کہیں گے کہ میں نے ان سے نہیں کہا بجز اس کے جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا تھا کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے اور جب تک میں ان میں رہا ان پر شاہد تھا۔ پھر جب تو نے مجھ کو وفات دی تو تو ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔''

سوم۔ سورۃ مریم میں جہاں فرمایا ہے کہ'' جب حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو علماء یہود سے کلام کرنے کو لے آئیں تو حضرت عیسیٰ نے کہا کہ'' میں خدا کا بندہ اور نبی ہوں مجھ کو کتاب ملی ہے اور مجھ کو حکم دیا ہے نماز کا اور زکوۃ کا جب تک کہ میں زندہ رہوں اور اپنی ماں کیساتھ نیکی کرنے کا اور مجھ کو جبار و شقی نہیں بنایا ہے اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن کہ میں پیدا

ہوا اور جس دن کہ مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ ہو کر اٹھوں گا۔"

چہارم۔سورۃ نساء میں جہاں یہودیوں کے کفر کے اقوال بیان کیے ہیں وہاں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "یہودی کہتے تھے ہم نے عیسیٰ بن مریم رسول خدا کو قتل کر ڈالا حالاں کہ نہ انہوں نے ان کو قتل کیا اور نہ صلیب پر مارا۔لیکن ان پر (صلیب پر مار ڈالنے کی) شبیہ کر دی گئی اور جو لوگ کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں البتہ وہ اس بات میں شک میں پڑے ہیں۔ ان کو اسکا یقین نہیں ہے بجز گمان کی پیروی کے۔انہوں نے ان کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اپنے پاس ان کو اٹھا لیا۔"

پہلی تین آیتوں سے حضرت عیسیٰ کا اپنی موت سے وفات پانا علانیہ ظاہر ہے مگر جو کہ علمائے اسلام نے بہ تقلید بعض فرق نصاریٰ نے قبل اس کے کہ مطلب قرآن مجید پر غور کریں یہ تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں۔اس لیے انہوں نے ان آیتوں کے بعض الفاظ کو اپنی غیر محقق تسلیم کے مطابق کرنے کو بے جا کوشش کی ہے۔

پہلی آیت میں صاف لفظ

"متوفیک "

کا واقع ہے جس کے معنی عموماً ایسے مقام پر موت کے لیے جاتے ہیں۔خود قرآن مجید سے اس کی تفسیر پائی جاتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے۔

"اللہ یتوفی الانفس حین موتھا"

ابن عباس اور محمد بن اسحاق نے بھی جیسے کہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے

"متوفیک"

کے معنی

"ممیتک"

کے لیے ہیں

یہی حال لفظ

''توفیتنی''

کا ہے جو دوسری آیت میں ہے اور جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تو نے مجھ کو موت دی یعنی جب میں مر گیا اور ان میں نہیں رہا تو تو ان کا نگہبان تھا۔

پہلی آیت میں اور چوتھی آیت میں لفظ

''رفع''

کا بھی آیا ہے جس سے حضرت عیسیٰ کی قدر و منزلت کا اظہار مقصود ہے نہ یہ کہ ان کے جسم کو اٹھا لینے کا۔ تفسیر کبیر میں بھی بعض علماء کا قول ہے کہ لفظ

''رفع''

کا تعظیما اور تفخیما بولا گیا ہے۔

جن علماء نے

''متوفیک''

کے معنی

''ممیتک''

کے قرار دیے تھے انہوں نے قرآن مجید کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی موت سے مرے۔ مگر انہوں نے

''رافعک''

کے معنوں میں غلطی کی جو یہ خیال کیا کہ پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔ کیوں کہ

''رافعک''

کے لفظ سے جیسا ہم نے اوپر بیان کیا۔ آسمان پر جانا لازم نہیں آتا۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ پر موت طبعی طاری کرنے سے مقصود یہ تھا کہ ان کے دشمن ان کو قتل نہ کر سکیں۔ وہب کا یہ قول کہ وہ تین گھنٹہ تک مردہ رہے اور محمد بن اسحاق کا قول ہے کہ سات گھنٹہ، تک پھر زندہ ہوئے اور آسمان پر چلے گئے اور ربیع ابن انس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھاتے وقت موت دی۔

بہر حال ان اقوال سے اس قدر ثابت ہوا کہ بعض علماء اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو موت طبعی طاری ہوئی اور بعض علماء نے 'رفع' کے لفظ سے حضرت عیسیٰ کے جسم کا آسمان پر اٹھا لینا مراد نہیں لیا، بلکہ اس سے ان کی قدر و منزلت مراد لی ہے۔ پس جب ان دونوں قولوں کو تسلیم کیا جاوے تو جو ہم بیان کرتے ہیں وہی پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو یہودیوں نے نہ سنگسار کر کے قتل کیا نہ صلیب اور قتل کیا بلکہ وہ اپنی موت سے مرے اور خدا نے ان کو درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا۔

ان آیتوں میں ایک اور لفظ بھی غور کے قابل ہے یعنی

"مادمت فیھم"

اس کے صاف معنی ہیں کہ جب تک میں زندہ تھا اور اس کی سند خود قرآن مجید کی دوسری آیت میں موجود ہے جہاں فرمایا ہے

"مادمت حیا"

پس صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو معنی 'حیا' کے ہیں وہی معنی

"فیھم"

کے ہیں، اس کے بعد ہے

"فلما تو فیتننی"

تو اس سے اور بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس لفظ سے

"حیا"

ہی مراد تھی اور مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ جب تک میں ان میں تھا یعنی زندہ تھا تو میں ان پر شاہد تھا اور جب تو نے مجھے موت دی تو تو ان کا نگہبان رہا۔ پس ان دونوں آیتوں میں اس دنیا ہی میں حضرت عیسیٰ کا زندہ رہنا اور اس دنیا ہی میں اپنی موت سے مرنا بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

اب باقی رہی چوتھی آیت، مگر جب یہ تحقیق ہو گیا کہ یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو سنگسار کر کے قتل کیا تھا اور عیسائی یہ یقین کرتے تھے کہ یہودیوں نے صلیب پر حضرت عیسیٰ کو قتل کیا تھا حالاں کہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔ وہ سنگسار تو ہرگز نہیں ہوئے۔ صلیب پر البتہ لٹکائے گئے مگر صلیب پر مرے نہیں۔

"ما قتلوہ وما صلبوہ"

پہلے "ما" قافیہ سے نفس قتل کا سلب ہوتا ہے اور دوسرے سے کمال صلیب کا۔ کیوں کہ صلیب پر چڑھانے کی تکمیل اسی وقت تھی جب صلیب کے سبب موت واقع ہوئی، حالاں کہ صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی۔

"ولکن شبہ لھم"

سے اور زیادہ تشریح اس مطلب کی ہوتی ہے۔ تشبیہ میں چار چیزیں ہوتی ہیں: ایک مشبہ اور ایک مشبہ بہ، ایک وجہ تشبیہ ایک مشبہ لہ۔ اس آیت میں صرف دو چیزیں بیان ہوئی ہیں: ایک مشبہ جو حضرت عیسیٰؑ تھے۔ دوسری مشبہ لہم جو یہودی تھے اور جو درپے قتل حضرت مسیح تھے۔ مشبہ بہ قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ علمائے اسلام نے بعض عیسائی فرقوں کا یہ قول پایا کے شمعون یا یہودا صلیب پر چڑھایا گیا تھا انہوں نے جھٹ قرآن کے معنی بدل دیے اور

یہودا یا شمعون کو مشبہ اور حضرت عیسیٰ کو مشبہ بہ اور یہودا یا شمعون کی تبدیل صورت کو وجہ تشبیہ قرار دے دیا، حالاں کہ یہاں حرف مشبہ بہ محذوف ہے اور وہ ''موتی'' ہے اور وجہ تشبیہ وہ حالت ہے جو حضرت عیسیٰ پر طاری ہوئی تھی جس کے سبب وہ مردہ تصور ہوئے تھے۔ پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ

'' وما صلبوہ ولکن شبہ لھم بالموتی''

اس کی زیادہ تصریح اسی آیت کے اگلے لفظوں سے ہوتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ ''جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں ہیں۔ ان کو کچھ علم نہیں ہے بجز گمان کی پیروی کی'' اور پھر اس کے بعد تاکیدا اور یقیناً فرمایا کہ ''انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور اس مقم پر صلیب کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ صرف قتل کی نفی کی اور اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کے اوپر جو صلیب کی نفی کی تھی اس سے نفی قتل بالصلیب مراد تھی نہ مطلق صلیب۔

''ثم اماتہ باجل مسمی ورفعہ الیہ کمال قال اللہ تعالیٰ بل رفعہ اللہ الیہ.

انہی باتوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائی عالموں سے مباہلہ چاہا جس سے ایک نہایت عمدہ طور پر فطرت انسانی ظاہر ہوتی ہے۔ تمام اہل مذاہب خواہ صحیح مذہب رکھتے ہوں یا غلط دو قسم کے ہوتے ہیں۔ جہلا اور علماء جہلا کا یقین مذہبی باتوں پر نہایت پختہ اور مستحکم ہوتا ہے اور جو کچھ انہوں نے سمجھا ہے یا سیکھا ہے اس کے سوا اور وہ کچھ نہیں جانتے اور کوئی شبہ ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ ان کی مثال اندھے آدمی کی سی ہے کہ وہ اس رستہ پر جو اس کو کسی نے بتلا دیا ہے چلا جاتا ہے اور اس کے ٹھیک ہونے پر یقین رکھتا ہے اور خود نہیں جانتا کہ درحقیقت یہ رستہ اسی جگہ جاتا ہے جہاں اس کو جانا ہے یا نہیں۔ پھر اگر کسی نے کہہ دیا کے میاں اندھے آگے گڑھا ہے یا دیوار ہے تو وہ بغیر کسی شک کے اس پر یقین کر لیتا ہے اور

ٹھہر جاتا ہے۔ پھر جس نے جو راہ بتائی اس طرف ہولیا۔ یہی جہلائے اہل مذہب کا حال ہے جس مذہب میں وہ ہیں ان کو اس پر ذرا بھی شبہ نہیں۔ مگر علماء کا حال اس کے برخلاف ہوتا ہے گو وہ بھی مذہب کی پیروی کرتے ہیں اور جس مذہب میں وہ ہیں اس کو سچ کہتے ہیں اور دل میں بھی اس پر یقین رکھتے ہیں مگر ان کا دل شبہ سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ مذہب کے ہزاروں مسئلوں کو سچ کہتے ہیں مگر ان کی عقل ان کو قبول نہیں کرتی انکا علم انکے ویسے ہی ہونے پر ان کی تصدیق نہیں کرتا اور جب وہ اس پر سچا یقین نہیں کر سکتے تو اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ گو یہ بات عقل سے اور سمجھ سے دور ہو مگر مذہب کی رو سے ہم کو یونہی ماننا اور اس پر یقین کرنا ضرور ہے۔ پس درحقیقت ان پر ان کو سچا یقین نہیں ہوتا۔ دل میں ایک کانٹا سا کھٹکھٹا رہتا ہے اور جس پر ان کو حقیقی یقین نہیں ہوتا اس پر یقین بٹھلانا چاہتے ہیں۔ علمائے عیسائی جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کا اعتقاد رکھتے تھے اور مذہبا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ مگر سچائی سے دل نہیں مانتا تھا۔ فطرت انسانی میں یہ بات ہے کہ جو سچا شبہ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ دور کرنے سے دور نہیں ہوتا اور یقین بٹھلانے سے یقین نہیں بیٹھتا۔ بلکہ وہ شبہ جب ہی دور ہوتا ہے جب حقیقتاً شبہ دور ہو جاوے اور یقین جب ہی آتا ہے جب کہ حقیقتاً یقین آ جاوے۔ ایسی حالت میں کوئی شخص ایسی بات کرنے پر فطرتاً آمادہ نہیں ہو سکتا جو اس کے دل میں کھٹکنے والے شبہ کے برخلاف ہو۔ اسی لیے علمائے عیسائی سے نہ جہلائے عیسائی سے کہا گیا کہ اگر تم اس پر یقین رکھتے ہو تو مباہلہ کرو اور ظاہر ہو گیا کہ وہی دل میں کھٹکنے والا شبہ اس پر آمادہ نہیں کر سکتا اور ثابت ہو گیا کہ خود علمائے عیسائی کو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے اور مر کے جی اٹھنے پر سچا یقین نہیں تھا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی بجز ایسے یقین کے جو مذہبا ہوتا ہے سچا یقین نہیں ہے۔

ہم اہل اسلام کو بھی ان باتوں سے بری نہیں سمجھتے۔ ہزاروں مسلمان اس وقت موجود

ہیں جو بہت سے مسئلوں پر صرف اس وجہ سے یقین رکھتے ہیں کہ مذہبا ان پر یقین رکھنا چاہیے مگر ہو دل میں کھٹکنے والا شبہ ان کے دل میں موجود ہے۔ البتہ اسلام میں ایسے علماء اور اہل اللہ بھی گذرے ہیں جنہوں نے درحقیقت مذہب اسلام پر غور و فکر کی ہے اور حقیقتا تمام شبہات ان کے دل سے دور ہوئے ہیں اور حقیقتا ان کے دل میں یقین آیا ہے۔ ایسے محققین کو ہمیشہ لوگوں نے کافر کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں۔ مگر کچھ شبہ نہیں کہ خدا کیسا منے ان کے کفر کے مقابلہ میں دوسروں کا ایمان بجوے ہم نمی آرزد۔

....

حضرت عیسیٰ کے معجزات

سورۃ مائدہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان واقعات میں سے جو حضرت عیسیٰ پر بچپنے اور جوانی کے زمانہ میں گزرے تھے چند واقعات کا جن کا بیان سورۃ آل عمران میں بھی ہو چکا ہے بطور اپنے احسان اور اپنی نعمت کے بیان کرنا شروع کیا ہے۔ بچپنے کی حالت کو یاد دلایا ہے پھر نوعمری کے زمانہ کو یاد دلایا ہے پھر نبوت کے زمانہ کو یاد دلایا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اس طرح کا طرز کلام نہایت دلچسپ اور محبت بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کے شخص کو اس کے بچپنے کی بھولی بھولی باتیں یاد دلائی جاتی ہیں اور پھر ان کمالوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو اس نے حاصل کیا ہے ان دونوں زمانہ کی باتیں مل کر نہایت دلچسپ اور پر اثر ہو اجاتی ہین اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو دونوں زمانوں کی باتوں کو یاد دلایا ہے اور یوں فرمایا ہے کہ تو اس بات کو یاد کر جب کہ تو نے بچپنے میں گفتگو کی۔ تو اس بات کو یاد کر جب کہ میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت سکھائی۔ تو اس وقت کو یاد کر جب کہ تو مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتا تھا اور ان میں پھونکتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جاویں گے۔ تو اس وقت کو یاد کر جب کہ تو اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتا تھا۔ تو اس وقت کو یاد کر جب کہ تو مونے کو زندہ کرتا تھا تو اس وقت کو یاد کر جب کہ میں نے تجھ کو بنی اسرائیل سے بچایا۔ اس وقت کو یاد کر جب کہ میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ مجھ پر اور تجھ پر ایمان لاویں۔ تو اس وقت کو یاد کر جب کہ تجھ سے حواریوں نے آسمان پر سے رزق اترنے کی درخواست کی۔ تو اس وقت کو بھی یاد رکھ جب کہ میں تجھ کو اس شرک کے الزام سے

جو تیری امت نے تجھ پر دھرا ہے بری کروں گا۔ان باتوں کے سوا سورۃ آل عمران میں ایک اور بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی (یعنی احکام) لے کر آیا ہوں اور یہ بھی کہا کہ میں تم کو بتلاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔

یہ سب بارہ باتیں ہیں جن کو ہم ایک سلسلے میں جمع کر کے ہر ایک کا ترتیب سے جدا جدا بیان کریں گے۔اول تکلم فی المہد۔دوم خلق طیر۔سوم تائید روح القدس۔چہارم تعلیم کتاب وحکمت۔پنجم خدا کی نشانی لانا۔ششم حواریوں کے دل میں ایمان کا ڈالنا۔ہفتم اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا۔ہشتم موتے کو زندہ کرنا۔نہم اخبار عن الغیب۔دہم مائدہ یازدہم بنی اسرائیل سے بچانا۔دوازدہم برات عن المشرکین۔

اول: تکلم فی المہد

اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا ہے

"ویکلم الناس فی المهد و کهلا"

اور سورۃ مائدہ میں فرمایا

فـا شـارت الیـه قالو کیف تکلم من کان فی المهد صبیا قال عبدالله اتانی الکتاب و جعلنی نبیا."

ان آیتوں میں صرف لفظ مہد کا ہے جس پر بحث ہو سکتی ہے مگر مہد سے صرف صغر سنی کا زمانہ مراد ہے نہ وہ زمانہ جس میں کوئی بچہ مقتضائے قانون قدرت کلام نہیں کر سکتا اس مضمون پر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔

دوم: خلق طیر

یہ اس حالت کا ذکر ہے جب کہ حضرت عیسیٰ بچے تھے اور بچپنے کے زمانہ میں بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اس کی نسبت خدا نے سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں فرمایا ہے کہ

''انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فیکون طیرا باذن اللہ''

اور سورۃ مائدہ میں یوں فرمایا ہے

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرا باذنی.''

سورۃ آل عمران میں یہ مضمون حضرت عیسیٰ کی زبان سے متکلم کے صیغوں میں بیان ہوا ہے اور سورۃ مائدہ میں خدا کی طرف سے مخاطب کے صیغوں میں۔ مگر سورۃ آل عمران میں اس آیت سے پہلے یہ آیت ہے کہ

''انی قد جئتکم نایۃ من ربکم

اور اسکی نسبت ہم نے ثابت کیا ہے کہ وہ سوال کے جواب میں ہے اسی سیاق پر یہ آیت ہے اور سوال کے جواب میں واقع ہوئی ہے تقدیر کلام کی یہ ہے کہ کسی شخص نے حضرت عیسیٰ کو مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتے دیکھ کر پوچھا کہ

'ما تفعل '؟ قال مجیبالہ یانی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر الخ''.

تاریخ سے بھی پایا جاتا ہے کہ جانوروں کی مورتیں بنانے کی نسبت لوگوں نے

حضرت عیسیٰ سے سوال بھی کیا تھا جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

اب اس پر بحث یہ ہے کہ کیا درحقیقت یہ کوئی معجزہ تھا اور کیا درحقیقت قرآن مجید سے ان مٹی کے جانوروں کا جاندار ہوجانا اور اڑنے لگنا ثابت ہوتا ہے۔ تمام مفسرین اور علمائے اسلام کا جواب یہ ہے کہ ہاں۔ مگر ہمارا جواب ہے کہ نہیں۔ بشرطیکہ دل و دماغ کو ان خیالات سے جو قرآن مجید پر غور کرنے اور قرآن مجید کا مطلب سمجھنے سے پہلے عیسائیوں کی صحیح و غلط روایات کی تقلید سے بیٹھا لیے ہیں خالی کر کے نفس قرآن پر بنظر تحقیق غور کیا جاوے۔

سورۃ آل عمران میں یہ الفاظ ہیں کہ

انی خلق لکم من الطین کھیئة الطیرا فانفخ فیه فیکون طیرا باذن الله.

اس کے معنی یہ ہیں کہ مٹی سے پرندوں کی مورتیں بتاتا ہوں پھر ان میں پھونکوں گا تاکہ وہ اللہ کے حکم سے پرند ہوجاویں۔ یہ بات حضرت عیسیٰ نے سوال کے جواب میں کہی تھی مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پھونکنے کے بعد درحقیقت وہ پرندوں کی مورتیں جو مٹی سے بناتے تھے جاندار ہوجاتی تھیں اور اڑنے بھی لگتی تھیں۔

''فیکون'' پر جو (ف) ہے وہ عاطفہ تو ہو نہیں سکتی کیوں کہ اگر وہ عاطفہ ہو تو '' یکون طیرا'' ان کی خبر ہوگی اور اس کا عطف ''اخلق' پر ہوگا اور 'یکون طیرا' میں یکون صیغہ متکلم کا نہیں ہے اور نہ اس کلام میں کوئی ضمیر اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ اسم ان کی طرف راجع ہوسکے اس لیے'' یکون طیرا'' نحو کے قاعدہ کے مطابق یا یوں کہو کہ بموجب محاورہ زبان عرب کے کسی طرح ان کی خبر نہیں ہوسکتا ''فیکون'' کی ف، عاطفہ قرار نہیں پاسکتی۔ اب ضرور ہے کہ وہ ف تفریع کی ہو اور پھونکنے میں اور ان مورتوں کے پرند ہوجانے میں گو کہ درحقیقت کوئی

سبب حقیقی یا مجازی یا ذہنی یا خارجی نہ ہو مگر ممکن ہے کہ متکلم نے ان میں ایسا تعلق سمجھا ہو کہ اس کو متفرع اور متفرع علیہ کی صورت میں یا سبب اور مسبب کی صورت میں بیان کرے جہاں کلم مجازات کی بحث نحو کی کتابوں میں لکھی ہے اس میں صاف بیان کیا ہے کہ کلم مجازات سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ درحقیقت وہ ایک امر کو دوسرے امر کا حقیقی سبب کر دیتے ہیں بلکہ متکلم اس طرح پر خیال کرتا ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلا امر دوسرے کا امر کا حقیقی یا خارجی یا ذہنی سبب ہو۔ مگر صرف اس طرح کے بیان سے امر متفرع یا مسبب کا وقوع ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کسی اور دلیل سے نہ ثابت ہو کہ وہ امر فی الحقیقت وقوع میں بھی آیا تھا۔ اور جس قدر الفاظ قرآن مجید کے ہیں ان میں یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ وہ پرندوں کی مورتیں درحقیقت جاندار اور پرند ہو بھی جاتی تھیں۔

حضرت عیسیٰ کے زمانہ طفولیت کے حالات بہت کم لکھے گئے ہیں چاروں انجیلیں جو اس زمانے میں متعبر گنی جاتی ہیں ان میں زمانہ طفولیت کے کچھ بھی حالات نہیں ہیں یہ بات تو ممکن نہیں ہے کہ ان کے زمانہ طفولیت کے کچھ حالات ہوں ہی نہیں مگر کسی کو ان کے لکھنے پر رغبت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

حضرت عیسیٰ کے انتقال کے بہت زمانہ بعد بعض قدیم عیسائی مورخوں نے ان کے حالات زمانہ طفولیت کے لکھنے پر کوشش کی ہے اور اس وقت ہم کو دو کتابیں انجیل طفولیت کے نام سے دستیاب ہوئی ہیں جن کو حال کے عیسائیون نے نامعتمد کتابوں میں داخل کیا ہے بہرحال ان کتابوں کی روایتوں کو بھی بہت لوگ تسلیم کرتے تھے اور لوگوں میں مشہور تھیں ان دونوں کتابوں میں خلق طیر کا قصہ ان معمولی مبالغہ آمیز باتوں اور کرامتوں کے ساتھ جو ایسے بزرگوں کی تاریخ لکھنے میں خواہ مخواہ ملا دی جاتی ہیں لکھا ہوا ہے۔ یہ دونوں کتابیں انجیل اول طفولیت اور انجیل دوم طفولیت کے نام سے مشہور ہیں۔

انجیل اول طفولیت دوسری صدی عیسوی میں ناسنکس کے ہاں عیسائیوں کا ایک فرقہ ہے مروج اور مسلم تھی اور ازمنہ مابعد میں جو بھی اس کے اکثر بیانات پر اکثر مشہور عیسائی عالم یوسیس وتھاناسیس واپی فینیس وکرائی ساسٹم وغیرہ اعتقاد رکھتے تھے۔ کولیس ڈی کیسٹرڈ ایک انجیل طامسن کا ذکر کرتا ہے کہ ایشیا وافریقہ کے اکثر گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھی اور اسی پر لوگوں کے اعتقاد کا دارومدار تھا فیبر یشیس کے نزدیک وہ یہی انجیل ہے۔

انجیل دوم طفولیت اصل یونانی قلمی نسخہ سے ترجمہ کی گئی ہے جو کتب خانہ شاہ فرانس میں دستیاب ہوا تھا۔ یہ طامسن کی طرف منسوب ہے اور ابتداء انجیل مریم کے شامل خیال کی گئی ہے۔

انجیل اول میں یہ قصہ اس طرح پر لکھا ہے اور جب کہ حضرت عیسیٰ کی عمر سات برس کی تھی وہ ایک روز اپنے ہم عمر رفیقوں کے ساتھ کھیل رہے تھے اور مٹی کی مختلف صورتیں یعنی گدھے بیل، چڑیاں اور اور مورتین بنا رہے تھے۔

ہر شخص اپنی کاریگری کی تعریف کرتا تھا اور اوروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔

تب حضرت عیسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ میں ان مورتوں کو جو میں نے بنائی ہیں چلنے کا حکم دوں گا اور وہ فی الفور حرکت کرنے لگیں اور جب انہوں نے ان کو واپس آنے کا حکم دیا تو وہ واپس آئیں۔

انہوں نے پرندوں اور چڑیوں کی مورتیں بنائی تھیں اور جب ان کو اڑنے کا حکم دیا تو وہ اڑنے لگیں اور جب انہوں نے ان کو ٹھیر جانے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئیں اور اگر وہ ان کو کھانا اور پانی دیتے تھے تو کھاتی پیتی تھیں۔

جب آخر کار لڑکے چلے گئے اور ان باتوں کو اپنے والدین سے بیان کیا تو ان کے

والدین نے کہا کہ بچوں آئندہ اس کی صحبت سے احتراز کرو کیوں کے وہ جادوگر ہے اس سے بچواور پرہیز کرواوراب اس کے ساتھ کبھی نہ کھیلو۔

اورانجیل دوم میں اس طرح پر ہے۔ جب حضرت عیسیٰ کی عمر پانچ برس کی تھی اور مینہ برس کر کھل گیا تھا حضرت عیسیٰ عبرانی لڑکوں کے ساتھ ایک ندی کے کنارے کھیل رہے تھے اور پانی کنارہ کے اوپر بہہ کر چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں ٹھہر رہا تھا۔

مگراسی وقت پانی صاف اور استعمال کے لائق ہوگیا اور حضرت عیسیٰ نے اپنے حکم سے جھیلوں کو صاف کر دیا اور انہوں نے ان کا کہنا مانا۔تب انہوں نے ندی کے کنارہ پر سے کچھ نرم مٹی لی اوراس بارہ چڑیاں بنائیں اوران کے ساتھ اورلڑکے بھی کھیل رہے تھے۔

مگرایک یہودی نے ان کاموں کو دیکھ کر یعنی انکا سبت کے دن چڑیوں کی مورتیں بنانا دیکھ کر بلاتوقف ان کے باپ یوسف سے جا کر اطلاع کی اور کہا کہ دیکھ تیرالڑکا ندی کے کنارے کھیل رہاہےاور مٹی لے کراس کی بارہ چڑیاں بنائی ہیں اورسبت کے دن گناہ کررہا ہے۔

تب یوسف اس جگہ جہاں حضرت عیسیٰ تھے آیا اوران کو دیکھا تب بلا کر کہا کیوں تم ایسی بات کرتے ہو جوسبت کے دن کرنا جائزنہیں ہے۔

تب حضرت عیسیٰ نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں بجا کر چڑیاں کو بلایا اور کہا کہ جاؤاڑ جاؤاور جب تک تم زندہ رہو مجھے یادرکھو پس چڑیاں غل مچاتی ہوئی اڑگئیں۔

یہودی اس کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور چلے گئے اور اپنے ہاں کے بڑے بڑے آدمیوں سے جا کر وہ عجیب وغریب معجزہ بیان کیا جو حضرت عیسیٰ سے ان کے سامنے ظہور میں آیا تھا۔

مگر جب تاریخانہ تحقیق کی نظر سے اس پرغور کیجاتی ہے تو اصل بات صرف اس قدر

تحقیق ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ بچپنے میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں مٹی کے جانور بناتے تھے اور جیسے کبھی کبھی اب بھی ایسے موقعوں پر بچے کھیلنے میں کہتے ہیں کہ خدا ان میں جان ڈال دے گا وہ بھی کہتے ہوں گے۔ مگر ان دونوں کتابوں کے لکھنے والوں نے اس کو کراماتی طور پر بیان کیا کہ فی الحقیقت ان میں جان پڑ جاتی تھی۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی امر وقوعی نہ تھا بلکہ صرف حضرت مسیح کا خیال زمانہ طفولیت میں بچوں کیساتھ کھیلنے میں تھا۔ علمائے اسلام ہمیشہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق اخذ کرنے کے مشتاق تھے۔ اور بلاتحقیق ان روایتوں کی تقلید کرتے تھے انہوں نے ان الفاظ کی اس طرح تفسیر کی جس طرح غلط سلط عیسائیوں کی روایتوں میں مشہور تھی اور اس پر خیال نہیں کیا کہ خود قرآن مجید ان روایتوں کی غلطی کی تصحیح کرتا ہے۔

سورہ مائدہ میں بھی یہی مضمون خدا تعالیٰ نے مخاطب کے صیغوں سے دوبارہ بیان فرمایا ہے۔ مگر اس مقام پر ایسی عمدگی سے سیاق کلام واقع ہوا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس قصہ کو بعض اوقات متحق الوقوع کے ساتھ بیان کیا ہے اس پر بھی اس خاص قصہ کا وقوع کہ وہ مٹی کی مورتیں پرند ہو جاتی تھیں ثابت نہیں ہوتا۔ اس سورہ میں خدا تعالیٰ نے تمام واقعات متحقق الوقوع کو ماضی کے صیغوں سے بیان فرمایا ہے جیسے کہ

" اذ ایدتک بروح القدس". " اذ علمتک الکتاب والحکمة". اذ کففت بنی اسرائیل عنک اذ اوحیت الی الحوارلین."

مگر مٹی کی مورتوں کے پرند ہو جانے کے قصہ کو مستقبل کے صیغہ سے بیان فرمایا ہے جیسے کہ "اذ تخلق"۔ "فتنفخ"۔ "فتکون"۔ اس سیاق کے بدلنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس مضارع کے صیغہ پر 'اذا' کا اثر پہنچے گا وہ تو امر متحقق الوقوع ہو جاوے گا۔ اور جس صیغہ تک اس

کا اثر نہ پہنچے گا وہ امر غیر متحقق الوقوع رہے گا۔ اس کلام میں اذ کا اثر ''تخلق' اور'' تنفخ'' تک پہنچتا ہے اور'' تکون'' تک نہیں پہونچنا جیسا کہ ہم بیان کریں گے۔ پس ان مٹی کی مورتوں کا جان دار ہوجانا غیر متحقق الوقوع باقی رہنا ہے یعنی قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ درحقیقت وہ مٹی کی مورتیں جاندار اور پرند ہوبھی جاتی تھیں۔

اس آیت میں بھی ''فتکون'' پر کی (ف) عاطفہ نہیں ہوسکتی کیوں کہ اگر وہ عاطفہ ہوتو اس کا عطف ''تخلق'' پر ہوگا اور معطوف حکم معطوف علیہ ہوتا ہے اور معطوف علیہ کی جگہ قائم ہوسکتا ہے اور یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ اگر معطوف لیہ کو حذف کردیا جاوے اور معطوف کو اس کی جگہ رکھ دیا جاوے تو کوئی خرابی اور نقص کلام میں نہ ہونے پاوے اور اس مقام پر ایسا نہیں ہے کیوں کہ اگر معطوف علیہ کو حذف کر کے

''فیکون طیرا''

اس کی جگہ رکھ دیں تو کلام اس طرح پر ہوتا ہے کہ

'' اذکر نعمتی علیک اذ تکون طیرا''

اور یہ کلام محض مہمل اور غیر مقصود ہے۔ اب ضرور ہے کہ یہ (ف) بھی اسی طرح تفریع کی ہو جس طرح سورۃ آل عمران میں (ف) تفریع کی تھی اور اس (ف) کے ذریعہ سے ''تنفخ''، متفرع علیہ اور تکون متفرع دونوں مل کر تخلق پر معطوف ہوں گے اور تقدیر کلام یوں ہوگی

'' ا زکر نعمتی علیک اذ تنفخ فیھا فتکون طیرا''

مگر اس صورت میں

''فتکون طیرا''

صرف

''تنفخ''

پر تفریع ہوگی اور ''اذ'' کا اثر جو مضارع پر آنے سے تحقیق زمانہ ماضی کا ہے یا اس امر کو متحقق الوقوع کر دینے کا ہے ''تکون'' تک نہیں پہونچتا کیوں کہ وہ اثر اس وقت پہنچتا جب کہ ''تکون'' کی (ف) عاطفہ ہوتی اور اور اس کا عطف ''تخلق'' پر جائز ہوتا۔ اس صورت میں ''تکون'' کو محض تفریعی تعلق اپنے متفرع علیہ سے ہے اور محض تفریعی حالت اسی طرح باقی رہتی ہے جیسی کہ سورۃ آل عمران میں تھی اور اس لیے اس تفریع سے اس امر کا متفرع کا وقوع ثابت نہیں ہوتا۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یہ بات تو ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ بچپنے کی حالت میں مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتے تھے اور پوچھنے والے سے کہتے تھے ک میرے پھونکنے سے وہ پرند ہو جاویں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ پرند ہو بھی جاتی تھیں نہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے نہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ پس حضرت عیسیٰ کا یہ کہنا ایسا ہی تھا جیسا کہ بچے اپنے کھیلنے میں بمقتضائے عمر اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

سوم: تائیدِ روح القدس

اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۃ بقر میں فرمایا ہے

" وایدنا ہ بروح القدس"

اور سورۃ مائدہ میں فرمایا ہے

"اذ ایدتک بروح القدس"

اور سورہ مائدہ میں فرمایا ہے

"اذ ایدتک بروح القدس"

یہ آیتیں کچھ زیادہ تفسیر کی محتاج نہیں ہیں۔اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام موئد بتائید روح القدس ہیں۔اگر بحث ہوسکتی ہے تو حقیقت روح القدس میں ہوسکتی ہے۔تمام علمائے اسلام اس کو ایک مخلوق جداگانہ خارج از خلقت انبیاء قرار دے کر اسکو بطور ایلچی کے خدا و نبی میں واسطہ قرار دیتے ہیں اور جبرئیل اس کا نام بناتے ہیں۔ہم بھی جبرئیل اور روح القدس کو شے واحد یقین کرتے ہیں مگر اس کو خارج از خلقت انبیاء مخلوق جداگانہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس بات کے قائل ہیں کہ خود انبیاء علیہم السلام کی ملکہ خلقت میں جو نبوت ہے اور جو ذریعہ مبدا فیاض سے ان امور کے اقتباس کا ہے جو نبوت یعنی رسالت سے علاقہ رکھتے ہیں وہی روح القدس ہے اور وہی جبرئیل۔

چہارم: تعلیم کتاب وحکمت

اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا ہے

"ویعلمه الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل ورسولا الی بنی اسرائیل"

اور سورۃ مائدہ میں فرمایا ہے

"واذ علمتک الکتاب والحکمة والتورة والانجیل"

یہ دونوں مضمون واحد ہیں اور ان میں کچھ مشکلات نہیں ہیں کیوں کہ بلاشبہ تمام انبیاء کو خدائے تعالیٰ احکام وحکمت تلقین کرتا ہے اور کتاب پڑھاتا ہے اور ان کے دل میں علم کا وہ خزانہ جمع کرتا ہے جس کو وہ تمام لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

پنجم: خدا کی نشانی لانا

اس امر کی نسبت سورۃ آل عمران میں خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں فرمایا ہے

"انی قد جتکم بایة من ربکم"

ہم اس بات کی تحقیق سورۃ بقر میں لکھ چکے ہیں کہ آیت اور آیات اور آیات بینات سے خدا تعالیٰ کے احکام مراد ہوتے ہیں جو انبیا کو وحی کیے جاتے ہیں۔ پس اس مقام پر بھی ہم آیت کے لفظ کے یہی معنی قرار دیتے ہیں اور آیت سے جنس مراد لیتے ہیں نہ فرد۔ صاحب تفسیر کبیر نے بھی اس سے جنس ہی مراد لی ہے اور کہا ہے کہ

"المراد بالایة الجنس لا الفرد"۔،

مگر اس مقام کی تفسیر کرنے سے پیش تر ہم کو اس امر کا بیان کرنا چاہیے جو سورۃ آل عمران کی آیتوں کے ربط کی نسبت ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیتیں سورۃ آل عمران میں ان آیتوں کے بعد واقع ہوئی ہیں جس میں حضرت عیسیٰ کے ہونے کی بشارت ہے۔ وہ آیتیں رسولا

"الیٰ بنی اسرائیل "

تک برابر مسلسل چلی آتی ہیں مگر اس کے بعد جو آیت ہے

"انی قد جئتکم با یة من ربکم "

اس کا اور نیز اس کے بعد کی آیتوں کا بشارت کی آیات سے جوڑ نہیں ملتا۔ علمائے

مفسرین نے اس آیت کو اور نیز اسکے بعد کی آیتوں کو شامل آیات بشارت کے کیا ہے اور جوڑ ملانے کو لفظ ''قائلا'' محذوف مانا ہے یعنی ''رسولا الیٰ بنی اسرائیل قائلا انی قد جئتکم بایۃ''۔ مگر 'قال' کے بعد ''آن'' مفتوحہ آنا کسی قدر اعتراض کے لائق تھا اس لیے زجاج نے اس جگہ اوپر کی آیتوں سے جوڑ لگانے کو

ویکلم الناس رسولا''

مقدر مانا ہے اور یہ معنی قرار دیے ہیں

''ویکلم رسولا بانی قد جئتکم.''

مگر ہم کو مفسرین کے ان اقوال سے اختلاف ہے خود سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس قدر آیتیں بشارت سے متعلق تھیں وہ اس مقام پر ختم ہوگئیں جہاں فرمایا

''ورسولا الیٰ بنی اسرائیل''

اور وہ کلام منقطع ہوگیا اور

''انی قد جئتکم بایة''.

سے دوسرا کلام شروع ہوتا ہے اس لیے بشارت کی آیتوں میں تمام صیغے مستقبل کے آئے ہین جیسے

''یکلم الناس . ویعلمه الکتاب''

اور ان سب آیتوں میں حالات قبل ولادت حضرت عیسیٰ کے بیان ہوئے ہیں اور اسکے بعد صیغے متکلم کے ہیں جیسے کہ

''انی جئتکم . انی اخلق لکم. وابری الاکمه وانبئکم''

اور ان میں وہ تمام حالات مذکور ہیں جو بعد ولادت حضرت عیسیٰ واقع ہوئے ہیں۔ پس ان پچھلی آیتوں کو آیات بشارات کے ساتھ مل کر دینا بالکل سیاق کلام کے برخلاف ہے

صاحب تفسیر ابن عباس نے بھی ان آیتوں کو بشارت کی آیتوں سے منقطع کیا ہے اور تقدیر کلام کی یوں کی ہے۔

" فلما جاء هم قال انی قد جئتکم بایة"

مگراس تقدیر میں وہی نقص باقی رہنا ہے کہ 'قال' کے بعد ان 'مفتوحہ' واقع ہوتا ہے۔

مگر ہم تقدیر کلام کی اس طرح پر کرتے ہیں کہ

فلما جاء هم قال انی قد جئتکم بایة"

مگراس تقدیر میں وہی نقص باقی رہتا ہے کہ 'قال' کے بعد ان 'مفتوحہ' واقع ہوتا ہے۔

مگر ہم تقدیر کلام کی اس طرح پر کرتے ہیں کہ

فلما جاء هم قال مجیبالهم بانی قد جئتکم بایة"........

یعنی جب حضرت عیسیٰ لوگوں میں وعظ ونصیحت کرنے لگے اور خدا کے احکام سنانے لگے تو ان کی قوم نے کہا کہ تم یہ کیوں کرتے ہو۔اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا۔

"انی قد جئتکم بایة من ربکم."

یہ تقریر ہم نے اس لیے کی ہے کہ یہ مضمون

"انی قد جئتکم بایة من ربکم "

اور وہ مضمون جو سورۃ مریم میں ہے

"قال انی عبدالله اتانی الکتاب وجعلنی نبیا"

بالکل متحد ہے اور یہ پچھلا مضمون جواب میں قوم کے سوال کے واقع ہوا ہے اور یہ قرینہ ہے کہ وہ پہلا مضمون بھی قوم کے جواب میں ہے۔

متی کی انجیل میں لکھا ہے کہ جب حضرت مسیح معبد میں وعظ کر رہے تھے تو سردار امام

مشائخ ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ تو کس حکم سے یہ کام کرتا ہے اور کس نے تجھے یہ حکم دیا ہے۔ حاصل جواب مسیح یہ ہے کہ جس کے حکم سے یحییٰ غوطہ دینے والا کرتا تھا (متی باب ۲۱ ورس ۲۳، ۲۷)

اب کسی اور تفسیر کی اس مقام پر ضرورت نہیں رہی کیوں کہ جس قدر انبیاءؑ قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں وہ خدا کی طرف سے ان کے پاس احکام لاتے ہیں اس طرح حضرت عیسیٰ بھی بنی اسرائیل کی قوم پر مبعوث ہوئے تھے اور خدا کی طرف سے ان کے لیے احکام لائے تھے۔

ششم: حواریوں کے دل میں ایمان کا ڈالنا

اس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں فرمایا ہے۔

"واذا وحیت الی الحوارین ان آمنو بی وبرسولی قالوا آمنا واشهد باننا مسلمون."

تمام انبیاء پر خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت اسکے حواریوں اوراصحابوں کا پیدا کر دینا ہے۔ وہ اس کام میں مددگار ہوتے ہیں۔ رنج وتکلیف کی حالت میں ان سے تسلی ہوتی ہے اسی سبب سے خدا ان حضرت عیسیٰ کو حواریوں کا جو بدل وجان ان پر فدا تھے ایمان لانا یاد دلایا اور اپنی رحمت اوراحسان کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کے لیے کہا کہ ہم نے حواریوں کو کہا کہ میرے رسول پر ایمان لے آ ؤیعنی میں نے ہدایت کی اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ ایمان لانا خدا ہی کی ہدایت پر منحصر ہے۔

ہفتم: اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا

اس مضمون کو خدا تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے اس طرح فرمایا ہے کہ

"وابری الا کمه والابرص واحی الموتی باذن الله"

اور سورۃ مائدہ میں یوں فرمایا ہے۔

"وتبری الا کمه والابرص باذنی واذ تخرج الموتی باذنی."

علمائے اسلام کی عادت ہے کہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق بیان کرتے ہیں اس لیے انہوں نے ان آیتوں کے یہی معنی بیان کیے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے اور مردوں کو جلا دیتے تھے اور صرف تازہ مردوں ہو کو نہیں جلاتے تھے۔ بلکہ ہزاروں برس کے پرانے مردوں کو بھی جلا دیتے تھے چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے سام ابن نوح کو ان کی قبر میں سے بلایا اور وہ زندہ ہو کر قبر میں سے نکل آئے اور اسی قسم کی اور بہت سی بے ہودہ روایتیں لکھی ہیں۔

انجیلوں میں بھی اس قسم کے بہت سے معجزے حضرت مسیح کی نسبت بیان ہوئے ہیں مگر نہایت تعجب ہے کہ خود انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جب ان سے فروسیوں اور صدوقیوں نے آسمانی معجزہ طلب کیا تو انہوں نے معجزے کے ہونے سے انکار کیا (دیکھو انجیل متی باب ۱۲ ورس ۳۸ باب ۱۶ ورس ۴ انجیل مارک باب ۸ ورس ۱۲۔ انجیل

لوک باب ۱۱ ورس ۲۹) پھر کیوں کر اس قدر معجزے حضرت مسیح کی انجیلوں میں مذکور ہیں اور وہ معجزے بھی اس قسم کے ہیں کہ ان کو سن کر تعجب آتا ہے۔ کہیں دیوانے آدمیوں میں سے دیو نکلتے ہیں اور سوروں کے گلہ میں گھس کر ان کو دریا میں ڈبوتے ہیں۔ کہیں گونگے آدمیوں سے گونگا دیو نکلتا ہے کہیں کپڑا چھونے سے بیمار اچھے ہوتے ہیں اور کہیں صرف یہ کہہ دینا کہ جا تیری مراد پوری ہوئی سخت سے سخت بیماریوں کو اچھا کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اگر موجودہ انجیلوں پر تاریخانہ تحقیق سے نظر ڈالی جاوے تو اس سے زیادہ سچ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ یہودی ہمیشہ جھاڑ پھونکی کی عادت رکھتے تھے۔ بیماروں کے لیے دعائیں پڑھ کر ان کی صحت کے لیے ان پر دم ڈالتے تھے۔ لوگوں کو برکت دیتے تھے لوگ کاہنوں اور اماموں اور مقدس لوگوں کے ہاتھ چومتے، پاؤں کو ہاتھ لگانے، کپڑے کو چھونے یا بوسہ دینے سے برکت لیتے تھے جیسے کہ اب بھی رومن کیتھولک فرقہ میں رواج ہے۔ انہی کی تقلید سے مسلمانوں میں بھی اس قسم کی بہت سی باتیں رائج ہوگئی ہیں۔ اسی دستور کے موافق حضرت عیسیٰ بھی بیماروں کو دعا دیتے تھے۔ ان پر دم ڈالتے تھے برکت دیتے تھے۔ لوگ ان کے ہاتھوں کو برکت لینے کے لئے چومتے تھے۔ پس یہ ایک معمولی بات تھی۔ اس بیان کے ساتھ اس بات کو اضافہ کرنا کہ جو اس طرح کرتا تھا فی الفور چنگا ہو جاتا تھا۔ اندھے آنکھوں والے ہو جاتے تھے اور کوڑھی اچھے ہوتے تھے اسی قسم کی مبالغہ آمیز تحریریں ہیں جیسے کہ ایسے بزرگوں کے حالات لکھنے والے لکھا کرتے ہیں۔ جب کہ ہم یقین کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے معجزہ دکھانے سے انکار کیا تو کہتے ہیں کہ

"سدق کلمة الله و روح الله "

اور جب ان مبالغہ آمیز بندشوں کو پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

"هذا بهتان عظیم ور وح الله و کلمة الله بری عن ذالک."

انجیلوں میں صرف دو جگہ مردوں کے زندہ ہونے کا ذکر ہے۔ حاکم کی بیٹی کے زندہ کرنے کا قصہ میں تو خود حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ وہ مری نہیں (متی باب ۹ ورس ۲۴) متی کی انجیل جو اور انجیلوں کی نسبت زیادہ معتبر تصور ہو سکتی ہے۔ اس میں سوائے اس واقع کے اور کسی مردہ کے جلانے کا مذکور نہیں ہے۔

اور انجیل لوک میں ایک بیوہ کے بیٹے کے زندہ کرنے کا ذکر ہے جس کا جنازہ لیے جاتے تھے (ورس ۱۱) مگر اسکا کچھ ثبوت نہیں کہ درحقیقت وہ مر گیا تھا۔ بہت سے واقع ایسے گذرے ہیں کہ لوگوں نے ایک شخس کو مردہ سمجھ کر اسکی تجہیز و تکفین کی ہے اور بعد کو معلوم ہوا ہے کہ وہ شخص درحقیقت مر نہیں گیا تھا تعجب ہے کہ تمام انجیلوں میں ان واقعوں کے سوا جو نہایت مشتبہ ہیں اور کوئی واقعہ مردوں کے زندہ کرنے کا بیان نہیں ہوا۔

مسلمانوں کے حال پر اس سے بھی زیادہ افسوس ہے کہ وہ آنخضرت ﷺ کو تمام انبیائے سابقین سے افضل سمجھتے ہیں۔ انبیائے سابقین کے معجزے تو قرآن میں بتلاتے ہیں مگر افضل الانبیاء کے ایک معجزہ کا بھی ذکر قرآن مجید میں نہیں دکھاتے بلکہ برخلاف اسکے خود آنخضرت ﷺ کی زبان مبارک سے خدا نے فرمایا ہے کہ

"انما ان بشر مثلکم یوحیٰ الیی انما الھکم الہ واحد"

اور معجزے ہونے سے بالکل انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ

"قالو لولا انزل علیہ آیت من ربہ قل انما الایات عنداالله و انما ان انذیر مبین

اور ایک جگہ فرمایا

" ال املک نفسبی نفعا ولا ضرا الا مشا ء الله ولو کنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا نذیر و بشیر لقوم

یومنون

اور اسی طرح کی بہت سی آیتیں ہیں۔ پس خود ہمارے سردار نے معجزوں کی نفی کی ہے۔ پھر کس طرح ہم معجزوں کو مان سکتے ہیں۔

ہاں اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ خدا نے انسان میں ایک ایسی قوت رکھی ہے جو دوسرے انسان میں اور دوسرے انسان کے خیال میں اثر کرتی ہے اور اس سے ایسے امور ظاہ ہوتے ہیں جو نہایت عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں اور جن میں سے بعض کی علت ہم جانتے ہیں اور بہت سوں کی علت نہیں جانتے بلکہ اس کے عامل بھی اس کی علت نہیں جانتے ہیں۔ اسی قوت پر اس زمانہ میں ان علوم کی بنیاد قائم ہوئی ہے جو مسمریزم اور اسپر یچوا یلزم کے نام سے کے مشہور اور سابقین بھی اس کے عامل تھے مگر اس علم سے ناواقف تھے یا اس کو مخفی رکھتے تھے مگر جب کہ وہ ایک قوت ہے قوائے انسانی میں سے اور ہر ایک انسان میں بالقوہ موجود ہے جیسے قوت کتابت تو اس کا کسی سے ظاہر ہونا معجزہ میں داخل نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو فطرت انسانی میں سے انسان کی ایک فطرت ہے فافہم وتدبر۔

قرآن مجید میں لفظ ابری اور تبری کا ہے جس کے معنی اچھا کرنے کے بھی ہیں اور بری کرنے کے بھی ہیں۔ یہودی شریعت میں برص دوقسم کی قرار پائی تھی ایک وہ قسم تھی جو اس مرض میں بیمار ہوتا تھا یہودی اس کو ناپاک سمجھتے تھے (سفولیویان باب ۱۳ ورس ۳، ۸، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۲۰، ۲۵، ۲۷، ۳۱، ۳۶، ۴۴، ۵۲) اور ایک قسم وہ تھی جس کے مریض کو ناپاک نہیں ٹھہراتے تھے (سفر باب ۱۳ ورس ۶، ۱۴، ۱۷، ۲۳، ۲۸، ۳۵، ۳۷، ۳۹) اور جو لوگ برص سے ناپاک کیے جاتے تھے قربانی ہائے معینہ ادا کرنے کے بغیر معبد میں عبادت کے لیے داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

متی کی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ سے ایک کوڑھی نے کہا کہ اگر تو

چاہے تو مجھے پاک کرسکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے اس کو چھوا اس کا کوڑھ جاتا حضرت عیسیٰ نے اس کو کہا کہ اپنے تئیں امام کو دکھا اور جو نظر موسیٰ نے مقرر کی ہے اسے دے (باب ۸ ورس ۲، ۴) پاک کرنے کے لفظ سے صاف پایا جاتا ہے کہ اسکا مقصد یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ اس کو بتا دیں کہ ان دونوں قسموں کو کوڑھ میں سے کون سی قسم کی کوڑھ اس کو ہے۔

اندھے، لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو یا اس شخص کو جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے اور کبڑے اور ٹھنگنے اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی) سفر لیویان باب ۲۱ ورس ۱۶ الغایت ۲۴) یہ سب ناپاک اور گنہگار سمجھے جاتے تھے اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق متصور نہ ہوتے تھے۔

حضرت عیسیٰ نے تمام قدیں توڑ دی تھیں اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے ہوں یا لنگڑے چوڑی ناک والے ہوں یا پتلی ناک کے کبڑے ہوں یا سیدھے۔ ٹھنگنے ہوں یا لمبی پھلی والے ہوں یا جالے والے سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی تھی۔ کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا۔ اور کسی کو عبادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ سے نہیں روکا۔ پس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا۔ جہاں جہاں انجیلوں میں بیماروں کے اچھا کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہی مراد ہے اور قرآن مجید میں جو یہ آیتیں ہیں ان کے یہی معنی ہیں۔

انسان کی روحانی موت اس کا کافر ہونا ہے۔ حضرت عیسیٰ خدا کی وحدانیت قائم کرنے اور خدا کے احکام بتانے سے لوگوں کو اس موت سے زندہ کرتے تھے اور کفر کی موت کے پنجے سے نکالتے تھے۔ جس کی نسبت خدا نے فرمایا

"واذتخرج الموتی باذنی."

مگر ہم نے جو اس مقام پر موت سے کفر اور حیات سے ایمان مراد لیا ہے اس پر ہم کو کسی قدر بحث کرنی اور یہ ثابت کرنا کہ یہ مراد صحیح ہے ضرور ہے۔

سورۃ نمل میں خدا تعالیٰ نے کافروں پر موت کا اطلاق کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ

"انک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصمک الدعا اذا ولو مدبرین وما انت بھادی العمی عن ضلالتھم ان تسمع لا من یومن بایا تنافھم مسلمون. (سورۃ نمل). "

یعنی تو ہرگز سنا نہیں سکتا موتے کو اور نہیں سنا سکتا بحروں کو جب وہ پیٹھ پھر کر پھریں اور تو اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ پر لانے والا نہیں ہے تو نہیں سنا سکتا مگر اس کو جو ہماری نشانیوں پر ایمان لایا ہے پھر وہ مسلمان ہیں۔"

موتے کے مقابلے میں 'الامن یومن' کا لفظ واقع ہوا ہے جو صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موتے کا لفظ کافروں پر اطلاق کیا گیا ہے۔ مفسرین بھی اس مقام پر کافروں ہی سے مراد لیتے ہیں اور 'موتی' اور 'صم' اور 'اعمی' کے معنی 'کالموتے' 'کالصم' 'کالعمی' بیان کرتے ہیں۔

سورۃ فاطر میں اس سے بھی صاف طرح پر احیاء واموات کا لفظ مومن و کافر پر اطلاق ہوا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ:

"وما یستوی الا حیاء ولا الا موات ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور (سورۃ فاطر)."

یعنی برابر نہیں ہوتے احیاء یعنی زندے اور اموات یعنی مردے اللہ تعالیٰ سنا دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے اور تو نہیں سنانے والا ہے ان کو جو قبروں میں ہیں"۔

تمام مفسرین اس مقام پر بھی احیاء سے مومن اور اموات سے کافر مراد لیتے ہیں۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔

" ثـمـا قال وما یستوی الاحیاء ولا اموات مثلا آخر فی حق المومن والـکـافـر کانه قال تعالیٰ حال المومن والکافر فوق حال الاعمی والبصیر الخ."

پس آیت کے صاف معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانوں میں حضرت عیسیٰ کے اس وقت کو یاد دلایا جب کہ وہ خدا کے حکم سے کافروں کو ایمان والا کرتے تھے خصوصا ایسی حالت میں کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کے لیے نبی ہوئے تھے مگر وہ اورلوگوں کو بھی جو بنی اسرائیل نہ تھے ہدایت کرتے تھے اور ایمان میں لاتے تھے۔ اسی حال کی نسبت خدا نے فرمایا۔

"واذ تـخـرج الـموتی باذنی " یعنی "واذ تخرج الکافر من کفرة باذ نی"

نہم: اخبار عن الغیب

اس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے فرمایا ہے کہ

"وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم ان فی ذالک لایۃ لکم ان کنتم مومنین."

علمائے مفسرین نے جو اپنی تفسیر میں عجیب ولایعنی باتوں کا لکھنا اپنا فخر سمجھتے ہیں اس آیت کی بھی تفسیر عجیب وغریب کی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ چھٹپنے ہی سے مخفی باتوں کی خبر دے دیا کرتے تھے لڑکوں کو جن کے ساتھ کھیلتے تھے بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور تمہارے ماں باپ نے فلاں چیز (مثلاً مٹھائی) تم سے چھپا کر رکھ چھوڑی ہے وہ لڑکے گھر میں آکر ماں باپ سے ضد کرتے آخر کو وہ چیز نکلتی تھی اور وہ لے لیتے تھے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ جب مائدہ نازل ہوا تو اس میں کے کھانے کو جمع کرنے کا حکم نہ تھا مگر لوگ جن مائدہ اترا تھا اس کو جمع کر رکھتے تھے اور حضرت عیسیٰ بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا جمع کیا ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء جو نہایت اعلیٰ درجہ کا علم وفضل رکھتے تھے کیوں کر ایسی بے ہودہ باتیں لکھ گئے ہیں آیت نہایت صاف ہے اور اس کا مطلب نہایت روشن ہے یہود اور علمائے یہود طرح بہ طرح کے حیلوں اور فریبوں سے ناجائز طور پر لوگوں کا مال مارتے تھے، لوگوں کا مال کھاتے تھے اپنے گھروں میں مال مار مار کر روپیہ دولت جمع کرتے تھے جو

بالکل حرام وناواجب تھا خود خدا تعالیٰ نے سورۃ نساء میں یہودیوں کی نسبت فرمایا ہے۔

”واخـذهـم الـربـوا وقـد نهـو عـنـه واكـلـهم اموال الناس بالباطل و اعتدناللكافرين عذابا اليما.“ (۵۹)

اور سورۃ توبہ میں فرمایا ہے کہ

” يـاايهـا الـذيـن آمـنـو ان كثيـرا من الاخبار الرهبان لياكلون اموال الـناس با لباطل ويصدون عن سبيل الله والذين يكنزون الذهب الفضة ولا ينفقونها فى سبيل الله فبشرهم بعذاب اليهم.“ (۳۴)

پس اسی حرام خوری اور حرام کا مال جمع کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ میں تم کو بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو۔ اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو یعنی بتادوں گا کہ حرام کا مال مارتے ہو اور حرام کی دولت اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو نہ کہ یہ بتادوں گا کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا گھر میں رکھا ہے۔

یہ ایسی صاف وصریح آیت ہے جس کی تفسیر خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں موجود ہے مگر افسوس ہے کہ علمائے اسلام نے اس کو بھی ایک افسانہ اور خیالی معجزہ کر کے بیان کیا ہے مگر جس کو خدا نے بصیرت دی ہے وہ صاف سمجھتا ہے کہ نہایت صاف وصریح یہ آیت ہے اور اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔

دہم: نزولِ مائدہ

سورۃ مائدہ میں ذکر ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ خدا سے دعا کریں کہ آسمان پر سے ان کے لیے کھانا اترے۔ حضرت عیسیٰ نے دعا مانگی۔ خدا نے کہا کہ میں تم پر کھانا اتاروں گا لیکن اگر اس کے بعد کسی نے کفر کیا تو میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ کسی کو نہ دیا ہوگا۔

ہمارے مفسروں نے ان آیتوں کی تفسیر میں نزول مائدہ کی نسبت بہت سے بے سرو پا قصے اور کہانیاں لکھی ہیں جن میں ایک بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کے لفظوں سے ان قصوں کی تائید ہوتی ہے اور نہ ان کی نسبت کوئی اشارہ پایا جاتا ہے۔

تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف اور اسی طرح اور تفسیروں میں بھی مائدہ اترنے کے بعد کوئی کفر کرے گا تو اس کو سخت عذاب ہوگا تو انہوں نے کہا کہ ہم مائدہ کا اترنہیں چاہتے۔ پس کوئی مائدہ نہیں اترا۔ کشاف میں لکھا ہے کہ حضرت حسن بصری نے کہا کہ

”واللہ مانزلت.“

قرآن مجید میں بھی نہیں بیان کیا گیا ہے کہ بعد اس گفتگو کے مائدہ اترا تھا بلکہ اترنے کا ذکر نہ ہونا جس کے ذکر ہونے کا موقع تھا۔ کافی دلیل اس بات پر یقین کرنے کی ہے کہ نزول مائدہ ہرگز وقوع میں نہیں آیا۔

حضرت عیسیٰ کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ بنی اسرائیل میں یہودیت شدت سے پھیلی ہوئی تھی۔ یہودیوں کی عادت تھی کہ انبیا سے اس قسم کی خواہشیں کیا کرتے تھے۔ اٹھترویں

زبور سے پایا جاتا ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگل میں تھے تو یہ لفظ انہوں نے بھی کہے تھے کہ ''آیا می شود کہ خدا در بیان سفر را آمادہ گرداند۔'' (زبور ۷۸ ورس ۱۹) اس کے بعد خدا نے ان پر من وسلویٰ نازل کیا تھا۔ اسی طرح حواریوں نے بھی حضرت عیسیٰ سے کہا

''هل يسطيع ربک ان ينزل علينا مائدة من المساء''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مائدہ سے ان کی مراد پکا پکایا کھانے سے نہ تھی بلکہ کھانے کی چیزوں کے موجود ہونے سے تھی۔

یہ سوال ایک ایسی طبیعت سے نکلا تھا جو یہودیوں کے خیالات سے بھری ہوئی تھی اس کا جواب بلحاظ ان کی طبیعت کے اس سے زیادہ عمدہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا کہ خدا کہتا کہ میں تمہارا سوال پورا کروں گا۔ مگر اس کے بعد جو کوئی گناہ کرے گا تو اسکو سخت عذاب دوں گا۔ یہودی ان مصیبتوں سے واقف تھے جو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے اور جنگلوں میں پھرنے کے وقت پڑی تھیں حوارییں نے ضرور اس جواب سے خوف کیا ہوگا اور سوال سے باز آئے ہوں گے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا روایت سے پایا جاتا ہے۔ مروجہ انجیلوں میں یہ قصہ مذکور نہیں ہے مگر کوئی شک کرنے کی جگہ نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ کے تمام حالات اور واقعات ان انجیلوں میں مذکور نہیں ہیں۔

یازدہم: بنی اسرائیل سے بچانا

اس کا بیان خدا تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں اس طرح پر کیا ہے۔

واذ کففت بنی اسرائیل عنک اذا جئتھم بالبینات فقال الذین کفروا منھم ان ھذا الا سحر مبین.

ہمارے مفسرین جو کففت سے یہ معنی نکالتے ہیں کہ خدا نے حضرت عیسیٰ کو یہودیوں کے ہاتھ سے بچایا اوران کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔خود اسی آیت سے غلط ثابت ہوتے ہے کیوں کہ کافر آسمان پر زندہ چلے جانے کو اسی وقت کھلا ہوا جادو کہتے جب وہ یقین کرتے کہ وہ زندہ آسمان پر چلے گئے حالاں کہ وہ لوگ اس بات کا یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کو یقین ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو صلیب پر قتل کیا اور اس تفسیر پر کافروں کا یہ قول

"ان ھذا الا سحر مبین"

صحیح نہیں ہوسکتا اور اگر کافروں کے اس قول کو تبلیغ احکام سے منسوب کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ حضرت مسیح کے پراثر بیان کی نسبت کافروں نے یہ کہا تھا تو پھر

"کففت"

سے حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھالینے سے مراد لینے کی جیسے کہ مفسرین نے لی ہے کوئی وجہ نہیں ہے۔

آیت کا صرف مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ خدا کے احکام لے کر بنی اسرائیل کو سمجھانے کو گئے تو انہوں نے حضرت عیسیٰ کو مارنے یا تکلیف دینے کا ارادہ کیا خدا نے اس

سے ان کو روکا اور حضرت عیسیٰ محفوظ رہے جس کو یا ان کے وعظ کو کافروں نے کہا کہ

"ان الا سحر مبین."

متی کی انجیل میں بھی اس واقعہ کا نشان پایا جاتا ہے جب کہ حضرت عیسیٰ گدھے پر سوار ہو کر بیت المقدس خدا کے احکام سنانے کو گئے اور بہت سے بدعت کے کاموں سے منع کیا اور وہاں کے عالموں کو لاجواب کیا اور متعدد تمثیلیں بیان کیں اور اخیر کو فرمایا کہ "میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے چھن جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے میوؤں کا لا دے دی جاوے گی (بے شک بنی اسماعیل) اور جو کوئی اس پتھر پر گرے گا کچل جائے گا اور جس پر یہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ جب سردار اماموں اور فروسیوں نے اس کی تمثیل سنیں انہوں نے معلوم کیا کہ وہ انہی کے حق میں کہتا ہے تب انہون نے چاہا کہ اسے پکڑ لیں پر وے لوگوں سے ڈرے کیوں کہ وے اسے نبی جانتے تھے (باب ۲۱) پس یہی واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اس آیت کو حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر چلے جانے سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

دوازدہم۔ برات عن المشرکین

اس مضمون کی آیتیں سورہ مائدہ کے آخیر میں آئی ہیں اور نہایت عمدہ اور دلچسپ اور دل پر اثر کرنے والی ہیں ان میں حضرت مسیح کے خدا نہ ہونے اور حضرت مسیح کا اپنے تئیں خدا نہ کہنے کا اور جو ان کو خدا کہتے ہیں ان سے بے زار ہونے کا بیان ہے مگر ہو مطلب نہایت فصاحت و بلاغت سے خود حضرت مسیح کی زبان سے ادا کیا گیا ہے اس کے ہر ہر لفظ سے اندرونی تہذیب اور اخلاقی شائستگی اور خائے واحد ذولجلال کا ادب اور اس کی اعلیٰ قدری اور اس کے سامنے اپنا عجز وانکسار پایا جاتا ہے۔ یہ طرز کلام ایسا عمدہ ہے کہ پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں پر نہایت درجہ کا اثر کرتا ہے اور اس کی سچائی لفظوں کے ساتھ دل میں بیٹھتی جاتی ہے۔

اس مقام پر اشارہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں حضرت مریم دونوں کو خدا مانتے تھے یہ عقیدہ رومن کیتھولک چرچ کے پیٹرنوں کا تھا انہوں نے ورجن میری حضرت مریم کو خدا کا درجہ دیا تھا اور خدا کی سی تعظیم وادب کے قابل ٹھہرایا تھا اور حضرت مسیح سے برتر ان کا رتبہ سمجھتے تھے اور دسویں صدی عیسوی میں حضرت مریم کی خاص پرستش شروع ہوگئی تھی اور روز وشنبہ حضرت مریم کی پرستش کا دن قرار پایا تھا اور اسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ

”یا عیسیٰ ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون الله.“

پس اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کل عیسائیوں کا حضرت مریم کی نسبت یہ عقیدہ

ہے بلکہ حضرت مریم کی نسبت صرف انہی عیسائیوں کے عقیدہ کی طرف اشارہ ہے جن کو وہ عقیدہ تھا۔

....

غزوہ بدر کا واقعہ

قرآن حکیم میں

جنگ بدر کے واقعہ پر مخالفین اسلام نے بہت کچھ الزام لگائے ہیں جن کی نسبت بالتفصیل ہم بحث کریں گے لیکن اول مختصراً اس واقعہ کو بلا کسی قابل بحث اشارہ کے لکھتے ہیں اور اس کے بعد اس کی بحث طلب جزئیات کو بیان کریں گے۔

بدر کا محل وقوع:

بدر ایک چشمہ کا نام ہے جو وادی صفرا کے اخیر ینبوع کے قرب بحر احمر کے کنارے کے پاس مدینہ سے تین منزل پر واقع ہے۔ اس چشمہ کے سبب سے وہ مقام مشہور ہو گیا ہے ا۔ عرب میں پانی کی نہایت قلت ہے اور جہاں کہیں چشمہ ہوتا ہے وہ جگہ مشہور اور نہایت عزیز ہو جاتی ہے۔ آنحضرت کی جس لڑائی کا سورۃ انفال میں ذکر ہے وہ اسی مقام پر ہوئی تھی اور اسی لیے جنگ بدر کا نام سے مشہور ہے۔

قافلہ قریش:

شام کے ملک سے قریش کا ایک قافلہ جس میں تیس چالیس آدمی تھے ابی سفیان کے ساتھ بہت سا مال و اسباب لیے ہوئے مکہ کو آتا تھا۔ انہی دنوں مکہ کے قریش نے بہت سے آدمی لڑائی کے لیے جمع کیے اور مکہ سے کوچ کیا۔ انہی دنوں میں

۱ . بدر بالفتح ثم السكون ماء مشهور بين مكة والمدينة اسفل وادی الصفراء بينيه و بين الجار وهو ساحل البحر ليلة به الواقعه المشهورة

بين النبی صلعم واهل مكة . (مراد صد الاطلاع)

رسول خدا ﷺ نے تین سولڑنے والے لوگوں کے ساتھ مدینہ سے کوچ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقام بدر پر آنحضرت ﷺ اور مکہ کے قریش سے لڑائی ہوئی۔ یہ واقعہ ۲ ہجری میں واقع ہوا۔

قریش کی پیش قدمی کا سبب:

اب چند امور اس میں بحث طلب ہیں۔ اول یہ کہ، مکہ کے قریش نے کیوں لڑائی کے لیے لوگ جمع کیے تھے اور کیوں لڑنے کے ارادہ سے نکلے تھے۔ تمام مسلمان مورخ لکھتے ہیں کہ قریش مکہ کو یہ خبر پہنچی تھی کہ آنحضرت ﷺ کا ارادہ ابی سفیان والے قافلے کو لوٹنے کا ہے اس لیے انہوں نے اس قافلہ کے بچانے کو لوگ جمع کیے اور لڑائی کے ارادہ سے نکلے۔

اگر یہ روایتیں صحیح مان لی جاویں تو بھی یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو خبر ان کو پہنچی تھی وہ صحیح تھی اور در حقیقت آنحضرت ﷺ کا ارادہ اس قافلے کو لوٹنے کا تھا۔ علاوہ اس کے جب کہ قریش مکہ نے بہت سے لڑنے والے آدمی جمع کر کے لڑائی کے ارادہ پر کوچ کیا تھا تو اس بات کا کسی طرح سے یقین نہیں ہوسکتا کہ ان کا ارادہ صرف اسی قافلہ ہی کی حفاظت کا تھا اور خاص مدینہ پر چڑھائی کرنے کا نہ تھا۔ بلکہ دو دلیلیں ایسی صاف ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ان کا ارادہ اس سے زیادہ تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے اس قدر جمع کیے تھے اور لڑائی کا سامان اور نفیر عام اس طرح پر کی تھی جو قافلہ کی حفاظت کی ضرورت سے بہت زیادہ تھی اور جب کہ

وہ قافلہ خدشہ کے مقام سے بچ کر نکل گیا اس وقت بھی انہوں نے کوچ کو اور لڑائی کے ارادہ کو موقوف نہیں کیا اور اگر فرض کیا جاوے کہ ان کا ارادہ اس قافلہ ہی کے بچانے کا تھا تب بھی اہل مدینہ کو کسی طرح اس بات پر طمانیت نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کا ارادہ مدینہ پر حملہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ جو عداوت اہل مکہ کو مہاجرین اور مدینہ کے انصار سے تھی اور جس پر حملہ کرنے اور غارت کرنے کی وہ ہمیشہ دھمکی دیتے تھے اور اس کے خواہش مند بھی تھے وہ ایک قومی دلیل اس خیال بلکہ یقین کرنے کی تھی کہ وہ ضرور مدینہ پر بھی حملہ کریں گے۔

دوسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ نے کیوں مدینہ سے بقصد جنگ کوچ کیا تھا۔ تمام مسلمان مورخوں کا جن کی عادت میں داخل ہے کہ بلا سند روایتوں اور غلط و صحیح افواہوں کو بلا تصحیح و تنقید اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں اور انہی پر بناء واقعات قائم کرتے ہیں یہ قول ہے کہ آنحضرت اور ان کے صحابہ نے یہ بات خیال کر کے کہ ابی سفیان کے ساتھ کے قافلہ میں لوگ بہت تھوڑے ہیں اور مال بہت زیادہ ہے، لوٹ لینے کا ارادہ کیا تھا اور اسی وجہ سے کوچ کیا تھا۔ اس کی خبر جب قریش مکہ کو پہنچی تو انہوں نے نفیر عام کی اور قافلہ کے بچانے کو نکلے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قریش کے ساتھ لڑنے اور ان کے قافلہ کو لوٹنے کا قصد اول آنحضرت ﷺ کیا اور اس کے دفع کرنے کو قریش بقصد لڑائی نکلے۔

کیا مسلمان قافلہ قریش کو لوٹنا چاہتے تھے:

ان مسلمان مورخوں کی نادانی اور غلطی سے مخالفین مذہب اسلام کو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی نسبت قافلوں کے لوٹنے کا جو پیغمبر کی شان کے شایاں نہیں ہیں اور بلا سبب لڑائی کی ابتداء کرنے کے الزام لگانے کا موقع ہاتھ آیا ہے اور بہت زور شور سے ان الزاموں کو قائم کیا ہے لیکن اس زمانہ کی حالت پر اور جو طریقہ دشمنوں کے ساتھ پیش آنے کا اس زمانہ

میں بلا اعتراض کے مروج تھا اگر اس پر لحاظ کیا جاوے تو ایسا کرنے میں بھی اگر کیا گیا ہو۔ کوئی مقام اعتراض کا نہیں ہوسکتا اور اگر ہم اس طریقہ تعجب انگیز کا جو حضرت موسیٰ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ اختیار کیا تھا، اس کے ساتھ مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اگر ایسا کیا گیا بھی ہوتو حضرت موسیٰ کے برتاؤ سے بہت ہی خفیف درجہ رکھتا ہے۔

مگر درحقیقت یہ الزام محض غلط اور بے بنیاد ہیں اور وہ حدیثیں اور روایتیں جن کی بناء پر وہ الزام قائم کیے ہیں از سرتا پا غلط اور غیر مستند ہیں۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ نہایت صفائی سے مندرج ہے اور اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ کس گروہ کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ نے مقابلہ کے قصد سے کوچ فرمایا تھا۔ آیا قافلہ لوٹنے کے ارادہ سے یا اس گروہ کے مقابلہ کے لیے جس کو قریش مکہ نے لڑنے کے ارادے سے جمع کر کے کوچ کیا تھا اور آنحضرت ﷺ کا کوچ فرمانا قریش مکہ کے کوچ کرنے کے بعد ہوا تھا یا اس کے قبل ہوا تھا۔

یہ الزام محض غلط ہے:

ہم قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کریں گے کہ آنحضرت ﷺ کا خیال بھی اس قافلہ کے لوٹنے کا نہ تھا اور قریش مکہ کے بقصد جنگ فوج کثیر کے ساتھ کوچ کرنے کے بعد جس سے ہر طرح مدینہ پر ان کا ارادہ حملہ کرنے کا پایا جاتا تھا اور ادنیٰ درجہ یہ کہ بوجہ قوی احتمال ہوتا تھا مدینہ کی حفاظت کی غرض سے کوچ کیا تھا اور جب کہ قرآن مجید کی آیتوں سے یہ امر ثابت ہوتا ہے تو کوئی روایت یا کوئی حدیث جو اس کے برخلاف ہو اور کسی کتاب میں مندرج ہو اور کسی نے روایت کی ہو عقلا ونقلا مردود ہے۔ عقلا میں نے اس لیے کہا کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہین اگر صرف تاریخانہ اصول پر نظر رکھیں تو بھی وہ اس بات کو تسلیم کریں گے یہ زبانی روایتیں جو ایک زمانہ بعد تحریر میں آئین قرآن مجید کے مقابلہ میں جب کہ ان

دونوں میں اختلاف ہو قابل قبول اور لائق وثوق نہیں ہوسکتیں۔

سورۃ انفال کی پانچویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آنحضرت ﷺ اپنے گھر یعنی مدینہ ہی میں تھے اور وہاں سے کوچ بھی نہیں کیا تھا کہ آپس میں صحابہ کے اختلاف تھا۔ بعض تو لڑنے کے لیے نکلنا پسند کرتے تھے اور بعضے ناپسند کرتے تھے جو لوگ لڑنے کے لیے نکلنا ناپسند کرتے تھے اس کی وجہ چھٹی آیت میں بیان ہوئی ہے کہ ''گویا وہ موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں اور وہ اپنے مارے جانے کو دیکھتے ہیں۔''

ادنیٰ تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی سفیان کا قافلہ جو شام سے آتا تھا اس میں نہایت قلیل آدمی تھے ان سے لڑنے کے لیے کوچ کرنے میں اور اسکے لوٹنے میں ایسی کوئی خوف کی بات نہ تھی، بلکہ یہ خوب قریش مکہ کی اس فوج سے تھا جو انہوں نے نفیر عام کے بعد جمع کی تھی اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قبل اس کے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ سے کوچ فرماویں قریش مکہ لڑنے کو نکل چکے تھے یا آمادہ جنگ ہو چکے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اس آمادگی جنگ کے بعد اور مدینہ سے کوچ کرنے سے قبل بعض صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ شام کے قافلہ کو لوٹ لیا جاوے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مورخوں اور راویوں نے اس رائے کو جو بعض صحابہ نے دی تھی غلطی سے اس طرح پر بیان کیا ہے کہ گویا پیغمبر خدا ﷺ کا ارادہ قافلہ کو لوٹنے ہی کا تھا اور جو آمادگی جنگ مدینہ میں ہوئی تھی وہ قافلہ کے لوٹنے کے لیے ہوئی تھی۔ زمانہ دراز کے بعد کسی واقعہ کے بیان میں جو افواہی چلا آتا ہو اس قسم کی غلطی کا واقعہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے مگر قرآن مجید سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زبانی روایتیں غلط ہیں بلکہ جو آمادگی جنگ کی مدینہ میں ہوئی تھی وہ بمقابلہ قریش مکی کے ہوئی تھی نہ واسطے لوٹنے قافلہ کے۔

اسی سورۃ کی چھٹی آیت میں جو جملہ آیا

"بعد ماتبین."

آیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر منکشف کر دیا تھا کہ اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ہوگی۔ اس کے بعد ساتویں آیت میں دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ گروہ جس کے ساتھ کچھ شان و شوکت یعنی لڑائی کا سامان نہ تھا، اس گروہ سے وہ قافلہ مراد ہے جو شام سے آتا تھا اور جس کے ساتھ صرف تیس چالیس آدمی تھے اور دوسرا گروہ قریش مکہ کا تھا جس کے ساتھ بہت سا لشکر اور بہت کچھ شان و شوکت تھی۔ خدا نے کہا کہ ان دونوں گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارے لیے ہے تم اس بے شان و شوکت گروہ کو لینا چاہتے ہو مگر خدا چاہتا ہے کہ جو حق بات ہے یعنی دین اسلام وہ ثابت ہو جاوے اور کافروں کی جڑ کٹ جاوے پس اس آیت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ لڑنے کا حکم قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے تھا نہ اس قافلہ کے لوٹنے کے لیے۔

ساتویں آیت سے چھٹی آیت کے مضمون کی بھی زیادہ تشریح ہوتی ہے کہ بعض صحابہ جو لڑائی کے لیے نکلنے کو ناپسند کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جاتا ہے اور وہ اپنے مارے جانے کو دیکھ رہے ہیں اس خوف کا سبب یہی تھا کہ ان کو قریش مکی کے مقابلہ میں نکلنے کا حکم ہوا تھا جو لشکر کثیر کے ساتھ لڑائی کو نکلا تھا اور جس سے یقین یا احتمال قوی مدینہ پر اور مہاجرین اور انصار پر حملہ کرنے کا تھا نہ اس قافلہ پر حملہ کرنے کا جس کے ساتھ کچھ شان و شوکت یعنی سامان جنگ نہ تھا۔

بیان مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود قرآن مجید سے مندرجہ ذیل امر ثابت ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ مدینہ ہی میں اور مدینہ سے کوچ کرنے سے پہلے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ قریش مکہ لشکر کثیر کے ساتھ جنگ کے ارادہ سے نکلے ہیں۔

دوسرے یہ کہ مدینہ ہی میں خدا نے حکم دے دیا تھا کہ قریش مکہ کے مقابلہ میں لڑنے کو جاؤ اور جن صحابہ نے اس درمیان میں قافلہ لوٹنے کی رائے دی تھی خود خدا تعالیٰ نے مدینہ ہی اسکو نامنظور کیا تھا۔

اب ہم اگر ان روایتوں پر جو قرآن مجید کے برخلاف نہیں اعتبار کریں تو معلوم ہوتا ہے اور جو واقعات پیش آئے ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ سے جو لوگ لڑنے کو نکلے وہ قریش مکہ کے مقابلہ ان کے حملہ کے دفع کرنے کے لیے نکلے تھے نہ قافلہ لوٹنے کے لیے۔

سیرت ہشامی میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ سے مکہ کی طرف کوچ فرمایا اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوچ قریش مکہ کے مقابلہ میں تھا نہ شام کے قافلہ پر کیونکہ وہ قافلہ شام سے آتا تھا جو مدینہ سے جانب شمال واقع ہے اور مکہ جانب غرب پڑتا ہے۔ پس اگر قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے کوچ کیا جاتا تو مدینہ سے غرب کی جانب کا راستہ اختیار کیا جاتا نہ جنوب کا۔

"قال ابن اسحاق طریقة من المدینة الی مکة." (صفحہ ۴۳۳)

سیرت ہشامی میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ سے نکل کر نقب المدینہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے عقیق میں، وہاں سے ذوالحلیفہ میں، وہاں سے اولات الجیش میں یا ذات الجیش میں وہاں سے تربان میں وہاں سے ملل میں وہاں سے غمیس الحمام میں، وہاں سے صخیرات الیمام میں، وہاں سے سیالہ میں، وہاں سے فج الرجاء میں وہاں سے شنوکہ میں اور جب عرق الظبیہ میں پہنچے تو وہاں ایک عرب ملا (غالبا مکہ سے آنے والا تھا) اس سے لوگوں کا حال پوچھا مگر اس نے کچھ نہیں بتلایا پھر آنحضرت ﷺ وہاں سے چل کر سجسج میں ٹھہرے پھر وہاں سے چلے اور جب منصرف میں پہنچے تو بائیں طرف مکہ کا راستہ چھوڑ دیا اور دائیں طرف پھرے اور نازیہ ہو کر بدر جانے کا ارادہ کیا اور رحقان اور وہاں سے مضیق

الصفرا میں پہنچے اور بسبس بن عمرالجھنی اور عدی بن الرغباءالجھنی کو ابوسفیان کی اور اور لوگوں کی (یعنی قریش مکہ کی) خبر دریافت کرنے کو روانہ کیا اور مضیق الصفرا کو بائیں طرف چھوڑ کر دائیں طرف چلے اور وادی ذفران میں پہنچے وہاں قریش کے آنے کی خبر ملی۔

ذفران کے مقام میں آنحضرت ﷺ نے تمام لوگوں سے جن میں انصار بھی شامل تھے قریش کے بڑھے چلے آنے کی خبر کی اور سب کو لڑنے مرنے پر مستعد پایا تب آنحضرت ﷺ وہاں سے ثنایا یعنی اصافر پر گئے اور وہاں سے خبر ملی کہ قریش مکہ کا لشکر یہاں سے بہت قریب پڑا ہوا ہے آخر کار دونوں لشکروں میں لڑائی ہوئی۔

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے پہلے شام کا قافلہ جس کے ساتھ ابی سفیان ابن حرب تھا سمندر کے کنارے کنارے ہو کر نکل گیا تھا اور بدر میں نہیں آیا تھا۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ:

فخرج ابو جهل بجميع اهل مكة وهم النفيبر فى المثل السايرلا فى العير ولا فى النفير فقيل له، العير اخذت طريق الساحل و تجت فارجع الى مكه بالناس فقال لا والله لايكونل ذالك ابدا. (تفسير كبير جلد ۳ صفحه ۳۶۴).

یعنی جب ابوجہل مکہ سے لوگوں کو لے کر نکلا تو اس سے کہا گیا کہ قافلہ نے سمندر کے کنارہ کا رستہ لیا اور بسلامت چلا گیا۔ اب مکہ کو پھر چلو اس نے کہا کہ خدا کی قسم ایسا نہ ہوگا۔

پس یہ تمام واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مدینہ سے آنحضرت ﷺ کا لڑائی کے لیے نکلنا صرف قریش مکہ کے مقابلہ میں اور ان کے حملہ کے دفع کرنے کی غرض سے اور مدینہ کو جہاں مہاجرین نے پناہ لی تھی اور مہاجرین اور انصار کو قریش کے حملہ سے بچانے کے لیے تھا۔ ہر ایک لائق شخص جس کو خدا نے معاملات جنگ کے سمجھنے کی لیاقت دی ہو بخوبی سمجھ سکتا

ہے کہ اگر حملہ آور قریش مدینہ کی دیواروں تک پہنچ جاتے تو ان کا روکنا اور ان کے حملہ کو دفع کرنا ناممکن تھا۔ مہاجرین کو وہاں گئے ہوئے پورے دو برس بھی نہیں ہوئے تھے مدینہ میں جن لوگوں نے ان کو پناہ دی تھی اور دل و جان سے مہاجرین کے مددگار تھے اور جو انصار کہلاتے تھے ان کی تعداد بھی بمقابلہ آبادی مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے کچھ زیادہ نہ تھی پس جب کہ اہل مدینہ یہ حالت دیکھتے کہ ان لوگوں کے سبب سے مدینہ پر کیا آفت آئی ہے اور غنیم نے ان کو گھیر لیا ہے تو ان سب کی حالت بالکل بدل جاتی اور حملہ آوروں کا حملہ دفع کرنا غیر ممکن ہو جاتا اور اس لیے ضرور تھا کہ مدینہ سے آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا جاوے اور جو کچھ خدا کو کرنا منظور ہو وہ مدینہ سے باہر ہو جاوے۔ اور جو کچھ خدا کو کرنا منظور ہو وہ مدینہ سے باہر ہو جاوے۔ اسی لیے آنخضرت ﷺ نے قریش کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے باہر نکلنا اور آگے بڑھ کر ان کو روکنا ضرور سمجھا تھا اب کون شخص ہے جو ان واقعات کو انصاف کی نظر سے دیکھ کر ان کو کسی الزام کی بنیاد قرار دے سکتا ہے۔

بدر کی لڑائی میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی اور دشمنوں کا مال و اسباب ان کے ہاتھ آیا زمانہ جاہلیت میں غنیمت کے مال کا یہ دستور تھا کہ تقسیم ہونے سے پہلے سردار لشکر جو چاہتا تھا پسند کرتا تھا اور بروقت تقسیم چوتھ یعنی چہارم حصہ سردار لشکر کو دیا جاتا تھا اور باقی لڑنے والوں اور فتح کرنے والوں میں تقسیم ہوتا تھا اور خاص کسی شخص کے ہاتھ جو مال آتا تھا وہ اس کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ غالباً فتح کرنے والوں میں نسبت کسی مال غنیمت کے اس قسم کا جھگڑا پیدا ہوا کہ کوئی اس کو اپنی خاص ملکیت قرار دیتا تھا اور کوئی اپنی ملکیت اور کوئی مشترک ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور اس وقت تک مسلمانوں کے غنیمت کے مال کی نسبت کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے لوگوں نے آنخضرت ﷺ سے غنیمت کے مال کی نسبت پوچھا۔ اس پر یہ حکم ملا کہ مال غنیمت کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ خدا اور خدا کے رسول کی ملکیت ہے۔

رسول کا نام لینے سے یہ مدعا نہیں ہے کہ رسول کی ذاتی ملکیت ہے بلکہ اسطرح کے کلام سے صرف خدا ہی کی ملکیت ہونا مراد ہے خدا کی ملکیت قرار دینے سے یہ مراد ہے کہ کوئی خاص شخص اس پر دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ خدا جس طرح پر حکم دیگا اس طرح پر کیا جاوے گا۔

سورہ انفال کی بیالیسیوں آیت میں یہ حکم آیا کہ مال غنیمت میں سے خمس خدا و خدا کے رسول کے لیے ہے یعنی خدا کے لیے ہے جو قرابت مندوں اور غریبوں اور یتیموں اور مسافروں کے فائدے کے لیے رہیگا اور چار خمس ان لوگوں میں جو لڑتے تھے یا لڑائی کے متعلق کاموں میں مصروف تھے تقسیم کیا جاوے گا۔ جو رسم کہ زمانہ جاہلیت میں تھی اس سے یہ حکم تین باتوں میں مختلف تھا۔

اول۔ سردار کی چوتھ موقوف کرنے اور خدا کے لیے خمس نکالنے میں۔

دوم۔ عام طور پر کسی خاص مال پر کسی کا حق نہ ہونے میں۔

سوم۔ جو لوگ عین لڑائی میں موجود تھے اور جو لوگ لڑائی کے متعلق کسی کام پر متعین تھے ان کو بھی مال غنیمت میں سے حصہ ملنے میں۔ یہ تمام احکام اور خصوصا خمس کا نکالنا ایسے عمدہ احکام ہیں کہ ان سے بہتر اور مفید تر کوئی حکم بھی مال غنیمت کی نسبت نہیں ہو سکتا۔

جنگ بدر میں فرشتوں کی آمد کی حقیقت:

لڑائی میں فرشتوں سے مدد کرنے کا مضمون سورہ انفال میں اور آل عمران میں اور سورۃ توبہ میں آیا ہے[۱]۔ ان تینوں مقام کے طرز بیان میں کسی

۱۔ اذ تقول للمومنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثۃ الاف من الملئکۃ منزلین۔ (۱۲۵ سورۃ آل عمران)

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکۃ مردفین (آیت ۹

قدر تفاوت ہے۔سورۃ آل عمران میں تو آنحضرتﷺ کا قول استفہاما ہے کہ کیا فرشتوں سے خدا کا مدد کرنا تم کو کافی نہیں ہے۔اور سورۃ انفال میں خدا نے کہا ہے کہ میں فرشتوں سے مدد کروں گا۔ یہ دونوں آیتیں تو بدر کی لڑائی سے علاقہ رکھتی ہیں اور سورۃ توبہ میں جو آیت ہے وہ حنین کیلڑائی سے متعلق ہے اس میں فرشتوں کا لفظ نہیں ہے بلکہ ایک ایسے لشکر کے بھیجنے کا ذکر ہے جو دکھائی نہیں دیتا تھا اب اس باب میں چند امور تحقیق طلب ہیں۔

اول یہ کہ درحقیقت لڑنے کے لیے فرشتے آئے تھے یا نہیں فرشتوں کے لڑائی کے لیے آنے سے ابوبکر اصم نے انکار کیا ہے اور جو بحث کہ انہوں نے اس پر کی ہے وہ ہم نے سورۃ آل عمران کی تفسیر میں لکھی ہے اب اس جگہ اس امر کی تحقیق کرنی چاہتے ہیں جس کا وعدہ سورۃ آل عمران کی تفسیر میں کیا تھا۔

ہمارے نزدیک نہ ان لڑائیوں میں ایسے فرشتے جن کو لوگ ایک مخلوق جداگانہ اور متحیز بالذات مانتے ہیں آئے تھے اور نہ خدا نے ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ قرآن مجید سے ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ قرآن مجید سے ایسے فرشتوں کا آنا یا خدا تعالیٰ کا ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کرنا پایا جاتا ہے۔اگر ہم حقیقت ملائکہ کی بحث کو الگ رکھیں اور فرشتوں کو ویسا ہی فرض کر لیں جیسا کہ لوگ مانتے ہیں تو بھی قرآن مجید سے ان کا فی الواقع آنا یا لڑائی میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں تو صرف ااستفہام ہے کہ اگر خدا تین ہزار فرشتوں سے مدد کرے تو کیا تم کو کوفی نہ ہوگا۔ اور دوسری آیت میں ہے کہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو گے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا مگر ان دونوں آیتوں سے اس کا وقوع یعنی فرشتوں کا آنا کسی طرح ظاہر نہیں

ہوتا۔سورۃ انفال کی آیت میں خدا نے کہا کہ میں تمہاری ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا مگر اس سے بھی فرشتوں کا فی الواقع آنا نہیں پایا۔اس پر یہ خیال کرنا کہ اگر مدد موعودہ وقوع میں نہ آئی ہو تو خدا کی نسبت خلف وعدہ کا الزام آتا ہے صحیح نہیں ہے کیوں کہ مدد کی حاجت باقی نہ رہنے سے مدد کا وقوع میں نہ آنا خلف وعدہ نہیں ہے۔مسلمانوں کی خدا کی عنایت سے فتح ہوگئی تھی اور فرشتوں کو تکلیف دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی ۔ یہ کہنا کہ وہ فتح فرشتوں کے آنے کے سبب ہوئی تھی اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس کے لیے اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاہئے اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی۔روایتوں کو فرشتوں کے آنے پر سند لانا کافی نہیں ہے اول تو وہ روایتیں ہی معتبر و قابل اسناد نہیں ہیں۔دوسرے خود ان کے مضمون ایسے بے سروپا خیالی ہیں جن سے کسی امر کا ثبوت حاصل نہیں ہو سکتا خصوصاً اس وجہ سے کہ خود راوی فرشتوں کو دیکھتے نہیں تھے۔

برخلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ایک فرشتہ بھی نہیں آیا تھا دونوں صورتوں میں اس آیت کے بعد جس میں فرشتوں کے بھیجنے کو کہا ہے یہ آیت ہے

”وما جعله الله الا بشری لکم لتطمئن قلوبکم ما النصر الامن عندالله العزیز الحکیم“

یعنی اور نہیں کیا اس کو اللہ نے مگر خوش بری تمہارے لیے تا کہ مطمئن ہو جاویں اس سے تمہارے دل اور فتح نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔ یہ بات غور کے لائق ہے کہ

”ماجعله“

میں جو ضمیر ہے وہ کس کی طرف راجع ہے۔امام رازی صاحب فرماتے ہیں کہ ضمیر راجع ہے طرف مصدر کے جو کہ گو صریحاً مذکور نہیں ہے مگر لفظ

''یمد کم''

میں ضمناً داخل ہے یعنی

ما جعله الله المدد والامداد الا بشریٰ

اور زجاج کا قول ہے کہ

ما جعله الله ای ذکر المدد الا بشریٰ.

مگر امام رازی صاحب نے جو فرمایا ہے وہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ خدا نے کہا تھا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا پھر فرمایا کہ وہ یعنی یہ کہنا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا پھر فرمایا کہ وہ یعنی یہ کہنا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا صرف خوش خبری تھی پس اعلانیہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ م''ماجعلہ'' کی ضمیر قول امداد یا ذکر امداد کی طرف راجع ہے جیسا کہ زجاج کا قول ہے نہ بطرف مصدر کے جو مذکور بھی نہیں ہے۔ البتہ اس صریح وصاف مرجع ضمیر کو چھوڑ کر مصدر کی طرف اس صورت میں ضمیر راجع ہو سکتی ہے کہ اول وقوع اس مدد کا یعنی فرشتوں کا آنا ثابت ہو جاوے اور وہ ابھی تک ثابت نہیں ہوا اور اسلیے مصدر کے طرف ضمیر کا راجع کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

''**ما جعله** ''

پر

''**مانا فيه**''

ہے جو عام طور پر نفی کرتا ہے اور اس لیے خدا نے پیغمبر کے اس قول کو کہ کیا تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔ کوئی چیز مگر بشارت یعنی صرف بشارت تاکہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں اور سورۃ انفال کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تم خدا سے فریاد کی اور اس نے تمہاری فریاد کو قبول کیا کہ میں فرشتوں سے تمہاری

مدد کروں گا تو نہین کیا خدا نے اس قبول کرنے کو جس کے ساتھ فرشتوں سے مدد دینے کو کہا تھا کوئی چیز مگر بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں اور یہ طرز کلام قطعا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسا فرشتہ جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں لڑائی کے میدان میں نہیں آیا تھا۔

یہ تمام تقدیر اس صورت میں تھی جب کہ ملائکہ کو ایک ایسا وجود خارجی متحز بالذات تسلیم کیا جاوے جیسے کہ عموما تسلیم کیا جاتا ہے اور جو مشکلیں ان آیتوں کے معنوں کے حل کرنے میں پیش آتی ہیں اور موضوع روایتوں اور جھوٹے اور بے معنی قصوں سے استدلال کرنے کی احتیاج پڑتی ہے وہ اسی صورت میں ہے پڑتی اگر ٹھیک طور پر قرآن مجید کو سمجھا جاوے اور جو اس کا طرز کلام ہے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاوے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور خدا اور اس کے کلام کی عظمت وشان اور خدا کی قدرت کاملہ کا سچا اثر انسان کے دل پر پڑتا ہے۔

فتح کے اتفاقی اسباب سے جو بعض اوقات آفات ارضی وسماوی کے دفعتہً ظہور میں آنے سے ہوتے ہیں قطع نظر کر کے دیکھا جاوے کہ ان لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے جو فتح پاتے ہیں ان کے قوائے اندرونی جوش میں آتے ہیں۔ جرات، ہمت، صبر، شجاعت، استقلال، بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور یہی قویٰ خدا کے فرشتے ہیں جن سے خدا فتح مندوں کو فتح دیتا ہے اور اس کے برخلاف حالت یعنی بزدلی اور رعب ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کی شکست ہوتی ہے۔ پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا مگر وہ بجز خوش خبری فتح کے اور کچھ نہیں ہے جس کے سبب تم میں ایسے قویٰ پرانگیختہ ہوں گے جو فتح کے باعث ہوں گے۔ تمہارے دل قوی ہو جاویں گے لڑائی میں تم ثابت قدم رہو گے۔ جرات، ہمت شجاعت کا جوش تم میں پیدا ہوگا اور دشمنوں پر فتح پاؤ گے۔

یہ معنی ان آیتوں کے ہم نے پیدا کیے ہیں بلکہ خود خدا نے یہی تفسیر اپنے کلام کی کی ہے جہاں اسی سورہ میں اوراس واقعہ کی نسبت فرمایا ہے کہ

”اذ یوحیٰ ربک الیٰ ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبنو الذین امنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب “

یعنی جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا (یہ وہی فرشتے ہیں جن بھیجنے کا مدد کے لیے وعدہ کیا تھا) کہ میں تمہارے)یعنی مسلمانوں کے) ساتھ ہوں (تو ان فرشتوں سے یہ کام لینے چاہے تھے) کہ ثابت قدم رکھوان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں میں بہت جلدان لوگوں کے دلوں میں جو کافر ہیں رعب ڈالوں گا۔

لڑائی میں ثابت قدم رکھنے والی کون چیزتھی وہی ان کی جرات وہمت تھی کوئی اور شخص ان کے پاس کھڑے ہوئے ان کو شاباش شاباش نہیں کہہ رہے تھے پس صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں سے مراد وہی قوائے انسانی تھے جن کے پاس وحی بھیجی تھی اور جو لڑنے والوں میں بھی موجود تھے اور فرشتوں سے ان کی مدد کرنے سے ان کو لڑائی میں ثابت قدم رکھنا شجاعت، جرات، ہمت، استقلال کو قائم رکھنا مراد تھا۔ یہ خیالی فرشتوں کو سپاہی بنا کر اور ڈھال تلوار، تیر کمان دے کر اور سفید سفید گھوڑوں پر سوار کر کے بھیجنا۔

قرآن مجید کا سیاق کلام ہی یہ ہے کہ اس میں ایسے مواقع میں جو خوف وخطرک کے ہوتے ہیں انسانوں کے دلوں میں طمانیت اور قوت بخشنے کو فرشتوں سے مدد کرنے اور اپنے غیبی لشکروں سے امداد کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود صرف دل میں طمانیت و سکینہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپے جہاں نہ لشکر تھا نہ لڑائی۔ خدا نے فرمایا

”الاتنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذھما

فـی الـغـار اذیـقـول لـصاحبه لاتحزن ان الله معنا فانزل الله السکینة علیه دایـده بـجـنـودلم تروها و جعل کلمة الذین کفرو السفلی و کلمة الله هی العلیا والله عزیز حکیم."

وہاں غار میں کون سی فوج تھی اور کون سی لڑائی تھی جو خدا نے اپنا غیبی لشکر بھیجا تھا بلکہ لشکر سے صرف سکینہ مراد تھی۔ اس آیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور یہ کہنا کہ پہلا حملہ تو واقعہ غار سے متعلق ہے اور دوسرا ٹکڑا جہاں لشکر کے آنے کا ذکر ہے جنگ احد یا جنگ بدر یا جنگ احزاب سے متعلق ہے جیسا کہ بعض مفسروں نے کہا ہے ایک ایسا لغو کلام ہے جو التفات کے قابل نہیں ہے اور خدا کے کلام کیساتھ ایک قسم کی بے ادبی ہے کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں سے چاہا توڑا اور جہاں چاہا جا جوڑا۔

اسی طرح خدا تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں فرمایا

"ثـم انـزل الله سکینتة علی رسوله وعلی المومنین وانزل جنود الم تروها وعذب الذین کفروا ذالک جزاء الکافرین."

سکینہ کی تفصیل

"جنود الم تروها"

واقع ہوئی ہے اور ان دونوں سے مراد صرف سکینہ ہے نہ اور کچھ۔

اسی مضمون کی آیت سورۃ احزاب میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے۔

یـاایهـا الذین امنو ذکروا نعمةالله علیکم اذ جاء تکم جنودا فارسلنا علیهم ریحا وجنود الم تروها وکان الله بما تعملون بصیرا."

اس سے بھی عمدہ طریقہ پر اس مضمون کو سورۃ فتح میں بیان کیا ہے جہاں فرمایا ہے۔

"هـوالـذی انـزل السکینة فی قلوب المومنین لیزداس وا ایمانا مع

ایمانھم واللہ جنود السموات والارض وکان اللہ عزیزا حکیما۔"

اسی انزال سکینہ کو خدا نے اپنے لشکروں سے تعبیر کیا ہے۔ پس بدر کی لڑائی میں بھی نہ جنگ جو مجسم و متحیز بالذات فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کا تھا نہ ایسے فرشتے بھیجے تھے بلکہ صرف مسلمانوں کے دلوں کو اور ان کے قوائے جنگ کو صرف خوش خبری فتح سے تقویت دینے کا وعدہ تھا جس کو خدا نے پورا کیا اور قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر فتح دی۔

اہل عرب زمانہ جاہلیت میں بہت سے قوائے غیر مرئیہ کو مربی انسان اور دنیا میں کارکن سمجھتے تھے ملائکہ کو بھی وہ ایک قوت غیر مرئیہ جانتے تھے اور گو وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان میں مجسم و مرئی ہو جانے کی بھی طاقت ہے مگر یہ نہیں تھا کہ ملائکہ کا مفہوم بغیر اس کے کہ وہ ان کو مجسم و مرئی سمجھیں ان کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ انہی آیتوں میں جہاں خدا تعالیٰ نے لفظ

" جنود الم تروھا"

کا استعمال کیا ہے اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اس زمانہ کے قوائے عرب غیر مرئیہ کو کارکن سمجھتے تھے پس یہ کہنا کہ جو معنی آیت کے ہم نے بیان کیے ہیں (اگرچہ ایسا کہنا ہم پر تہمت ہے کیوں کہ ہم نے نہیں بیان کیے بلکہ خود خدا نے بیان کیے ہیں) وہ معنی نہ اس زمانہ کے عرب جاہلیت سمجھتے تھے نہ صحابہ کرام محض غلط ہے اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی فرضی شکل و صورت کے ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال ہی نہیں آ سکتا۔ مگر عرب جاہلیت کا ایسا خیال نہ تھا بے شک فرشتوں میں وہ مجسم ہونے و مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کی طاقت سمجھتے تھے مگر بلا خیال شکل و صورت و تحیز کے بھی ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال تھا جس کو ہم نے بلفظ قویٰ تعبیر کیا ہے۔ گو اس زمانہ کے مسلمان آیت کے معنی سمجھنے کے قابل نہ ہوں مگر اس زمانہ کے عرب بلاشبہ اس قابل تھے۔

جنگ بدر میں کتنے فرشتے اترے تھے

اب باقی رہی بحث نسبت عدد ملائکہ کے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے مقامات میں عدد کے ذکر کرنے سے خاص عدد معین مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس امر کا مکمل ہونا جس کی نسبت عدد کا بیان ہوا ہے مقصود ہوتا ہے علاوہ اس کے عددوں کا بیان مختلف مواقع پر ہوا ہے جس کے سبب کچھ اختلاف آیتوں میں نہیں ہے۔ اسی سورۃ کی چوتھی آتے کی تفسیر میں ہم نے بیان کیا ہے کہ جب آنخضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور قریش مکی کے مقابلہ میں نکلنے کا ارادہ تھا تو ایک گروہ مسلمانوں کا بسبب کثرت مخالفین کے خائف تھا اور وہ ان کے مقابلے میں لڑنے کو جانا ناپسند کرتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں سے آنخضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ

"لن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلائۃ الالف من الملائکۃ منزلین بلیٰ ان تصبروا وتتقو و یاتوکم من فورھم ھذا یمدد ربکم بخمسۃ الالف من الملائکہ مسومین" (سورہ اعراف آیت ، ۱۲۰ و ۱۲۱)

یعنی کیا تم کو قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے یہ بھی کافی نہ ہوگا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ بلکہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو اور خدا سے ڈرو اور وہ ابھی تم پر آن پڑیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا پس رسول خدا ﷺ کا یہ فرمانا صرف ان لوگوں کی طمانیت اور جرات بڑھانے کے لیے تھا اور اس سے کسی عدد خاص کا تعین مقصود نہ تھا۔

مگر جب مسلمان بمقابلہ قریش مکہ بدر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مکہ کے لشکر میں ہزار آدمی لڑنے والے ہیں جن کے مقابلہ کے لیے ہزار فرشتوں سے مدد دینے کی بشارت دینا کافی تھا اس لیے پروردگار نے فرمایا:

"انی ممدکم بالف من الملائکة مردفین"

اوراسی کے ساتھ بتلا دیا کہ یہ کہنا یا وعدہ کرنا صرف فتح کی خوشخبری ہے تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوجاویں نہ یہ کہ ہزار فرشتے سپاہی بن کر تمہارے ساتھ لڑنے کو آویں گے۔ نتیجہ اس سب کا یہ نکلا کہ میں تمہارے دلوں کو ہزار آدمی کے لشکر کے برابر تقویت اور جرات دے دوں گا جس کے سبب تم ان کا مقابلہ کرسکو گے۔

(اذا یغشیکم النعاس امنة منه)

ہم نے سورۃ آل عمران کی تفسیر میں نسبت "نعاس" کی کافی بحث کی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقام پر باقی آیت کی نسبت ہم کو تفسیر لکھنی ہے۔

جنگ بدر میں نزول ماء اور تطہیر کی بحث:

خدا نے فرمایا ہے

" وینزل علیکم من السماء ماء لیطھر کم به و یذھب عنکم رجز الشیطان "

ہمارے مفسروں نے ان سیدھے وصاف لفظوں کی ایسی ناپاک تفسیر کی ہے جس سے تعجب ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام لشکر سو گیا تھا اور شیطان سب کے پاس آیا اور سب کو احتلام ہوگیا۔ اس لیے خدا نے مینہ برسایا تاکہ نہا دھو کر جنابت سے پاک ہوجاویں۔

مگر یہ تمام باتیں محض لغو وخرافات ہیں اور قرآن مجید میں ایسا ناپاک مضمون نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اولا مدینہ سے مکی کی طرف کوچ کیا اور اثنائے راہ میں سے جیسا کہ ہم ابھی بیان کرچکے ہیں مکہ کے رستہ کو چھوڑ کر بدر کی جانب پھرے۔ اس میں کچھ کلام نہیں ہوسکتا کہ اس قدر منزلیں طے کرنے میں تمام لوگ گرد آلود

تھے ان کے کپڑے میلے کچیلے ہوگئے تھے اور رستہ میں پانی کی بے انتہا تکلیف اٹھانی تھی۔ بدر میں ان کو کافی پانی کے ملنے کی توقع تھی مگر جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پانی کے چشمہ پر قریش مکہ نے قبضہ کرلیا ہے ایسی حالت میں جس قدر پریشانی اور ناامیدی مسلمانوں کو ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص جو کسی قدر سمجھ رکھتا ہے کرسکتا ہے۔ بلاشبہ وہ نہایت مضطر ہوئے ہوں گے جیسے کہ

" اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم"

سے ظاہر ہوتا ہے اور اگرچہ ان کو مدینہ سے کوچ کرتے وقت فتح کی بشارت مل چکی تھی مگر ان کے دل میں شیطانی وسوسہ آیا کہ ایسی حالت میں کہ پانی پینے کو بھی میسر نہیں اور دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے فتح ہونا ناممکن ہے۔ ایسی تنگ حالت میں خدا نے مینہ برسایا تاکہ وہ نہا دھو کر میل کچیل سے پاک ہو جائیں اور جو وسوسہ فتح نہ ہونے کا پانی نہ ملنے کے سبب سے شیطان نے ان کے دلوں میں ڈالا تھا وہ دور ہو جاوے۔ پانی پی پی کر تر و تازہ ہوں ان کے دل مضبوط ہو جاویں اور لڑائی میں ثابت قدم رہیں۔ ایسی سیدھی و صاف آیت کو جو بالکل واقعات کے مطابق ہے ہمارے مفسرین نے ایسے ناپاک طریقہ پر اسے مجمول کیا ہے کہ بجز اس کے کہ خدا ان کو معاف کرے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا وہ بزرگ یہ بھی نہیں سمجھے کہ اگر طہارت سے طہارت شرعی مراد تھی تو اس کے لیے پانی ہی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لیے تو تیمّم ہی کافی تھا اور یہ کہنا کہ گو تیمّم شرعی طہارت ہے مگر بغیر نہائے انسان کے دل میں نجاست کا خیال رہتا ہے ان لوگوں کا کام ہے جن کو احکام شرعی پر پورا ایمان نہیں ہے نہ صحابہ کا۔

معرکہ بدر میں مارمیت اذ رمیت کی حقیقت:

بدر کی لڑائی میں جب مسلمانوں کی باوجود جماعت قلیل ہونے کے فتح ہوئی اور دشمن مارے گئے تو اللہ تعالیٰ نے تمام مجاہدین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو قتل کیا۔ پھر خاص پیغمبر ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تو نے دشمنوں کو تیر نہیں مارے بلکہ خدا نے مارے جس طرح خدا تعالیٰ ہر ایک فعل کو جو کسی ظاہری سبب سے ہو یہ سبب علة العلل ہونے کے اپنی طرف منسوب کرتا ہے اسی طرح اس مقام پر بھی مجاہدین کے افعال اور آنحضرت ﷺ کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسے کہ اس سے پہلے فرمایا تھا

''وما النصر الا من عندالله.''

اس آیت میں تمام مفسرین نے ''رمیٰ'' سے باوجودیکہ سیاق کلام اور مقتضائے مقام سے علانیہ تیر مارنا سمجھا جاتا ہے تیر مارنا مراد نہیں لیا ہے بلکہ ایک روایت کی بنیاد پر جس کو خود ''قیل'' کر کے بیان کیا ہے جو خود دلیل اس کے غیر معتبر یا ضعیف و غیر ثابت ہونے کی ہے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مٹھی خاک کی دشمن کے لشکر کی طرف پھینکی اور خدا کی قدرت سے اس کو اس قدر وسعت ہوئی کہ دشمنوں کے لشکر کے ہر ایک شخص کی آنکھ تک جا پہنچی وہ تو آنکھیں ملنے لگے اور مسلمانوں نے ان کو مار کر قیمہ کر دیا اور مسلمانوں کو فتح ہوگئی۔

یہ طریقہ تفسیر کا اسی عجائب پسندی پر مبنی ہے جو ہمارے مفسرین نے بہ تقلید یہود مذہب اسلام میں جو نہایت سیدھا اور صاف ہے اختیار کیا ہے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ لڑائی کے موقع کا بیان ہے اس زمانہ کے عرب تلوار و تیر کمان اور برچھی سے لڑتے تھے او ریہی ان کے ہتھیار تھے پھر ''رمی'' سے تیر اندازی کے معنی چھوڑ کر مٹھی بھر خاک پھینکنے کے معنی لینے کس طرح پر درست ہ سکتے ہیں۔ بعض مفسرین نے ''رمی'' سے مٹھی بھر خاک پھینکنا مراد نہیں لیا بلکہ تیر کا ہی مارنا مراد لیا ہے مگر کہتے ہیں کہ یہ آیت بدر کی لڑائی سے متعلق نہیں

ہے بلکہ خیبر کی لڑائی سے متعلق ہے ا اس لڑائی میں پیغمبر خدا ﷺ نے کمان میں تیر جوڑ کر مارا تھا جو ابن ابی حقیق کو جا لگا اور وہ مر گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ

"ما رمیت و اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ"

مگر ان حضرات سے پوچھنا چاہیے کہ جو آیت خاص بدر کی لڑائی کے قصہ میں نازل ہوئی ہے اسکو توڑ کر خیبر کی لڑائی کے قصہ میں لے جانے کی کیا ضرورت ہے اور بدر کی لڑائی میں "رمیٰ" سے "رمی السہم" مراد لینے کی کیا قباحت ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو بدر ہی کی لڑائی سے متعلق رکھا ہے اور "رمی" سے مٹھی بھر خاک پھینکنا مراد نہیں لیا بلکہ ہتھیار چلانا مراد لیا ہے اور ابی ابن خلف کے قتل سے متعلق کیا ہے اور کہا ہے کہ جب وہ آنحضرت ﷺ کے قریب آیا تو

"رما بحره فکسر ضلعا عه من اضلاعه فحمل فمات ببعض الطریق فی ذالک نزلت الایة" (تفسیر کبیر)

غرض کہ مٹھی بھر خاک کی روایت غیر صحیح و موضوع ہے اور بعض مفسرین بھی اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔ صاف صاف معنی آیت کے یہی ہیں کہ اس لڑائی میں مسلمان کافروں سے لڑ رہے تھے اور ان کو قتل کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ بھی بذات خاص لڑائی میں شریک تھے اور تیر و کمان سے کافروں کا مقابلہ فرماتے تھے جس سے سبب خدا نے فتح دی اور مسلمانوں سے فرمایا

"فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم"

اور آنحضرت ﷺ سے فرمایا

"وما رمیت ا ذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ."

ا . قال بعضھم انھا نزلت یوم خیبر روی اله علیه السلام

اخذقوسا وهوعلى باب خيبر فرمى سهما فاقبل السهم حتى قتل ابن ابى الحقيق وهو على فرسه فنزلت ”وما رميت اذ رميت ولكن الله رمیٰ“. (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۱۷۳)

جنگ بدر میں پتھروں کی بارش کا مطلب جنگ:

بدر کے سلسلے میں خدا نے جو یہ فرمایا:

” فامطر علينا حجارة من السماء“

ان سے بالتخصص آسمان سے پتھر برسانا مراد نہیں ہے بلکہ عموما عذاب آسمانی یا آفت ومصیبت مراد ہے”امطر“ کا استعمال عذاب کے معنوں میں ہوتا ہے

’قال صاحب الكشاف ”وقد كثر الامطار فى معنى العذاب “

اور

امطار الحجارة اور رمیٰ بالجارة“

دونوں کا ایک مقصدہ اوراس سے واہیہ عظمیہ کا واقع ہونا مراد ہوتا ہے پس قریش مکہ کا جو قول اس آیت میں منقول ہے اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اے خدا اگر قرآن سچ ہے اور تیرے پاس سے آیا ہے تو ہم پر کوئی آسمانی عذاب نازل کر یا کوئی اور سخت عذاب بھیج اوران الفاظ سے ان کا مطلب قرآن کے حق ہونے سے انکار کرنے کا تھا۔

ما کان اللہ لیعذبہم کی تفسیر:

جنگ بدر کے سلسلے میں سورۃ انفال میں جو یہ الفاظ ہیں کہ

”وما كان الله ليعذبهم و انت فيهم“

اس میں عذاب کو کسی خاص قسم کے عذاب سے مقید اور مخصوص نہیں کیا اس لیے اس

بات پر غور کرنی ضرور ہے کہ اس عذاب سے کس قسم کا عذاب مراد ہے اگلی اور پچھلی تمام آتیوں پر غور کرنے سے اور خصوصا انتیسویں آیت پر لحاظ کرنے سے جس میں ایک فیصلہ کرنے والی فتح کی بشارت دی گئیہ ہے اور چالیسویں آتے پر لحاظ کرنے سے جس میں قریش مکہ سے لڑنے اور ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور چونتیسویں آیت پر غور کرنے سے جس میں قریش مکہ کو عذاب سے لڑائی میں شکست پانے اور مارے جانے کا عذاب مراد ہے اور اس مطلب کو الفاظ

"وانت فیهم"

زیادہ تر روشن کردیتے ہیں کیوں کہ جب تک آنحضرت ﷺ مکہ میں تشریف رکھتے تھے تو قریش سے جو مکہ کے حاکم تھے لڑنا اور انکو قتل کرنا ناواجب تھا مگر جب وہاں سے آنحضرت ﷺ نے اور مسلمانوں نے ہجرت کر لی تو اب ان سے لڑنا اور ان قتل کرنا ناواجب نہیں رہا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس آیت کے بعد کی آیت میں فرمایا کہ

"وما لهم الا يعذبهم الله وهم يصدرون عن المسجد الحرام."

یعنی اب ان کے لیے کیا ہے کہ اللہ ان کو عذاب دے اور وہ روکتے رہیں۔ (مسلمانوں کو) مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ میں آنے سے۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قریش مکہ کا مسجد حرام میں آنے سے روکنا ان کے عذاب کا سبب تھا۔ پس وہ عذاب بجز اسکے کہ لڑائی میں شکست پانے کا عذاب ہو اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

علاوہ اس کے قرآن مجید میں لڑائی میں قتل ہونے کو علانیہ اور بالتصریح عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں فرمایا ہے:

قاتلوهم يعذبهم الله بايديكم ويخزهم وه ينصركم عليهم و يشف صدور قوم مومنين (سورة توبه آيت ١٤).

یعنی مار وان کو عذاب دے گا ان کو اللہ تمہارے ہاتھوں سے اور خوار کرے گا ان کو اور مدد کرے گا تمہاری اور چین دے گا دلوں کو ایمان والوں کی ایک قوم کے۔

مفسرین نے بھی اس عذاب سے لڑائی میں شکست پانے اور قید وقتل ہونے کا عذاب مراد لیا ہے چناں چہ تفسیر کبیر میں

ا . ثم بین تعالیٰ مال جله یعذبهم فقال وهم یصدون عن المسجد الحرام . (تفسیر کبیر)

لکھا ہے ا کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے کہ ان کو عذاب نہ دے گا جب تک کہ خدا کا رسول ان میں ہے اس آیت میں فرمایا کہ ان کو عذاب دے گا کہ اب خدا کا رسول ان میں سے نکل آیا ہے پھر علماء نے اس عذاب میں اختلاف کیا ہے بعضوں نے کہا کہ بدر کی لڑائی میں وہ عذاب ان کو ملا اور بعضوں نے کہا کہ مکہ کی فتح کے دن۔ غرض کہ ان علماء نے عذاب سے لڑائی میں شکست پانے کا عذاب مراد لیا ہے۔

اب اس آیت کے ان لفظوں پر

”وما کان الله معذبهم وهم ییستغفرون“

سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ استغفار کرتے ہیں بلکہ اس سے نفی استغفار مراد ہے۔ پس ان لفظوں کے معنی یہ ہیں۔ درحالیکہ وہ استغفار کرتے تو خدا ان کو عذاب نہ کرتا مگر وہ استغفار نہیں کرتے تو خدا ان کو عذاب نہ کرتا مگر وہ استغفار نہیں کرتے اس لیے انکو خدا عذاب دے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام علماء صاحب کشاف کو علم ادب کا بہت بڑا عالم سمجھتے اور جو معنی انہوں نے بیان کیے ہیں اس کو سب تسلیم کریں گے۔

ا . قال ابن عباس . وما لهم ان الا یعذبهم الله واعلم انه ،تعالیٰ بین فی الایة الاولی ان لا یعذبهم مادام رسول الله فیهم ذکر فی هذه

الایة انہ لا یعذبھم اذ اخرج الرسول من بینھم ، ثم اختلفو فی ھذا العذاب فقال بعضھم الحقھم عذاب المتوعد بہ یوم بدر و قیل بل یوم فتح مکہ .(تفسیر کبیر جلد ۳صفحہ ۳۸۰)

۲ . ھم یستغفرون فی المواضع المحال ومعناء نفی الاستغفار عنھم ای لو کانوا ممن یومن ویستغفر من الکفر کما عذبھم لقو لہ وما کان ربک لیھکل القری بظلم واھلھا مصلحون ولکنھم لا یومنون ولا یسغفرون ولا یتوقع ذالک منھم . (تفسیر کشاف صفحہ ۲۱۵)

جنگ بدر کا موقع:

جنگ بدر کے سلسلے میں خدا نے جو یہ فرمایا ہے کہ

” از انتم بالعدوۃ الدنیا باالعدوۃ القصویٰ والرکب اسفل منکم ولو توا عدتم لا ختلفتم فی المیعد ولکن لیقضی اللہ امر کان مفعولا .“

یعنی جس وقت کہ تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ تھے پرلے کنارہ پر اور قافلہ تھا تم سے نیچے (یعنی سمندر کے کنارہ پر) اور اگر تم (اس مقام پر لڑنے کا) وعدہ کر لیتے تو البتہ تم وعدہ خلافی کرتے ولیکن (یہ اس لیے ہوا) تا کہ پورا کر دے اللہ اس کام کو جو کرنے کو تھا۔

اس آیت میں نہایت صفائی سے خدا تعالیٰ نے ان مقامات کا بیان کیا ہے جہاں آنحضرت ﷺ اور قریش مکہ کا لشکر موجود تھا اور جس راہ سے ابوسفیان والا قافلہ نکل گیا تھا۔ اس آیت سے ہشامی کی روایت جو ابھی ہم لکھ آئے ہیں بخوبی تصدیق ہوتی ہے کہ ابو سفیان کا قافلہ سمندر کے کنارہ ہو کر نکل گیا تھا۔

مگر یہ الفاظ جو اس آیت میں ہیں کہ

''ولو تو اعدتم لا ختلفتم فی النمیعاد''

اس کی تفسیر میں مفسرین نے غلطی کی ہے۔ اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ ابتدا ہی سے ان کو یہ غلط خیال ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کا ارادہ قافلہ کے لوٹنے کا تھا اور ہم نے خود قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ خیال محض غلط ہے پس اسی غلط خیال کے سبب سے وہ سمجھتے جیسے کہ تفسیر کبیر میں بھی لکھا ہے کہ قریش مکہ سے تفاقیہ اور نا داستہ لڑائی ہو گئی اور اگر ان سے لڑائی کا وعدہ کیا جاتا تو وعدہ خلافی کرنے اس لیے کہ مسلمان بہت تھوڑے تھے اور قریش بہت زیادہ۔

مگر یہ رائے بالکل غلط ہے خود قرآن مجید سے ثابت ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا رسول خدا ﷺ خاص قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے بلکہ خدا کا حکم تھا کہ قریش مکی ہی سے لڑو۔ پس مذکورہ بالا تفسیر کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی اس آیت میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے لشکر کا اور قریش مکہ کے لشکر کا مقام بیان کیا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ تمام مفسرین اور مورخین قبول کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا لشکر پانی سے دور اور خراب جگہ پر تھا اور قریش مکی کا لشکر پانی سے دور اور خراب جگہ پر تھا اور قریش مکی کا لشکر بہت اچھے مقام پر تھا اور پانی اس کے قبضہ میں تھا۔ ایسے خراب مقام پر دفعتہ لڑائی ہو گئی۔ پس خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر پہلے سے اس مقام پر لڑنے کا وعدہ کیا جاتا تو تم وعدہ خلافی کرتے اور اس مقام پر لڑنے کا وعدہ کیا جاتا تو تم وعدہ خلافی کرتے اور اس مقام کی خرابی دیکھ کر اس مقام پر لڑنا منظور نہ کرتے لیکن اسی جگہ لڑائی ہو گئی اور جو خدا کو کرنا منظور تھا وہ خدا نے کر دیا۔

(اذ بریکھم اللہ)

اس آیت میں مفسرین کو یہ مشکل پیش آئی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے خواب میں

آنحضرت ﷺ کو بہت سے لوگوں کو تھوڑا سا دکھلایا تو پیغمبر کا خواب خلاف واقع اور غلط ہوا حالاں کہ پیغمبر کا خواب خلاف واقع اور غلط نہیں ہوتا، مگر یہ شبہ آیت کے معنی اور طرز بیان پر غور نہ کرنے کے سبب سے واقع ہوا ہے حالاں کہ آیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر کوئی شبہ ہو سکے۔

تمام سیاق قرآن مجید کا اسطرح پر واقع ہے کہ خدا تعالیٰ بندوں کے افعال کو بہ سبب علۃ العلل ہونے کے اپنی طرف نسبت کرتا ہے اس طرح آنحضرت ﷺ کے خواب دیکھنے کو اپنی طرف نسبت کیا ہے کہ خدا نے ان کو خواب میں دکھلایا تھوڑا۔ اس طرح پر کہنا قرآن مجید کے سیاق کے مطابق ان معنوں میں ہے کہ جب تو نے ان کو خواب میں دیکھا تھوڑے سے اور اگر ان کو دیکھنا بہت سے تو بے شک بزدلی کرتے اور کام میں جھگڑا کرتے۔

اس آیت کے بعد کی آیت سے حضور ﷺ کے خواب کی تصدیق ہوتی ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ جب قریش مکہ سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کی آنکھوں میں وہ تھوڑے سے معلوم ہوئے۔ قلیلا کا لفظ دونوں روایتوں میں واقع ہوا ہے اگر پہلی آیت میں قلیلا کے لفظ سے شوکت اور عظمت اور جرات میں قلیل لیے جاویں تو دوسری آیت میں بھی جب کہ مقابلہ ہوا ''قلیلا'' کے یہی معنی لیے جاویں گے اور اگر پہلی آیت میں قلیلا کے لفظ سے قلیل فی العدد مراد لی جاوے تو دوسری آیت میں بھی قلیل فی العدد مراد لی جاوے گی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقابلہ کے وقت کل لشکر قریش کے مقابلہ میں نہیں آیا تھا بلکہ ان میں سے تھوڑے سے آدمیوں سے مقالہ ہوا تھا جس کا سبب خود اس دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کیوں کہ قریش مکہ نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھوڑے سے آدمی ہیں اس لیے انہوں نے بھی تھوڑے سے آدمیوں سے مقابلہ کیا اور جو امر کہ آنحضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا وہ سچا ہوا۔

اذ زین لہم الشیطان اعمالہم سے کیا مراد ہے:

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ۔

"واذ زین لهم الشيطن اعمالهم وقال لا غالب لكم اليوم من الناس وانی جار لکم فلما تراء ت الفئتن نکص علی عقبیه وقال انی بری منکم انی اراما لاترون انی اخاف الله والله شدید العقاب."

یعنی اور جب اچھا کر دکھایا ان کے لیے شیطان نے ان کے عملوں کو اور کہا نہیں ہے کوئی غالب تم پر لوگوں میں سے آج کے دن اور بے شک میں تمہارا حمایتی ہوں پھر جب آمنے سامنے ہوئے دونوں گروہ تو الٹا پھرا الٹی ایڑیوں پر اور کہا کہ بے شک میں الگ ہوں تم سے۔ بیشک میں دیکھتا ہوں وہ جو تم نہیں دیکھتے۔ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔

ہمارے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں عجیب وغریب باتیں لکھی ہیں اوہ کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں شیطان سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت بن کر جو بکر بن کنانہ کے سرداروں مین سے تھا مع اپنے ساتھ کے لوگوں کے قریش مکہ کے پاس آیا اور کہا کہ ہم تمہارے مددگار ہیں اور کہا کہ اب کوئی تم پر غالب نہیں ہونے کا اور اس وقت حرث بن ہشام کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے کھڑا تھا مگر جب اس نے مسلمانوں کے لشکر میں حضرت جبریل کو اور فرشتوں کو دیکھا تو ہاتھ چھڑا کر بھاگا اور کہا کہ جو میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے۔ شیطان کا سراقہ بن مالک کی صورت بن کر آنے کی یہ دلیل لکھی ہے کہ جب کفار قریش مکہ کو پھر کر گئے تو لوگوں نے کہا سراقہ کے آدمی بھاگ گئے۔ جب یہ خبر سراقہ کو پہنچی تو اس نے کہا کہ سراقہ کے آدمی بھاگ گئے۔ جب یہ خبر سراقہ کو پہنچی تو اس نے کہا کہ خد

ا کی قسم مجھ کوتمہارا جانا معلوم بھی نہیں ہوا ابھی تمہاری شکست کی خبر مجھ کو پہنچی ہے۔اس وقت لوگوں نے کہا کہ وہ شخص جوسراقہ کی صورت میں آدمی لیے ہوئے تھا سراقہ نہ تھا بلکہ شیطان تھا۔

ا۔وذالک لان کفار قریش لما رجعوا الی مکه قالو ا هزم اناس السراقه فبلع ذالک سراقة فقال و الله ماشعرت بمسیر حتیٰ بلغنی هزیمیتکم فعند ذالک تبین للقوم ان ذالک الشخص ما کان سراقه بل کان شیطانا . (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحه ۳۸۸)

نہایت افسوس ہے کہ ہمارے مفسروں نے کیسی لغواور بے ہودہ اور بے سمجھ اور بے ٹھکانہ باتوں کوقرآن کی تفسیر میں داخل کیا ہےاوران کوتفسیر کی بنیادقرار دیا ہے خداان پررحم کرے۔مگرحسن اوراصم دومفسروں کا قول ہے کہ شیطان کسی آدمی کی صورت نہیں بنا تھا بلکہ ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تھا۔ا پہلاقول تومحض لغو ہےاورحسن اوراصم کا قول ایسا ہے جوتسلیم ہونے قابل ہے۔بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ قریش مکہ کی حالت کوان کی زبان حال سے بیان فرماتا ہے۔پہلی آیت میں غروراورتکبر سے وہ لڑائی کے لیے نکلے تھےاس کا اشارہ کیااوردوسری آیت میں فرمایا کہ

”زین لهم الشیطن اعمالهم“

یعنی ان کےنفس نے کہا کہ میں تمہاراحمایتی ہوں مگرجب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو ان کی جرات اور ہمت جو کچھ تھی وہ پست ہوگئی اورآثار فتح ونصرت لشکراسلام کے ظاہر ہوئے اوران کانفس شریرپسپا ہوا جس کوخدا تعالیٰ نے نہایت فصیح طور پر بیان فرمایا۔

”فلما تراء ت الفئتن نکص علی عقبیه وقال انی بری منکم انی اریٰ ما لاترون“

اور جب انسان کی نخوتت اور غرور کے برخلاف امر واقع ہوتا ہے تو اس کے نفس امارہ کو قدرتی طور پر خورف لاحق ہوتا ہے خصوصا مواقع جنگ میں جہاں ہر طرح پر فتح کی امید ہو اور شکست ہو جاوے پس خدا تعالیٰ نے مشرکین کے نفس شریر کی اس حالت کو ان لفظوں سے بیان کیا کہ

" انی اخاف الله و الله شدید العقاب"

اور کیا بلحاظ سامان لڑائی کے اور کیا بلحاظ آسائش و خوراک وقوت جسمانی کے نہایت ضعیف تھے۔ اس لیے خدا نے فرمایا کہ اس

ا . ان الشیطان زین بوسوسته من غیران یتحول فی صورة الانسان وهو قول الحسن الا صم.

قدر تفاوت میں تخفیف کی جاوے تب بھی اگر تم ثابت قدم رہو گے تو دوگنوں پر غالب آ ؤ گے پس ان آیتوں میں سے کسی آیت میں تعین عدد خاص مراد نہیں بلکہ صرف تحریض علی القتال و ثبات فی القتال مراد ہے۔

قیدیان بدر کا مسئلہ:

بدر کے قیدیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

"ما کان لنبی ان یکون له، اسریٰ حتیٰ یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا و الله یرید الاخرة و الله عزیز حکیم"

یعنی۔ نہیں ہے نبی کے لیے کہ ہوں اس کے لیے قیدی یہاں تک کہ گھمسان کر دے زمین میں یعنی ملک میں۔ تم چاہتے ہو مال دنیا کا اور اللہ چاہتا ہے آخرت کو اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔

واقعہ یہ ہے کہ بدر لڑائی میں قریش مکی کے تمام لشکر سے جو ان کے ساتھ آیا تھا لڑائی نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک گروہ سے جو لڑنے کو نکلا تھا لڑائی ہوئی تھی جیسا کہ اسی صورۃ کے مندرجہ حاشیہ آیت سے ثابت ہوتا ہے ا۔اس گروہ کو جو مقابلہ میں آیا تھا شکست ہوئی تھی اور تمام لشکر قریش مکی کا ایسا پریشان ہو گیا تھا کہ کسی کو پھر مقابلہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب بھی نہیں کیا۔جیسے کہ خدا نے اسی صورت میں فرمایا:

" ان تستفتحو فقد جاء کم الفتح و ان تنتھوا فھو خیر لکم"

مگر قریش مکہ کے لشکر میں ستر آدمی بطور قیدی کے گرفتار ہو گئے تھے۔ان قیدیوں کی نسبت آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جاوے حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے رائے دی کہ سب کو قتل

ا۔واذ یریکموھم اذاالتفیتم فی اعینکم قلیلا ویقللکم فی اعینھم لیقضی اللہ امر ا کان مفعولا والی اللہ ترجع الامور. ۴۶.

کرنا چاہیے۔حضرت ابوبکر نے کہا کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جاوے چنانچہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔فدیہ لینے پر خدا نے اپنی ناراضی ظاہر کی کیوں کہ وہ لوگ بغیر لڑنے کے پکڑے گئے تھے اور اس لیے لڑائی کے قیدی جن سے فدیہ لیا جا سکتا نہیں تھے۔اسی پر خدا کی ناراضی ہوئی اور خدا نے فرمایا

"ما کان لنبی ان یکن لہ اسری حتیٰ یثخن فی الارض"

جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان کے قتل نہ کرنے پر خدا کی ناراضی ہوئی تھی کسی طرح پر صحیح نہیں ہو سکتی اس لیے خدا تعالیٰ نے جب انکا قیدی جنگ ہونا ہی نہیں قرار دیا تو ان کے نہ قتل کرنے پر کیوں کر ناراضی ہو سکتی تھی۔

غزوہ بدر اور نزول ملائکہ

تمام مسلمان اس پر یقین رکھتے ہیں اور تمام احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے اور تمام مفسرین کا دعویٰ ہے کہ سورۃ آل عمران میں لکھا ہوا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتے آسمان سے نازل ہوئے تھے۔ مگر میں اس بات کا بالکل منکر ہوں مجھے یقین ہے کہ کوئی فرشتہ لڑنے کو سپاہی بن کر یا گھوڑے پر چڑھ کر نہیں آیا۔ مجھ کو یہ بھی یقین ہے کہ قرآن مجید سے بھی ان جنگ جو فرشتوں کا اترنا ثابت نہیں ہے۔ مگر تمام مسلمانوں کا اعتقاد اس کے برخلاف ہے وہ یقین کرتے ہیں کہ درحقیقت فرشتوں کا رسالہ لڑنے کو اترا تھا وہ نادانی سے یہ بھی کہتے ہیں کہ فرشتوں کا لڑائی کے لیے اترنا منصوص ہے اور اس سے انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے مگر ان کا یہ خیال محض غلط ہے۔

مجھ کو فکر تھی کہ اور کسی مسلمان نے بھی اس سے انکار کیا ہے یا نہیں۔ تو مجھ کو ایک مسلمان ملا جس نے اس سے انکار کیا ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ابوبکر آصم اس سے سخت منکر تھے انہوں نے اپنے انکار کی چار دلیلیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک فرشتہ بھی تمام دنیا کے غارت کر دینے کو کافی تھا پھر فرشتوں کی فوج بھیجنے سے کیا فائدہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جو کفار کہ لڑے انکو بھی لوگ جانتے تھے پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کفار کو فرشتوں نے مارا تھا۔ تیسرے یہ کہ اگر فرشتے لڑے تھے تو وہ لوگوں و دکھائی دیتے تھے یا نہیں اور اگر دکھائی دیتے تھے تو آدمیوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے یا اور کسی صورت میں۔ اگر آدمیوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے تو وہ آنحضرت ﷺ کا لشکر میں شمار ہوتے تھے تو وہ آنحضرت

ﷺ کا لشکر تین ہزار اس سے زیادہ ہو گیا ہوگا اور اتنا لشکر کسی نے بیان نہیں کیا اور قرآن کے بھی برخلاف ہے۔ کیوں کہ دشمنوں کی آنکھوں میں تھوڑا لشکر دکھائی دیتا تھا اور اگر اور کسی صورت پر دکھائی دیتے تو تمام لوگوں کے دل پر دہشت پڑ جاتی اور اگر وہ لوگوں کو دکھائی نہ دیتے تو کفار کو لوگ بغیر قتل کرنے والے کے قتل ہوتا ہوا دیکھتے اور یہ واقعہ اعظم معجزات میں ہوتا۔ مگر اس طرح پر کفاروں کا مارا جانا وقوع میں نہیں آیا۔ چوتھے یہ کہ جو فرشتے آئے تھے ان کے اجسام کثیف تھے یا لطیف۔ اگر کشیف تھے تو ان کو سب لوگ دیکھتے۔ حالاں کہ ان کو کسی نے نہیں دیکھا اور اگر ان کے اجسام ہوا کی طرح لطیف تھے تو گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آسکتے تھے۔

امام فخر الدین رازی نے ان شبہوں میں سے کسی کا جواب نہیں دیا اور ملانوں کی طرح یہ بات کہی کہ ایسے شبہے کرنا اس شخص کے لائق ہیں جو قرآن اور نبوت کا منکر ہو۔ مگر جو شخص کہ قرآن اور نبوت کو مانتا ہے اس کو ایسے شبہے کرنے لائق نہیں۔ پس ابو بکر آصم کو لائق نہ تھا کہ ان باتوں کا انکار کرتا باوجود اس کے کہ نص قرآن سے ان کا ہونا پایا جاتا ہے اور ایسی حدیثوں میں جو تواتر کے قریب ہیں ان کا بیان ہے۔

امام صاحب نے اخیر بات تو یقینی غلط کہی ہے کیوں کہ تواتر تو درکنار کس صحیح اور قوی حدیث سے بھی ان باتوں کا ثبوت نہیں ہے۔ تمام ضعیف اور موضوع حدیثیں ہیں جن میں ایسی باتیں مذکور ہیں علمائے محققین ایسی حدیثوں پر اعتماد نہیں کرتے اور اصول حدیث سے بھی ان کی تقویت نہیں ہوتی۔ پہلی بات بھی امام صاحب کی صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن مجید سے فی الواقع سپاہی بن کر فرشتوں کا اترنا پایا نہیں جاتا۔ بلکہ صرف وہ ایک بشارت تھی مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنے اور لڑائی میں ثابت قدم رہنے کی۔ جیسے کہ خود خدا نے اس جگہ اور سورۃ انفال میں فرمایا ہے:

"وما جعله الله الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم به"

مگراس سورۃ میں جنگ بدر کے واقعہ کا جس سے یہ آیت متعلق ہے بہت ہی تھوڑا بیان ہے اورسورۃ انفال میں وہ واقعہ بالاستیعاب بیان ہوا ہے اوراس میں ہزار فرشتوں کی مدد کا ذکر ہے۔

ہمارے نزدیک نہ ان لڑائیوں میں ایسے فرشتے جن کو لوگ ایک مخلوق جداگانہ متحیز بالذات مانتے ہیں۔آئے تھے اور نہ خدا نے ایسے فرشتے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ قرآن مجید سے ایسے فرشتوں کا آنا یا خدا تعالیٰ کا ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کرنا پایا جاتا ہے۔اگر ہم حقیقت ملائکہ کی بحث کو الگ رکھیں اور فرشتوں کو ویسا ہی فرض کر لیں جیسا کہ لوگ مانتے ہیں تو بھی قرآن مجید سے ان کا فی الواقع آنا یا لڑائی میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں تو صرف استفہام ہے کہ اگر خدا تین ہزار فرشتوں سے مدد کرے تو کیا تم کو کافی نہ ہوگا ؟ اور دوسری آیت میں ہے کہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو گے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔مگران دونوں آیتوں سے اس کا وقوع یعنی فرشتوں کا آنا کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔سورۃ نفال کی آیت میں خدا نے کہا کہ "میں تمہاری ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا۔مگراس سے بھی فرشتوں کا فی الواقع آنا نہیں پایا جاتا۔اس پر یہ خیال کرنا کہ اگر مدد موعودہ وقوع میں نہ آئی ہو تو خدا کی نسبت خلف وعدہ کا الزام آتا ہے صحیح نہیں ہے۔کیونکہ مدد کی حاجت باقی نہ رہنے سے مدد کا وقوع میں نہ آنا خلف وعدہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کو خدا کی عنایت سے فتح ہوگئی تھی۔اور فرشتوں کو تکلیف دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ باقی یہ کہنا کہ وہ فتح فرشتوں کے آنے کے سبب سے ہوئی تھی اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس کے لیے اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاہیے۔اس کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی روایتوں کو فرشتوں کے آنے پر سند لانا

کافی نہیں ہے اول تو وہ روایتیں ہی معتبر اور قابل استناد نہیں۔ دوسرے خود ان کے مضمون ایسے بے سروپا اور خیالی ہیں جن سے کسی امر کا ثبوت حاصل نہیں ہوسکتا خصوصا اس وجہ سے کہ خود راوی فرشتوں کو دیکھتے نہیں تھے۔

برخلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ایک فرشتہ بھی نہیں آیا تھا۔ دونوں سورتوں میں اس آیت کے بعد جس میں فرشتوں کے بھیجنے کو کہا ہے۔

وما جعله الله الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم به وما النصر الامن عندالله العزیز الحکیم

یعنی۔ اور نہیں کیا اسکو اللہ نے مگر خوش خبری تمہارے لیے تاکہ مطمئن ہوجاویں اس سے تمہارے دل اور فتح نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔"

یہ بات غور کے لائق ہے کہ

"ماجعله"

میں جو ضمیر ہے وہ کس کی طرف راجع ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ "ضمیر راجع ہے طرف مصدر کے جو کہ گو صریحاً مذکور نہیں ہے مگر لفظ

"یمدکم"

میں ضمنا داخل ہے یعنی

ماجعله الله المدد والا مداد الا بشریٰ

اور زجاج کا قول ہے کہ

ماجعله الله ای ذکر المددالا بشریٰ

مگر امام رازی صاحب نے جو فرمایا وہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ خدا نے کہا

تھا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا۔ پھر فرمایا کہ وہ یعنی یہ کہنا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا صرف خوش خبری تھی۔

پس علانیہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ

''ما جعله''

کی ضمیر قول امداد یا ذکر امداد کی طرف راجع ہے جیسا کہ زجاج کا قول ہے۔ نہ بطرف مصدر کے جو مذکورہ بھی نہیں ہے البتہ اس صریح مرجع ضمیر کو چھوڑ کر مصدر کی طرف اس صورت میں ضمیر راجع ہو سکتی ہے کہ اول وقوع اس مدد کا یعنی فرشتوں کا آنا ثابت ہو جاوے اور وہ ابھی تک ثابت نہیں ہوا اور اس لیے مصدر کی طرف ضمیر کا راجع کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

''ماجعله''

پر ما نافیہ جو عام طور پر نفی کرتا ہے اور اس لیے سورۃ آل عمران کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ''نہیں کیا خدا نے پیغمبر کے اس قول کو کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔ کوئی چیز، مگر بشارت۔ یعنی صرف بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں'' اور سورۃ انفال کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ''جب تم نے خدا سے فریاد کی اور اس نے تمہاری فریاد کو قبول کیا کہ میں فرشتوں سے تمہاری مدد کرو ں گا تو نہیں کیا خدا نے اس قبول کرنے کو جس کے ساتھ فرشتوں سے مدد دینے کو کہا تھا کوئی چیز مگر بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں'' اور طرز کلام قطعاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسا فرشتہ جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں لڑائی کے میدان میں نہیں آیا تھا۔

یہ تمام تقریر اس صورت میں تھی جبکہ ملائکہ کو ایک ایسا وجود خارجی متحیز بالذات تسلیم کیا جاوے جیسے کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے اور جو مشکلیں ان آیتوں کے حل کرنے میں پیش آتی ہیں اور موضوع روایتوں اور جھوٹے اور بے معنی قصوں سے استدلال کرنے کی احتیاج

پڑتی ہے۔ وہ اسی صورت میں پڑتی ہے۔

لیکن اگر ٹھیک طور پر قرآن مجید کو سمجھا جاوے اور جو اس کا طرز کلام ہے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور خدا اور اسکے کلام کی عظمت وشان اور خدا کی قدرت کاملہ کا سچا اثر انسان کے دل پر پڑتا ہے۔

فتح کے اتفاقی اسباب سے جو بعض اوقات آفات راضی وسماوی کے دفعتا ظہور میں آنے سے ہوتے ہیں۔ قطع نظر کر کے دیکھا جاوے کہ ان لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے جو فتح پاتے ہیں۔ ان کے قوائے اندرونی جوش میں آتے ہیں جرات، ہمت، صبر، شجاعت۔ استقلال، بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور یہی قویٰ خدا کے فرشتے ہیں جن سے خدا فتح مندوں کو فتح دیتا ہے اور اس کے برخلاف حالت یعنی بزدلی اور رعب ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کی شکست ہوتی ہے۔

پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ ''میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔ مگر وہ بجز خوش خبری فتح کے اور کچھ نہیں ہے جس کے سبب تم میں ایسے قویٰ برانگیختہ ہوں گے جو فتح کا باعث ہوں گے تمہارے دل قوی ہو جائیں گے۔ لڑائی میں تم ثابت قدم رہو گے۔ جرات، ہمت، شجاعت کا جوش تم میں پیدا ہوگا اور دشمنوں پر فتح پاؤ گے۔

یہ معنی ان آیتوں کے ہم نے پیدا نہیں کیے ہیں بلکہ خود خدا نے یہی تفسیر اپنے کلام کی کی ہے۔ جہاں اسی سورہ میں اور اسی واقعہ کی نسبت فرمایا ہے کہ

''اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتو الذین آمنو سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب.''

یعنی جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا (یہ وہی فرشتے ہیں جن کے بھیجنے کا مدد کے لیے وعدہ کیا تھا) کہ میں تمہارے (یعنی مسلمانوں کے) ساتھ ہوں (تو ان فرشتوں

سے یہ کام لینے چاہے تھے) کہ ثابت قدم رکھوان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ میں بہت جلدان لوگوں کے دلوں میں جو کافر ہیں رعب ڈالوں گا۔"

لڑائی میں ثابت قدم رکھنے والی کون چیز تھی؟ وہی ان کی جرات و ہمت تھی۔ کوئی اور اشخاص ان کے پاس کھڑے ہوئے ان کو شاباش شاباش نہیں کہہ رہے تھے۔ پاس صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں سے مراد وہی قوائے انسانی تھی جن کے پاس وحی بھیجی تھی اور جو لڑنے والوں میں موجود تھی اور فرشتوں سے ان کی مدد کرنے سے ان کو لڑائی میں ثابت قدم رکھنا اور شجاعت، جرات، ہمت استقلال کو قائم رکھنا مراد تھا، نہ خیالی فرشتوں کو سپاہی بنا کر اور ڈھال تلوار، تیر کمان دیکر اور سفید گھوڑوں پر سوار کر کے بھیجنا۔

قرآن مجید کا سیاق کلام ہی یہ ہے کہ اس میں ایسے مواقع میں جو خوف و خطر کے ہوتے ہیں۔ انسانوں کے دلوں میں طمانیت اور قوت بخشنے کو فرشتوں سے مدد کرنے اور اپنے غیبی لشکروں سے امداد کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود صرف دل میں طمانیت و سکینہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپے۔ جہاں نہ لشکر تھا نہ لڑائی تو خدا نے فرمایا۔

"الا تنصروة فقد نصر ه الله اذ اخرجه الذينكفروا ثانى اثنين ا ذهما فى الغار اذ يقول لصاحبه لا تحذن ان الله معنا فانزل الله سكينهة عليه وايده بجنود لم تروها وجعل كلمة الذين كفرو السفلىٰ وكلمة الله هى العليا والله عزيزحكيم ." (سورة توبه ،آيت ۴۰ پاره ۱۰)

وہاں غار میں کون سی فوج تھی اور کون سی لڑائی تھی جو خدا نے اپنا غیبی لشکر بھیجا تھا، بلکہ لشکر سے صرف سکینہ مراد تھی۔ اس آیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور یہ کہنا کہ پہلا جملہ تو واقعہ غار سے متعلق ہے اور دوسرا ٹکڑا جہاں لشکر کے آنے کا ذکر ہے جنگ احد یا جنگ بدر یا جنگ

احزاب سے متعلق ہے۔ جیسا کہ بعض مفسروں نے کہا ہے۔ یہ ایک ایسا لغو کلام ہے جو التفات کے قابل نہیں ہے۔ اور خدا کے کلام کے ساتھ ایک قسم کی بے ادبی ہے کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں سے چاہا توڑا اور جہاں چاہا جا جوڑا۔

اسی طرح خدا نے سورۃ توبہ میں فرمایا

"ثم انزل الله سکینة علی رسوله وعلی المومنین وانزل جنودا لم تروها و عذب الذین کفروا واذلک جزاؤ لکافرین"

سکینہ کی تفصیل

"جنودالم تروها"

واقع ہوئی ہے اور ان دونوں سے مراد سکینہ ہے نہ کچھ اور۔

اسی مضمون کی آیت سورۃ احزاب میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے۔

"یاایها الذین آمنو اذکروانعمت الله علیکم اذ جاء تکم جنوا فارسلنا علیهم ریحا و جنودا لم تروها وکان الله بما تعملون بصیرا."

اس سے بھی عمدہ طریقہ پر اس مضمون کو سورۃ فتح میں بیان کیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے

" هو الذی انزل السکینة فی قلوب المومنین لیز دادوا امماناً مع ایمانهم والله جنود السموات والارض وکان الله عزیزا حکیما.

اسی انزال سکینہ کو خدا نے اپنے لشکروں سے تعبیر کیا ہے۔ پس بدر کی لڑائی میں بھی نہ نہ جنگجو مجسم متحیز بالذات فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ نہ ایسے فرشتے بھیجے تھے۔ بلکہ مسلمانوں کے دلوں کو اور ان کے قوائے جنگ کو صرف خوش خبری فتح سے تقویت دینے کا وعدہ تھا جس کو خدا ان پورا کیا اور قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر فتح دی۔

اہل عرب زمانہ جاہلیت میں بہت سے قوائے غیر مرئیہ کو مربی انسان اور دنیا

میں کارکن سمجھتے تھے۔ ملائکہ کو بھی وہ ایک قوت غیر مرئیہ جانتے تھے اور گو وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان میں مجسم و مرئی ہونے کی بھی طاقت ہے۔ مگر یہ نہیں تھا کہ ملائکہ کا مفہود بغیر اس کے کہ وہ ان کو مجسم و مرئی سمجھیں۔ ان کے ذہن میں نہیں آ تا تھا۔ ان ہی آیتوں میں جہاں خدا تعالیٰ نے لفظ

"جنو دا لم تر و ھا "

کا استعمال کیا ہے اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اس زمانہ کے عرب قوائے غیر مرئیہ کو کارکن سمجھتے تھے پس یہ کہنا کہ جو معنی آیت کے ہم نے بیان کیے ہیں (اگرچہ ایسا کہنا ہم پر تہمت ہے کیوں کہ ہم نے نہیں بیان کیے۔ بلکہ خود خدا نے بیان کیے ہیں) وہ معنی نہ اس زمانہ جاہلیت کے عرب سمجھتے تھے نہ صحابہ کرام۔ محض غلط ہے اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی فرضی شکل و صورت کے انکے ذہن میں فرشتوں کا خیال ہی نہیں آ سکتا۔ مگر عرب جاہلیت کا ایسا خیال نہ تھا۔ بے شک فرشتوں میں وہ مجسم ہونے اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کی طاقت سمجھتے تھے۔ مگر بلا خیال شکل و صورت و تحیز کے بھی ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال تھا جس کو ہم نے بلفظ قویٰ تعبیر کیا ہے۔ گو اس زمانہ کے مسلمان آیت کے معنی سمجھنے کے قابل نہ ہوں مگر اس زمانہ کے عرب بلا شبہ اس قابل تھے۔

اب باقی رہی بحث نسبت عدد ملائکہ کے تو یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے مقامات میں عدد کے ذکر کرنے سے خاص عدد معین مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس امر کا مکمل ہونا جس کی نسبت عدد کا بیان ہوا ہے مقصود ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے عددوں کا بیان مختلف واقع پر ہوا ہے جس کے سبب کچھ اختلاف آئیتوں میں نہیں ہے۔ جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور قریش مکہ کے مقابلہ میں نکلنے کا ارادہ تھا تو ایک گروہ مسلمان کا بسبب کثرت مخالفین کے خائف تھے اور وہ ان کے مقابلہ میں لڑنے کو جانا ناپسند کرتا تھا اس وقت مسلمانوں سے آنحضرت ﷺ

نے فرمایا تھا کہ

''لن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثة آلاف من الملائکة منزلین بلیٰ ان تصبروا وتتقو ویاتو کممن فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسة آلاف من الملائکة مسمومین (سورہ آل عمران آیات ۱۲۳ . ۱۲۴)

یعنی'' کیا تم کو قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے یہ بھی کافی نہ ہوگا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔ بلکہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو اور خدا سے ڈرو اور وہ ابھی تم پر آن پڑیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔''

پس رسول خداﷺ کا یہ فرمانا صرف ان لوگوں کی طمانیت اور جرات بڑھانے کے لئے تھا اور اس سے کسی عدد خاص کا تعین مقصود نہ تھا۔

مگر جب مسلمان بمقابلہ قریش مکہ بدر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مکہ کے لشکر میں ہزار فرشتوں سے مدد دینے کی بشارت دنیا کافی تھا اس لیے پروردگار نے فرمایا

''انی ممدکم بالف من الملائکة مردفین''

اور اسی کے ساتھ بتلا دیا کہ یہ کہنا یا وعدہ کرنا صرف فتح کی خوش خبری ہے تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں نہ یہ کہ ہزار فرشتے سپاہی بن کر تمہارے ساتھ لڑنے کو آئیں گے نتیجہ اس سبب کا یہ نکلا کہ'' میں تمہارے دلوں کو ہزار آدمی کے لشکر کے برابر تقویت اور جرات دے دوں گا۔ جس کے سبب تم ان کا مقابلہ کر سکو گے۔''

ختم شد.......................The End